بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تا کہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔

اے محمدؐ! اِن سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو اُن کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو! میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا' اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہِ راست پانے والوں میں سے نہ رہا، کہو! میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے' اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو۔ فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(آیات ۵۵ تا ۵۷) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

ضروری نوٹ: گزشتہ ماہ ''القرآن'' کی آیات کا حوالہ غلط شائع ہو گیا تھا۔ ترجمہ شدہ آیات 53 تا 54 تھیں جو سہواً 36 تا 37 درج کردی گئیں۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

الحدیث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اطاعت رسول ﷺ کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

ترجمہ: تین آدمی، حضور ﷺ کے معمول عبادت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے حضور ﷺ کی ازواجؓ کے پاس آئے، جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے آپ ﷺ کی عبادت کی مقدار کو کم تصور کیا اور کہنے لگے:

''نبی ﷺ سے ہمارا کیا مقابلہ! ان سے نہ تو پہلے گناہ ہوئے نہ بعد میں ہوں گے۔ (اور ہم معصوم نہیں، پس ہمیں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے)''۔

''چنانچہ ان میں سے ایک نے اپنے لیے یہ طے کیا کہ وہ ہمیشہ پوری رات نوافل میں گزارے گا۔

اور دوسرے نے یہ کہا کہ میں ہمیشہ نفلی روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا اور تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا، کبھی شادی نہ کروں گا''۔

(جب آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی) تو آپ ﷺ ان کے پاس گئے اور کہا ''کیا وہ تم ہی لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا ''بلاشبہ میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہوں لیکن دیکھو، میں (نفلی) روزے کبھی رکھتا ہوں کبھی نہیں رکھتا۔ اسی طرح میں (رات میں) نوافل بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور دیکھو میں بیویاں بھی رکھتا ہوں (سو تمہارے لیے خیریت میرے طریقہ کی پیروی میں ہے) اور جس کی نگاہ میں میری سنت کی وقعت نہیں، جو میرے سنت سے بے رُخی برتے وہ میرے گروہ میں سے نہیں ہے۔

(بحوالہ: فرمان رسولؐ / سیارہ ڈائجسٹ)

اس شمارے میں......

www.facebook.com/sayaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone;92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

جلد: 52 ۔ شمارہ: 1 ۔ جنوری 2015ء

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر منتظم	مدیر اعلیٰ
کامران امجد خان	امجد رؤف خان

مدیر : محمد ثاقب

معاون مدیران : جویریہ کامران ۔ روفی خان ۔ فرحان امجد

سرکولیشن منیجر : بشیر احمد

مارکیٹنگ منیجر : خرم احمد خان ۔ 0333-4207684

نگران پرنٹنگ : خالد محمود ۔

طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہِ قائداعظم لاہور

شعبہ اشتہارات :

(لاہور) خرم احمد خان ۔ 0333-4207684
طارق محمود ۔ 0300-4144781

(کراچی) محمد عابد مرزا ۔ 0321-3758492

مجلس مشاورت
صغیرہ بانو شیریں ۔ رفیق غوری
ریاض آفندی ۔ فیض ۔ عارف محمود ایل

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

سیارہ ڈائجسٹ کی سالانہ خریداری کیلئے
بیرونِ ملک بدلِ اشتراک

(1) سعودی عرب، کویت، اُردن، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت۔	6000/- روپے
(2) سوڈان، یوگنڈا، لیبیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، ملائشیا، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی۔	6000/- روپے
(3) آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینیزویلا، یونان، امریکہ، ٹوبیگو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، میکسیکو، گرینا ڈا۔	7000/- روپے

- بیرون ملک وی پی نہیں جاتی۔ رقم پہلے بھجوائیں۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار کو ادا کرنا ہوگا۔
- ڈرافٹ سیارہ ڈائجسٹ لاہور کے نام ارسال کریں۔

سیارہ ڈائجسٹ
240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور۔
فون: 0423-7245412
E.mail: sayyaradigest@gmail.com

اظہارِ خیال

خوب سے خوب تر

مدیرِ اعلیٰ جناب امجد رؤف خان صاحب!
السلام علیکم! مزاجِ گرامی! عرض خدمت یہ ہے کہ آپ نے کمال مہربانی سے میری لکھی گئی سچی کہانی ''اللہ کے راز'' سیارہ ڈائجسٹ اکتوبر 2014ء میں شائع فرمائی، شکر گزار ہوں۔ دوسری کہانی ''من مٹھڑی سرائیکی'' کے نام سے ارسال کر چکا ہوں۔ اُمید ہے کہ پسند آئی ہوگی۔ ایک اور کہانی (سچی) ''چھلتی گڑوی'' کے نام سے بھیج رہا ہوں گو کہ مختصر ہے لیکن سو فیصد سچا اور ذاتی واقعہ ہے۔ ضرور شائع فرمادیں۔ ''شہر خموشاں میں تین روز'' کے عنوان سے ذاتی مشاہدات لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ نوک پلک سنوار کر چھپنے کا موقعہ دیں گے۔ انشاء اللہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہ کر کہانیاں، واقعات، انہونیاں اور قصے بھیجتا رہوں گا۔ منتخب کرنا اور چھاپنا آپ کا کام ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ پہلے کی نسبت کافی بہتر اور مواد جاندار ہوگیا ہے لیکن یہ ڈائجسٹ ہم تین دوستوں نے مل کر عرصہ دراز سے سالانہ لگوایا ہوا ہے لیہ کے بک سٹال پر یا کسی پرائیویٹ بندہ کے ہاں نہیں دیکھا جاتا پھر ہمارے شہر لیہ میں یہ شمارہ سرے سے آتا ہی نہیں ہے۔ براہ مہربانی اس کمی کو دور کیا جائے۔ فقط والسلام، دعاگو

(غلام نبی عارف/لیہ)

جمہوریت کے نام پر شہنشاہیت

محترمی جناب کامران صاحب! مدیرِ منتظم ''سیارہ ڈائجسٹ'' السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا شمارہ دسمبر ملا۔ جو زینت مطالعہ ہے! ہاں اکتوبر کے شمارہ میں ٹائٹل جاوید ہاشمی کی تصویر کے لیے مختص تھا اور اندرونی صفحات پر بھی ان کا ذکر پڑھنے کو ملا۔ میں نے بھی ان کی کتاب ''ہاں! میں باغی ہوں'' سے اقتباس لیے جو شمارہ نومبر میں چھپے لیکن افسوس! کہ کمپوزر نے ان کی کتاب کا نام غلط لکھ دیا۔ عمران خان سے علیحدہ ہوکر گوشہ گمنامی میں ہیں۔ شاید اسی کا نام پاکستان میں سیاست ہے۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان 24 سال کے بعد دولخت ہوا کیونکہ اکثریت کو اقلیت بنادیا گیا تھا۔ بنگالیوں نے ہم سے علیحدگی ہی میں اپنی عافیت جانی، آج وہ ہم سے تعلیم میں اور دوسرے شعبوں میں ترقی کرکے آگے ہیں۔ وہ طاغوتی طاقتیں آج بھی برسراقتدار ہیں۔

ملکی حالات ہر روز ایک نیا رُخ اختیار کرتے جارہے ہیں۔ جمہوریت کے نام پر شہنشاہیت ہے۔ گزشتہ روز خبروں میں بتایا جارہا تھا کہ ایک شہری نے قرضہ وصول نہ ہونے پر 24 بچیوں کو اس کے گھر لا بیٹھایا ہے کہ تم ہی ان کے کفیل ہو، کل کو یہی بچیاں جوان ہوکر بچوں کو جنم دیں گی، ...... چرچل نے کہا تھا کہ تم مجھے! اچھی مائیں دو اور میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔ وہی قومیں آج بام عروج پر ہیں۔ ڈاکٹر اقبال جب یورپ گئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ میں نے وہاں اسلام دیکھا لیکن مسلمان نہیں جب وہ واپس وطن آئے تو انہوں نے کہا کہ یہاں میں نے مسلمان دیکھے اسلام نہیں، خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اسے کون سلجھائے۔ میں اس میں الجھنا نہیں چاہتا۔

''خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کردیں'' کے لیے زاہدہ یوسفی صاحبہ اور کنول صاحبہ نے اپنی خوبصورت آراء دیں ہیں۔ ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار نہ کروں تو بخیل کہلاؤں۔

اگلا شمارہ جنوری 2015ء کا ہوگا، نہ جانے اس وقت ملک میں کیا حالات ہوں گے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ملک میں قانون تو ہے لیکن اس کے محافظ نہ جانے کیوں۔ خاموش ہیں نیک خواہشات کے ساتھ۔

(قلندر حسین سید)

تیس فیصد سچ

محترم ومکرم! السلام علیکم! خوبصورت سرورق کے ساتھ سیارہ ڈائجسٹ موصول ہوا۔ ہاشوانی صاحب ٹائٹل پر جلوہ گر تھے۔ ہمارا سیارہ بھی صحیح آن بان اور شان کے ساتھ اپنا آپ دکھاتا ہے۔ خاص الخاص انٹرویو اور سچائی کے سفر کی تلخیص بے انتہا چشم کشا ہے اور گھناؤنے کردار کے حامل سربراہان کے چاک گریبان اور ان کے اصل روئیوں کے، قصے تو قاری کو حیرت میں لے ڈوبتے ہیں۔ تمام لکھنے والوں پر سبقت سیارہ ڈائجسٹ کے ادارتی عملہ کے لوگ لے گئے کہ ہاشوانی صاحب جیسی شخصیت اور ان کی زندگی کے سچ سے متعارف کروانے میں آپ نے بڑی مشقت اور محنت اٹھائی ہے اور یہ تو بات سوفی صد سچ ہے کہ یہ 30 فی صد کی حد تک ہی رازوں سے پردہ اٹھا سکتے تھے اور 70 فیصد سامنے لانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اصل میں یہ تھوڑا بھی پوری تصویر کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس سے تمام لوگوں کو آگاہی ہونی چاہیے تاکہ اگلے انتخابات تک ہم عام ووٹرز ضمیر کی آواز پر لبیک کہیں اور بے انتہا صاف ستھرے اور دردمند دل رکھنے والے لوگ آگے آئیں۔

عارف اُپل کی رپورٹ انتہائی زبردست تھی۔

تھر میں ہلاکتیں، کیا ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ چند دن کی واردات ہے، جی نہیں یہ پچھلے تمام ادوار کی غفلت، بے حسی، بے ایمان اور ظالم لوگوں کی لاپرواہی اور بے توجہی کا شاخسانہ ہے!!

''میرا کشمیر'' والا سفر نامہ تو میں نے ایسا طرز تحریر پچھلے پچاس سال میں بھی نہیں پڑھا۔ واہ!! ایک اور کہانی بھیج رہا ہوں قریبی اشاعت میں شامل کرکے مشکور فرمائیں۔ بے حد دعاؤں کے ساتھ

(جاوید احمد صدیقی)

صفحات بڑھادیں

محترم امجد رؤف خان صاحب، السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ کے دسمبر 2014 کے شمارے میں جناب صدرالدین ہاشوانی کی آپ بیتی پڑھ کر لطف آ گیا۔ واقعی اُن کے پاس ایسے سچ موجود ہیں جو بہت سے لوگوں کی حقیقت بے نقاب کرسکتے ہیں۔ جن صاحب نے بھی اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے اُن کو میری دلی مبارکباد پہنچادیں کیونکہ یہ کسی طرح بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کتاب کو انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ سیارہ ڈائجسٹ کا ہی خاصہ ہے کہ ایسی کارآمد چیزیں قارئین کے لیے مہیا کرتا ہے۔ دسمبر کے شمارے میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قلندر حسین صاحب دوبارہ اپنے کالم کے ساتھ جلوہ گر ہیں، مگر اُن کے کالم کے صفحات کیوں کم کردیئے گئے ہیں؟ گذارش ہے کہ قلندر حسین صاحب کے کالم کو ہم بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کے کالم سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ آپ سے گذارش

ہے کہ کالم سے صفحات کو دوبارہ بڑھا دیا جائے۔
(محمد نعیم مرزا۔لاہور)

بدلے بدلے انداز

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ دسمبر کے شمارے میں سیارہ کے انداز کچھ بدلے بدلے سے لگے۔آپ نے کافی تبدیلیاں کی ہیں جوخوش آئند ہیں۔ کچھ لے آؤٹ اور ڈیزائننگ تبدیل ہوئی ہے اور کچھ نئے ابواب کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے قارئین کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تبدیلیاں کی ہیں۔ پر اسرار کہانی اور خواتین کی دلچسپی کے صفحات پسند آئے۔اب آپ سے ایک گزارش یہ ہے کہ کوئی سلسلے وار ناول بھی شروع کردیجئے۔کوئی تاریخی یا پھر معاشرتی ناول، جو ہمیشہ سیارہ ڈائجسٹ کا خاصا رہا ہے۔ محترمہ شوکت افضل صاحبہ یا فرخ صابری سے بھی لکھوایا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں قارئین کی مزاج آشنا ہیں اورتحریر پر گرفت بھی ان کی مضبوط ہے۔

تازہ شمارے میں ہاشوگروپ کے بانی صدر الدین ہاشوانی کی آپ بیتی بہت ہی زبردست رہی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ملک کی پوری تاریخ بھی بیان کردی ہے۔ یہ یقیناً ایک تاریخی دستاویز ہے۔

(انیلا ظہیر/ سرگودھا)

پشاور کا سانحہ

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کا ہر شمارہ خاص ہوتا ہے دسمبر کا شمارہ بھی بہت ہی زبردست تھا۔ اس کی تمام تحریریں ہی لاجواب تھیں مگر مجھے خاص طور پر نوشابہ اختر کی دھندلا عروج نے بہت متاثر کیا۔ کاش یہ جوش وجذبہ ہر پاکستانی میں بھر جائے تو وطن کے دشمن ملک کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں۔ یہ تحریر لکھتے ہوئے دل بہت بوجھل ہے، ایک روز پہلے ہی ملک کے دشمنوں نے پشاور میں آرمی پبلک سکول کے معصوم نونہالوں کو شہید کردیا۔ 141 ماؤں کے سپوت اُن سے جدا ہوگئے۔ ملک وقوم کا مستقبل تھے۔ یہ بچے جوان ظالموں نے اپنے وحشی پن اور درندگی کی نذر کردیئے۔ اس وقت پوری قوم کوایک اور متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ سب مل کر ان وطن دشمنوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔ ملک پر بڑا کٹھن وقت ہے۔ باہمی اختلافات بھلا کر ان دہشت گردوں کے خلاف فیصلہ کن ضرب لگائی جائے۔

(عشرت فاطمہ/ لاہور)

تشنگی

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے اور دعا گو ہوں کہ رب کائنات تمام مسلمانوں کو اور بالخصوص تمام پاکستانیوں کو حفظ و امان میں رکھے (آمین)

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ''سیارہ'' اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے اور انشاء اللہ یہ انفرادیت برقرار رہے گی کیونکہ میرا مشاہدہ ہے کہ جس کام میں خلوص شامل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو منزل بہ منزل ترقی عطا فرماتا رہتا ہے آپ نے جو حق وصداقت کے لیے اپنی زندگی کو اپنے قلم کووقف کیا ہوا ہے انشاء اللہ اس کا اجر اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرمائے گا۔ میں تمام سچ لکھنے والوں کا نہایت احترام کرتا ہوں اور ان کے لئے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ صدر الدین ہاشوانی صاحب کے لیے اور ان جیسے

تمام لوگوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ جن لوگوں نے پیارے وطن کے لیے نامساعد حالات کے باوجود اپنی زندگیاں وقت کیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دونوں جہانوں کی خوشیاں عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

''دستک'' بہت خوب جارہا ہے لیکن ''دستک'' کے لیے مزید صفحات کی ضرورت ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو ''ہاشوانی'' صاحب کی کتاب کے چند ورق اور شائع فرما دیجئے ابھی تشنگی برقرار ہے۔ نواز خان صاحب بہت اچھے جارہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ سیارہ نواز صاحب اور نواز صاحب سیارہ کی پہچان بنتے جارہے ہیں۔

تحریریں تمام اچھی اور نہایت اچھی ہیں اگر سب کی تعریف کرنے لگوں تو شاید میرا خط شائع ہی نہ ہو اور اگر شائع ہو بھی تو آپ کو ''قینچی'' کی ضرورت پڑ جائے۔

شاعری بھی معیاری پڑھنے کو مل رہی ہے اور اس طرح ماضی اور حال ہمارے سامنے ہوتا ہے اور اس طرح ہم اپنی خامیوں کی خود تصحیح کر سکتے ہیں اور اُردو ادب کے شہ پارے ہمیں پڑھنا نصیب ہو جاتے ہیں۔ خط کو طوالت سے بچاتے ہوئے اتنا کہوں گا کہ ایک قاری کو جو کچھ چاہیے ہوتا ہے وہ ''سیارہ'' میں موجود ہوتا ہے۔

آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ میری تحریروں کو بھی اشاعت کا موقع عنایت فرمارہے ہیں جبکہ ایک طالب علم کی تحریروں کو اشاعت کا موقع ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ایک تحریر اور ارسال کر رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ جلد شائع ہو جائے گی۔ نہایت شکر گزار۔

(نیئر رضاوی/کراچی)

صدرالدین ہاشوانی کی آپ بیتی

محترم ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم! دسمبر 2014 کا سیارہ ڈائجسٹ بڑی آب و تاب سے طلوع ہوا۔ صدرالدین ہاشوانی صاحب کے بارے میں پڑھ کر آنکھیں کھل گئیں کہ پیارے پاکستان کو پستیوں میں دھکیلنے والے کون ہیں؟ ہر حکمران نے اپنے فائدے اور اقتدار کے دوام کے لیے ہمیشہ کاسہ لیسوں کی سرپرستی کرکے ہمارے وطن کو زوال کی راہ پر ہی ڈالا ہے۔ نواز صاحب کی طویل کہانی بہت پسند آئی۔ اداریہ بھی قابل توجہ تھا اور تھر کے حوالے سے انتظامیہ کی نااہلیوں پر ایک طمانچہ ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ سیارہ کی تمام تحریریں مختلف دنیاؤں سے آشنا کر رہی تھیں۔ اللہ اس رسالے کو مزید ترقی عطا فرمائے اور تمام ٹیم کو اپنے حفظ و امان میں رکھے! آمین! والسلام!

(محمد شعیب خان، واہ کینٹ)

تحریریں کہاں گئیں؟

کامران امجد خان صاحب! السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ دسمبر 2014ء کا ''سیارہ'' ہمارے سامنے ہے خوبصورت ٹائٹل اور شاعری کا انتخاب لاجواب رہا۔ ماہ نومبر 2014 میں ہماری تحریر نہ لگ سکی؟ دسمبر 2014ء میں ہماری تحریر تو لگی، سیارہ کے آخری صفحات پر مگر اس کا فہرست میں کوئی ذکر نہ تھا......؟

بہرحال بہت شکریہ ...... اعزازی کاپی ابھی تک نہ مل سکی......؟ اور نہ آئی......!

میٹرز آپ کے پاس ہیں پلیز دیکھیے گا، اگر ہی اشاعت میں جگہ دیں آپ کو اور دیگر سٹاف اور ''سیارہ'' کے تمام خوبصورت لکھنے والوں کو پیشگی نیا سال مبارک اور تمام خوبصورت پڑھنے والوں کو دعا سلام۔

سانحہ پشاور..... دہشت گردوں کے حمایتی رعایت کے مستحق نہیں!

ملک میں اس وقت ایک قیامت برپا ہے، ہر پاکستانی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ بالخصوص اُن 142 گھرانوں کی تکلیف اور آزمائش کا محض اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے جن کے پیارے پشاور کے سکول میں ہونے والی دہشت گردی کی واردات کی نذر ہوگئے ہیں 132 بچے...... ماؤں کے جگر گوشے، قوم کے مستقبل کی اُمید، جنھوں نے آگے چل کر اپنے والدین کے خواب پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی تعمیر و ترقی بھی کرنی تھی...... اُنھیں وحشی درندوں نے سکول سے سیدھا جنت میں پہنچادیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جن کی عمریں ابھی کھلونوں سے کھیلنے کی تھی اُنھیں ایک آسان ہدف سمجھتے ہوئے ان دہشت گردوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ شہید کردیا۔ یہ ملک کی تاریخ کا بدترین سانحہ ہے۔ سکول میں معصوم بچوں کا قتل عام کرنے کے لیے یہ دہشت گرد کہاں سے اتنا پتھر دل لائے ہونگے...... اس بربریت سے ظاہر ہوتا ہے یہ لوگ کیسے درندے اور ظالم ہیں، ان کی سوچ کیا ہے، یہ لوگ کس حد تک جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

افسوس......صد افسوس کہ اس سب کے باوجود آج بھی کچھ لوگ ہمارے اندر بیٹھ کر، ہماری صفوں میں موجود رہ کر ان دہشت پسندوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کی بربریت کا جواز پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انھیں اس کام پر مجبور کردیا گیا ہے۔ جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ کس نے مجبور کیا ہے تو فرماتے ہیں کہ امریکہ نے مجبور کیا ہے، اور چونکہ آپ کا ملک امریکہ کا اتحادی ہے اس لیے وہ آپ کو بھی نشانہ بنانے پر مجبور ہیں۔ ان حمایت کرنے والے عقل کے

اندھوں سے کوئی پوچھے کہ اگر امریکہ نے انھیں مجبور کیا ہے تو جائیں جا کر امریکہ سے لڑیں، وہ افغانستان میں بیٹھا جہاں سے یہ آتے ہیں، کریں اُس سے براہ راست جنگ، بنائیں اُنھیں نشانہ۔ معصوم اور کمزور بچوں کو پاکستان میں نشانہ بنانے کا کیا مقصد ہے۔ ان کی حمایت کرنے والے کہتے ہیں، یہ ہمارے ہی بھٹکے ہوئے بھائی ہیں جو مذاکرات اور ان کے خلاف کارروائیاں ختم ہونے سے واپس آ جائیں گے۔ ان سے کوئی پوچھے اپنا بھائی بھی ہو تو کیا ایسے معصوم بچوں کو شہید کرنے، سینکڑوں ماؤں کی گود اجاڑنے اور وحشت و بربریت کا ایسا مظاہرہ کرنے پر اسے معاف کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں اس وحشیانہ پن کا اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں کہ پوری قوم ان کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہو جائے اور ان وحشیوں کو پوری طاقت کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ آپ انھیں اپنا بھائی کہتے ہیں تو آپ بھی ظالم ہیں کیونکہ ظلم کی حمات کرنے والا بھی ظالم ہوتا ہے۔ اب مزید ان لوگوں کے حق میں دلیل برداشت نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ دہشت گرد ہماری اسی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کبھی امریکہ کے نام پر اور کبھی مذہبی بھائی چارے کے نام پر ان ظالموں کو تحفظ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اب پاکستان مزید ایسے عناصر کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ظالم اس قابل ہیں اور نہ ان کی حمایت کرنے والے۔ ان کی حمایت کرنے والوں کا بھی سماجی سطح پر مکمل بائیکاٹ کیا جانا ضروری ہے۔ تاکہ دہشت گردوں کو یہ واضح پیغام ملے کہ اب قوم ان کے خلاف مکمل طور پر متحد ہے۔

پشاور کے آرمی پبلک سکول پر ہونے والا یہ ظالمانہ حملہ اس قدر وحشیانہ ہے کہ اس پر پوری دنیا کا میڈیا بھی چیخ اُٹھا ہے اور دنیا کے تمام ممالک نے اس کی مذمت کی ہے۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے بھی باہمی اختلافات اور محاذ آرائی کو چھوڑ کر اس مشکل گھڑی میں متحد ہو کر مشترکہ لائحہ عمل اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ لوگ اس بار حقیقتاً اس عفریت کے خلاف متحد ہو سکیں گے جس نے ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ یا پھر محض باتیں ہونگی، تقریریں کی جائیں گی، اگر مگر کے سوال اُٹھائے جائیں گے اور ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کے نعروں میں ماؤں کی سسکیاں اور ننھے شہیدوں کا غم بھلا دیا جائے گا۔

ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ کا کہنا ہے کہ ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ دہشت گردوں کو کون لوگ کنٹرول کر رہے تھے، ان کے مددگار کون تھے، وہ کن سے ہدایات لیتے رہے۔ ہم اُن کو مانیٹر کر رہے تھے اور اب ہم اُن کا ملک کی سرحدوں سے باہر بھی پیچھا کریں گے۔ قوم کے نونہالوں کے خون کا بدلہ لیں گے۔ اُن کا کہنا ہے کہ دہشت گرد فوجی وردیوں میں آئے، اُن کے پاس کئی دن کا راشن اور اسلحہ بارود تھا۔ وہ بچوں کو یرغمال بنانے نہیں بلکہ شہید کرنے کی نیت سے ہی آئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا

اور چھپے ہوئے بچوں کو بھی چُن چُن کر نشانہ بناتے ہیں۔ ان لوگوں کا مسلسل اپنے کنٹرول کرنے والوں سے رابطہ تھا۔ فورسز اپنے طور پر ان دہشت گردوں کے خلاف لڑ رہی ہیں، اب حکومت، اپوزیشن اور عدلیہ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

پاک فوج نے آپریشن ضرب عضب کے نام سے دہشت گردوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کا اعلان کر رکھا ہے اور اس حوالے سے پچھلے کچھ عرصہ میں ہماری فوج کو مسلسل کئی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ہم نے دہشت گردوں کی پناہ گاہیں ختم کیں، کئی سرکردہ دہشت گردوں کو ہلاک کیا گیا اور فورسز نے کئی علاقوں کو ان دہشت گردوں سے پاک بھی کر دیا۔ ان کامیابیوں ہی کی بدولت پچھلے کچھ عرصہ سے پاکستان میں دہشت گردی کی وارداتوں میں نمایاں کمی ہوئی تھی مگر اب پھر......ان دہشت گردوں نے وقفہ کے بعد ایک بھرپور سفاکانہ حملہ کیا ہے۔ یقیناً اس واردات نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس سانحہ نے قوم میں 65ء کی جنگ کا سا جذبہ بھر دیا ہے۔ پشاور کے معصوم بچے اب سب پاکستانیوں کے بچے ہیں، سب کو ان کا برابر دُکھ ہے اور اب سب ان دہشت گردوں سے اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اب کوئی ان کے لیے ''سافٹ کارنر'' نہیں دیکھنا چاہتا اور ان کی حمایت کرنے والوں کو بھی بخوبی اندازہ ہوگیا ہے کہ ایسی حمایت کو اس ملک میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔

طالبان اور ان کی طاقت کمزور پڑ رہی ہے، یہ درندے اب اپنی بقا کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں مگر اب اُن کا حتمی انجام بہت قریب ہے۔ پشاور کے آرمی پبلک سکول کے ننھے شہیدوں سے قوم کا یہ وعدہ ہے کہ ان کے قاتلوں کو اب معاف نہیں کیا جائے گا۔ ملک کو ان درندوں سے جلد نجات مل جائے گی۔ انشاء اللہ۔

امجد رؤف خان

چیئرمین یونی فوم کو مبارکباد

چیئرمین یونی فوم انڈسٹریز خالد رشید شیخ حج کا مقدس فریضہ ادا کر کے واپس آئے ہیں۔ ادارہ انہیں اس مقدس فرض کی ادائیگی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ (ادارہ)

حکیم دانا...
حکیم محمد سعید
سیارہ ڈائجسٹ
وہ انعام کے طور پر ملے
اور سزا کے طور پر واپس
لے لئے گئے
اُن ہی کی کرامت تھی
پاکستان کو ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے

حکیم دانا...... حکیم محمد سعید

وضعداری اور جامہ زیبی حکیم سعید پر ختم تھی!

کرامت اللہ غوری

حکیم صاحب کی وضعداری اور شرافت کے قصے تو ہم نے کراچی میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے بہت سنے تھے۔ اپنے خاندان کے ان بزرگوں کو، جو حکیم سعید کے مطب ہمدرد پر ان سے مشورہ کرنے اور نسخہ لکھوانے کے لیے جایا کرتے تھے، یہ کہتے اکثر سنا تھا کہ ان کا آدھا مرض تو حکیم صاحب کے لہجے کی مٹھاس اور سلوک کی اپنائیت سے ہی ختم ہوجاتا تھا لیکن حکیم صاحب سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ کویت سے شروع ہوا، جہاں وہ اکثر بلوائے جاتے تھے!

کویت میں حکیم سعید کی کیا قدر و منزلت تھی، اس کا احساس اس والہانہ اور پُر تپاک استقبال کو دیکھ کر ہوتا تھا جو شیوخ عرب کی روایتی مہمان نوازی سے بھی بڑھ کر حکیم سعید کے لیے دلوں میں موجزن خیر سگالی کے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ حکیم سعید کے مراسم کویت کے شاہی خاندان سے خصوصی تھے اور وہ لوگ جو محرم رازِ درونِ میخانہ تھے اکثر ترنگ میں آکر کہا کرتے تھے کہ حکیم صاحب نے اپنے نسخوں سے کویت کے شیوخ کو اپنا متوالا اور مرید بنا رکھا ہے!

لیکن حکیم صاحب نے صرف نسخے ہی تجویز نہیں کیے تھے، وہ کویت میں اس طب اسلامی کے مرکز کے روح رواں اور ایک اعتبار سے خالق تھے، جو طب یونانی کے مختلف شعبوں میں جدید ریسرچ اور تحقیق کا کام کرنے کے اعتبار سے پورے عالم اسلام میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس مرکز کے تصور قیام سے لے کر منصوبے کے اختتام تک کے تمام مراحل حکیم صاحب کی نگرانی میں گزرے تھے اور سرخرو ہوئے تھے!

لیکن کویتی آخر کو کویتی ہیں اور عالم عرب میں ان کی شہرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ درہم و دینار کے معاملہ میں وہ یہود کو بھی مات دے سکتے ہیں۔ حکیم صاحب سے کویتی حکمرانوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ حکیم صاحب کی زندگی کے سب سے بڑے مشن، یعنی کراچی کے مضافات میں بننے والے مدینۃ الحکمت کے لیے ان کی مساعی میں بھرپور حصہ لیں گے اور اس جدید جامعہ میں آڈیٹوریم اردو کانفرنس سنٹر کے لیے تمام تر وسائل مہیا کریں گے لیکن یہ وعدہ کویت پر عراقی حملے اور قبضے سے پہلے کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تو کویتیوں کا مزاج ہی بدل گیا تھا۔ وعدے وعید زیادہ تر بھول گئے۔ ہمارے وزیراعظم نواز شریف سے بھی انہوں نے وعدہ کیا تھا، جب میاں صاحب امیر کویت سے ان کی جلاوطنی کے قیام طائف میں ملاقات کے لیے گئے تھے کہ عراق

سے آزادی ملنے کے بعد وہ پاکستانیوں کو کویت واپسی کے لیے دیدہ دل فرش راہ کر دینگے لیکن آزادی کے بعد ان سے پاکستانیوں کی واپسی کے لیے ویزوں کا حصول ایک کارِ لاحاصل ثابت ہو رہا تھا۔ جس پر میاں صاحب نے حکم جاری کیا تھا کہ کسی ایسے افسر کو فوری طور پر سفیر بنا کر وہاں بھیجا جائے جو پہلے وہاں رہ چکا ہوا ور قرعہ فال اس حقیر پر تقصیر کے نام نکلا تھا۔

حکیم صاحب کو بھی کویتی، وسائل کی فراہمی کے باب میں ترسا رہے تھے اور اسی تناظر میں حکیم صاحب اکثر کویت آیا کرتے تھے لیکن کیا مجال ہے کہ دوستوں کے اس غیر دوستانہ برتاؤ پر ان کی پیشانی پر کبھی ایک بل بھی پڑا ہو۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے ہر چھوٹے بڑے کویتی صاحب حل وعقد سے ملاقات کرتے تھے اور اس خوش اسلوبی اور شرافت کے ساتھ اپنا مدعا اس کے سامنے رکھتے تھے کہ وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو جاتا تھا!

اور رہی جامہ زیبی..... تو وہ تو نظر آیا کرتی تھی..... ! پہلی ملاقات کے بعد میں نے یہ دستور بنالیا تھا کہ ان کے استقبال کے لیے کویت کے ہوائی مستقر پر انہیں خوش آمدید کہتا تھا..... حکیم صاحب اپنی سفید اچکن میں سرتا پا پاکیزگی اور طہارت میں ملبوس جہاز سے برآمد ہوتے تھے۔ اچکن ہی سفید نہیں ہوتی تھی۔ کرتا، چوڑی دار پاجامہ، موزے اور جوتے سب سفید ہوتے تھے! اور رہا سامان سفر تو وہ ایک چھوٹی سی اٹیچی ہوتی تھی جس میں ایک اور سفید اچکن اور کرتے پاجامے کے ایک جوڑے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ پہلی بار جب میں نے اس مختصر زادِ سفیر پر حیرت کا مظاہرہ کیا..... اس لیے کہ میں نے تو اپنی سفارتی زندگی میں ہمیشہ یہ دیکھا تھا کہ ہمارے VIPs سامان سفر کے بوجھ سے ہلکان جہاز سے اترا کرتے تھے، تو حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ''میاں! ایسے سفر میں بھی اور زندگی کے سفر میں بھی سامان جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے..... بوجھ لادنے سے تو ویسے ہی صحت خراب ہو جاتی ہے!''۔

وہ جسمانی صحت اور بشرے کی وجاہت کا بے داغ نمونہ تھے۔ ان کا معمول یہ تھا، غذا کے معاملہ میں کہ صبح ناشتے میں ایک سیب یا کیلا اور دودھ کا ایک گلاس پیتے تھے۔ دن کا کھانا یا لنچ ان کی لغت میں ناپید تھا۔ دن بھر کے کام کے بعد صرف رات کو مکمل کھانا نوش کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے نصیحت یہی کی تھی کہ کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے والوں کے لیے تین وقت پوری غذا کھانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی زہر پابندی سے لینے لگے اور حکیم صاحب کی یہ نصیحت اس دن سے میری گرہ میں بندھی ہے اور میرے لیے اچھی صحت کی سب سے بڑی ضامن ہے!

ان کی سادگی صرف خوراک اور لباس تک ہی محدود نہیں تھی! جہاز میں سفر کرتے تھے تو ہمیشہ اپنی جیب سے ٹکٹ خرید کر۔ اکانومی کلاس میں، ایک دوبارہ وہ اس حیثیت میں بھی کویت تشریف لائے جب وہ سندھ کے گورنر تھے لیکن کیا مجال کہ سرکار سے ٹکٹ لیا ہو یا کوئی ADC ان کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھ کر چل رہا ہو، ورنہ ان آنکھوں نے تو بارہا ایسے وزیروں کو دیکھا تھا کہ کبھی تن تنہا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ سرکار کے خرچ سے شاہانہ عیاشی عام تھی اور ایک آدھ دم چھلا بریف کیس اٹھانے کو یوں ساتھ ساتھ چلتا تھا جیسے گدھے کے ساتھ اس کی ڈھیچ ہو!

کویتی حکیم صاحب کی یہ خدمت کرتے تھے کہ ان کے لیے ہمیشہ کے لیے فائیو سٹار ہوٹل میں ایک سوئٹ تیار رہتا تھا لیکن حکیم صاحب تو مرد درویش تھے۔ آرام دہ موٹے گدوں والے بستر پر سونے سے انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ میں نے اکثر ان کے ہوٹل کے سوئٹ کے بیڈ روم میں یہ منظر دیکھا تھا کہ حکیم صاحب نے نیچے قالین پر

ایک چادر بچھا رکھی ہے اور اس پر استراحت فرما رہے ہیں!

میں سوال کرتا تھا ''حکیم صاحب یہ کیا بات ہے کہ آپ کو بستر کے گدے سے بالکل رغبت نہیں ہے؟''

جواب میں وہ اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ کہتے تھے'' میاں! عمر بھر اتنے گداز گدے کی عیاشی نہیں کی اور پھر فرش پر سونے کی عادت رہے تو اچھا ہے آخر کو تو ایک دن مٹی پر ہی سونا ہوگا۔

حکیم صاحب کو خون میں نہلا کر مٹی کے بستر پر سُلانے والے بدبخت قاتلوں کو کیا علم ہوگا کہ یہ مرد درویش ہمیشہ سے سنت بوتراب کا مقلد رہا تھا۔ کمال درویشی تھی حکیم صاحب کی فطرت میں۔

میں جانتا تھا کہ زندگی بھر میں لے دے کے جو ایک مکان انہوں نے بنوایا تھا وہ بھی اپنے جیتے جی اپنی اکلوتی اولاد سعدیہ بیٹی کے نام کردیا تھا۔ اس مکان میں بس ایک کمرہ ان کے اپنے استعمال میں تھا اور اس کمرہ میں بھی ان کی کتابوں کا قبضہ زیادہ تھا۔

ہمدرد ٹرسٹ کا ایک ایک پیسہ اس مدینۃ الحکمت کی تعمیر اور ان بہت سے فلاحی اداروں اور انجمنوں کے پالنے پوسنے میں استعمال ہوتا تھا جو پاکستان بھر میں حکیم صاحب کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ روپے پیسے سے انہیں نام کو بھی رغبت نہیں تھی۔ ایک واقعہ اس ضمن میں جو میری یادداشت میں ہمیشہ محفوظ رہے گا اور جسے میں نے ان کی شہادت کے بعد ان پر لکھے گئے تعزیت نامے میں بھی شامل کیا تھا...... ان کی فقیری اور مال و منال سے بے رغبتی کی روشن مثال ہے۔

حکیم صاحب اپنے کویتی میزبانوں سے اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ لینا حرام سمجھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کویت کے طب اسلامی کے مرکز میں ایک بہت بڑی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں دنیا بھر سے طب یونانی کے ماہرین اور زعماء مدعو کیے گئے تھے۔ حکیم صاحب اس کانفرنس کے کلیدی خطیب تھے اور ان کے پرمغز مقالے کو بے حد سراہا گیا تھا۔ میں اس کانفرنس کے ہر اجلاس میں حکیم صاحب کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر شام کو کویت کے معروف میریڈین ہوٹل میں استقبالیہ تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکاء موجود تھے۔ سفراء اور کابینہ کے اراکین بھی شریک محفل تھے۔ حکیم صاحب اور میں چند لوگوں کے ساتھ محو گفتگو تھے کہ منتظمین کانفرنس میں سے ایک صاحب آئے اور حکیم صاحب کو ایک طرف کونے میں لے جا کر ان کے ہاتھ میں ایک موٹا سا سفید لفافہ تھمانا چاہا۔ حکیم صاحب نے پوچھا کہ لفافہ میں کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ کانفرنس کے تمام شرکاء کو نذرانہ دیا جا رہا تھا' سو حکیم صاحب کے لیے وہ ہدیہ پیش کر رہے تھے۔

حکیم صاحب نے لفافہ قبول کرنے سے انکار کردیا، یہ کہہ کر کہ وہ کسی نذرانے یا ہدیئے کے لیے کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے تھے! وہ صاحب اس وقت تو وہاں سے چلے گئے لیکن کچھ دیر کے بعد پھر ایک چکر کاٹ کر آئے۔ اس وقت میں حکیم صاحب سے کچھ فاصلے پر کھڑا کسی اور شریک استقبالیہ سے بات کر رہا تھا۔ وہ صاحب تیر کی طرح میرے پاس آئے اور وہی لفافہ میرے ہاتھ میں تھما کر بڑی لجاجت سے بولے ''سفیر صاحب! حکیم صاحب کو آپ ہی قائل کرسکتے ہیں کہ وہ یہ ہدیہ قبول کرلیں''۔

میں نے لفافہ لے کر اپنے تجسس کو مٹانے کے لیے اسے کھول کر دیکھا کہ اس میں تھا کیا۔ پانچ ہزار ڈالر سو سو کے کرارے نوٹوں کی شکل میں لفافہ میں تھے۔ میں حکیم صاحب کو ایک کونے میں لے گیا اور انہیں لفافہ تھماتے ہوئے بتایا کہ وہ منتظم صاحب کس اصرار کے ساتھ مجھے دے گئے ہیں۔ حکیم صاحب نے یہ دیکھے بغیر کہ اس میں

کتنی رقم ہے مجھ سے کہا " ان حضرت کو یہاں بلایئے!"۔
میں لپک کر اس غریب کو پکڑ کر حکیم صاحب کی خدمت میں لے آیا۔ وہ حیران پریشان تھا لیکن حکیم صاحب نے کمال شفقت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا " دیکھیے! یہ ہمارے سفیر کبیر یہاں موجود ہیں اور میں انہیں گواہ بنا کر آپ سے التجا کر رہا ہوں کہ یہ رقم جو آپ مجھے معاوضے کے طور پر دینا چاہتے ہیں، میری طرف سے اپنے طب اسلامی مرکز کے غریب طلباء کے بہبود فنڈ میں جمع کرا دیں۔ میرا انعام مجھے مل جائے گا"۔
وہ غریب ہکا بکا کبھی حکیم صاحب کو دیکھ رہا تھا کبھی مجھے، وہ شاید یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ کسی انسان کا ظرف اتنا بلند بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گھر آئی لکشمی کو یوں بے نیازی سے لات مار دے۔ شاید اس کی زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ تھا جس میں انسان کا قد کاٹھ دولت اور روپے پیسے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند اور ارفع تھا!
میں اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ شخص اُردو داں ہوتا تو اس لمحہ میں اسے میر صاحب کا یہ شعر ضرور یاد دلاتا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

حکیم صاحب کی شہادت کا سانحہ ان کے دوستوں، مداحوں اور قدر دانوں کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ میں اس زمانے میں عراق میں سفیر تھا اور بغداد میں مجھے یہ اطلاع بین الاقوامی نشریاتی اداروں کے توسط سے ملی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں جب دوستوں سے ملاقات کے لیے کویت گیا تو وہاں حکیم صاحب کے ایک بہت ہی عزیز اور قریبی دوست ڈاکٹر عبدالرحمان العوضی میرے منتظر تھے۔ ڈاکٹر العوضی ایک طویل عرصے تک کویت کے وزیر صحت رہے تھے اور انہی کے دورِ وزارت میں طب اسلامی کے مرکز کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا تھا۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر العوضی میں بہت قربت تھی، بہت دوستی تھی اور مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی ایسا ہوا ہو کہ حکیم صاحب کویت تشریف لائے ہوں اور ڈاکٹر العوضی نے ان کے اعزاز میں پرتکلف عشائیہ نہ دیا ہو۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر العوضی کے ہاں میری اور حکیم صاحب کی نجی نشستیں الگ رہا کرتی تھیں۔ حکیم صاحب اس حوالے سے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے اور خصوصی شفقت اور محبت سے ملا کرتے تھے!
حکیم صاحب کی رحلت کے بعد ڈاکٹر العوضی سے اپنی پہلی نشست میں ہم دونوں گھنٹوں حکیم صاحب کی باتیں کرتے رہے اور انہیں یاد کر کے کڑھتے رہے اور پھر اچانک ڈاکٹر صاحب نے وہ جملہ کہا جو میں سمجھتا ہوں کہ حکیم صاحب قبلہ کی لوحِ مزار پر کندہ ہونا چاہیے تھا، فرمانے لگے:۔
"حکیم (وہ حکیم صاحب کو ہمیشہ حکیم کہتے تھے، کبھی ان کے نام کی اضافت نہیں لگاتے تھے) انسان نہیں فرشتہ تھا...... خدا نے اسے ایک مشن پر یہاں بھیجا تھا اور مشن پورا ہو جانے پر واپس اپنے پاس بلا لیا...... ایسے لوگ خدا روز روز پیدا نہیں کرتا!"
نہیں...... میری دانست میں تو حکیم صاحب وہ انسان تھے جس پر فرشتے رشک کرتے ہوں گے۔ خوش خلقی میں حرفِ آخر۔ مروت اور لحاظ میں لاثانی اور فقیری میں سلطانی اور سلطانی میں درویشی کا اعجاز ان ہی کی کرامت تھی۔
2 ستمبر 1993 کو کراچی میں میری بیٹی تزئین کی شادی طے تھی۔ میں نے اس سے کئی ہفتے پیشتر حکیم صاحب

کو اس کا نیوتہ بھجوا دیا تھا اور ان کا فوری جواب بھی آ گیا تھا کہ وہ ضرور شرکت کریں گے۔ شادی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ان کے ADC کا میرے پاس فون آیا کہ حکیم صاحب بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ اس وقت سندھ کے گورنر تھے۔ فون پر کہنے لگے کل مجھے حیدرآباد (سندھ) جانا ہے۔ دن بھر میرا وہیں گزرے گا لیکن میں شادی میں آؤں گا ضرور، ہوائی اڈے سے سیدھا شادی ہال پہنچ جاؤں گا۔ آپ چنداں پریشان نہ ہوں۔ ہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس لیے کہ حیدرآباد میں تقریب ایسی ہے کہ مجھے دوپہر کا کھانا وہیں کھانا پڑے گا اور آپ جانتے ہیں کہ میں دن میں دو کھانے نہیں کھاتا۔

اور انہوں نے جو کہا تھا وہی کیا۔ ہوائی اڈہ سے سیدھے شادی کے پنڈال پہنچ گئے۔ آئے تو مجھ سے کہنے لگے ''بہت تھک گیا ہوں، زیادہ نہیں رکوں گا، لیکن جب اوپر سٹیج پر دولہا دلہن کے ساتھ بیٹھے تو گھنٹے بھر تک جم کر بیٹھے رہے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ محفل میں شریک ہر مرد و زن بوڑھا اور بچہ ان کے ساتھ تصویر اتروانے پر مصر تھا اور انکار کرنا یا کسی کا دل توڑنا تو ان کی شریعت میں تھا ہی نہیں۔ جانے سے پہلے میری بیٹی اور داماد کو دعاؤں کا توشہ دینے کے ساتھ ساتھ تحائف سے بھی مالا مال کر کے گئے۔

وہ اس دنیا کو بھی بہت کچھ دے کر گئے اور آخرت کے سفر میں، زادِ سفر میں لے گئے، دوستوں کے وہ آنسو جو ان کی شہادت پر بے حساب بہائے گئے۔

انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ کون لوگ ان کے دشمن ہیں اور انہیں اپنے راستے کا کانٹا سمجھتے ہیں! ایک بار کویت میں ان کے قیام کے دوران میری اور ان کی اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی تو بڑی ترنگ میں فرمانے لگے ''میں نے وزیراعظم بےنظیر بھٹو (یہ بےنظیر کے دوسرے عہد وزارت کی بات ہے) سے کہہ دیا ہے کہ میں ایک بند لفافہ میں ان لوگوں کے نام لکھ جاؤں گا جو میرے خون کے پیاسے ہیں اور میرے مارے جانے کے بعد وہ لفافہ کھول کر دیکھ لیں گے تو جان جائیں گے کہ میرے قاتل کون ہیں؟

بےنظیر کو شاید وہ لفافہ کبھی ملا ہی نہ ہو..... مجھے یقین ہے کہ حکیم صاحب نے ایسا کوئی لفافہ بےنظیر کے لیے نہیں چھوڑا ہوگا۔ اس لیے کہ انسان دوستی اور مروت و ہمدردی کے جس اوج کمال پر وہ فائز تھے، وہاں اپنے خون کے پیاسے دشمنوں پر انگلی اٹھانا بھی ان کی شرافتِ طبع پر بہت بھاری رہا ہوگا!

ایک بار اسی دور میں جب وہ سندھ کے گورنر تھے اور بےنظیر ملک کی وزیراعظم تھیں۔ یہ افواہ اُڑ گئی کہ حکیم صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ حکیم صاحب صرف گھائل ہوئے ہیں۔ کسی کا کہنا تھا کہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ میں نے بھی جیسے ہی یہ خبر سنی گھبرا کر کراچی فون کیا، جہاں ان سے تو بات نہیں ہو سکی مگر ان کے قریبی ذرائع نے تصدیق کی کہ حکیم صاحب بخیر و عافیت ہیں!

اس افواہ کے کچھ ہی عرصہ بعد حکیم صاحب پھر کویت تشریف لائے تو میں نے اس افواہ کے بارے میں پوچھا۔ حکیم صاحب ہنس کر کہنے لگے ''اللہ کا شکر ہے کہ بات افواہ تک ہی رہی، دشمنوں کے عزائم پورے نہیں ہوئے''۔

پھر قہقہہ لگا کر بولے'' بےنظیر اس دن کہیں افریقہ کے کسی ملک میں کانفرنس میں تھیں۔ ان کا بھی میرے پاس فون آیا۔ گھبرا کے پوچھنے لگیں ''حکیم صاحب! آپ کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں'' تو میں نے تفریح لینے کے لیے جواب میں کہا: میں اس وقت جنت سے بول رہا ہوں اور یہاں یہ دیکھنے کے لیے آیا ہوں کہ میرے دشمن

جہاں مجھے بھیجنے کے لیے بے تاب ہیں وہاں رہائش وغیرہ کا کیا انتظام ہے!"۔
حکیم صاحب نے مجھے کبھی ان بدبختوں کے نام نہیں بتائے جو ان کی جان کے درپے تھے اور انہیں ختم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی کبھی اصرار یوں نہیں کیا کہ میں اس مردِ قلندر کی بے نیازی اور انسان پروری کو جانتا تھا۔ وہ ایسے ارتکاب جرم سے پہلے کسی پر انگلی اٹھا دیتے۔ ان کی وضعداری اور خون کی نجابت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔
آخر کو وہ فطرتاً بوترابی تھے اور ان کے اور میرے ممدوح، مولائے کائنات علی مرتضیٰؓ تو قیامت تک کے لیے رواداری، انصاف اور انسان دوستی کی وہ درخشاں مثال قائم کر کے گئے ہیں کہ ضربت کے بعد بھی اپنے قاتل کو مہمانوں کی طرح رکھا اور حسنین کو وصیت کر کے گئے کہ جب تک ان کی آنکھیں بند نہ ہو جائیں، قاتل پر آنچ نہ آنے پائے!
ہاں حکیم صاحب کو اپنی نوجوان نسل سے گلہ تھا۔ بہت شاکی تھے، وہ اس نسل کے بے راہروی اور ذہنی اور اخلاقی انتشار سے اور مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے"سفیر صاحب! آپ کی نسل تک تو معاملہ صاف کھرا ہے لیکن آپ کے بعد کی نسل بگڑ گئی ہے۔ اس میں نہ بزرگوں کا لحاظ ہے، نہ شرافت کا معیار!"۔
حکیم صاحب نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ خود سے چل کر مہاجر قومی موومنٹ کے عزیز آباد کراچی میں واقع مرکز جسے نائن زیرو کہا جاتا ہے، گئے تھے اس تحریک کے قائد الطاف حسین سے ملاقات کی نیت سے، لیکن قائد تحریک کے پاس ان سے ملنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے بڑے تاسف سے فرمایا" دیکھئے اس نوجوان نسل کی بے مروتی اور اخلاقی وتہذیبی گمراہی کہ میں بزرگ تھا پھر بھی میں نے پیش رفت کی، لیکن موصوف کا حسن اخلاق یہ ہے کہ مجھے گھنٹے بھر تک باہر انتظار میں بٹھانے کے بعد یہ کہلوا دیا کہ وقت نہیں ہے، مصروفیت بہت ہے"۔
حکیم صاحب کے قاتلوں کا سراغ آج تک نہیں ملا، یا یہ کہ سراغ مصلحتِ شہریاری اور مجبوری خسرواں کے ہاتھوں رازِ سربستہ ہی رہ گئے۔ کتنے ہی ہاتھ ہیں جن پر اس فرشتہ صفت حکیم حاذق اور حکیم دانا کا لہو ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ روایت بہت پرانی ہے کہ قاتلوں کے گھناؤنے چہروں پر پردہ پڑا رہے۔ شہید ملت لیاقت علی خاں کے قتل کو ساٹھ برس ہو گئے۔ آج تک ان سازشیوں کے نام ملفوف ہیں جنہوں نے کرائے کے قاتل سے اس بطل عظیم کو قتل کروایا۔ حکیم صاحب بے نظیر کو اپنے قتل کی دہائی دیتے دیتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور پھر بے نظیر بھی شہید ملت اور حکیم صاحب سے وہیں جا ملیں۔ ان کے قتل کا معمہ بھی نہ جانے کب تک یونہی ہوا میں معلق رہے گا۔ مصطفیٰ زیدی نے سچ کہا تھا:

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

حکیم سعید کے بدبخت قاتلوں کا جرم صرف یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ایک ایسے طبیب حاذق کو مٹا دیا جس کے ہاتھ میں، اس کے مریضوں کے بقول، مسیحائی کا اعجاز تھا، نہیں، انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ حکمت وعلم کے اس فانوس کو بجھا دیا جو علم وفکر کے چراغ روشن کر رہا تھا اور جسموں کے ساتھ ساتھ روحوں کی مسیحائی بھی کر رہا تھا!

حکیم سعید نے 'شام ہمدرد' کے عنوان سے فکر وفنون کے مذاکروں کا جو آغاز کیا تھا وہ پاکستان میں اپنی نوعیت کی ایک انوکھی اور جدت طراز تحریک تھی۔ وہ جس طرح پاکستان کے 'کراچی کے ماسوا' ہر بڑے شہر میں مہینے میں کم سے کم ایک مرتبہ اپنا مطب لگاتے تھے۔ اسی طرح ہر اس شہر میں علم وعرفان کا دانش کدہ بھی منعقد ہوتا تھا، جس میں ملک کے نامور مشاہیر علم وادب اور دانشور اپنے افکار کے چراغ روشن کیا کرتے تھے۔ ایک دبستان علم تھا جو حکیم صاحب نے تن تنہا اپنی علم دوستی کے بل بوتے پر کھول رکھا تھا اور یہ ایک ایسی سلسبیل تھی جو علم وآگہی کے تشنہ لبوں کی پیاس بجھایا کرتی تھی۔ حکیم صاحب کے اس دنیا سے پردہ کرلینے کے بعد وہ دبستان بند ہوگیا! وہ فانوس بجھ گیا جس سے علم وعرفان وآگہی کے نئے چراغوں کی قطاریں روشن ہورہی تھیں اور پرانے چراغوں کی لو بلند ہورہی تھی۔ انہیں بادمخالف کا سامنا کرنے اور تند ہواؤں کی موجودگی میں روشن رہنے کا حوصلہ اور جسارت مل رہی تھی!

حکیم صاحب کا یہ گلہ، جو وہ مجھ سے اکثر کیا کرتے تھے، غلط نہیں تھا کہ ہماری نئی نسل کے خودساختہ رہنماؤں اور عیاروں نے نوجوانوں کے ہاتھ سے قلم چھین کر کلاشنکوف تھمادی ہے اور اب سینۂ قرطاس پر علم کے موتی بکھرنے کے، بجائے دھرتی کے سینے پر آئے دن لہو کی تحریریں لکھی جارہی ہیں۔ انہی ناسپاس اور بدبخت ہاتھوں نے حکیم صاحب کے نجیب خون کو بھی پاکستان کی مٹی کی خوراک بنادیا۔

لیکن حکیم صاحب کا مشن جاری ہے۔ مدینۃ الحکمت ان کی عمر بھر کی محنت شاقہ کا ثمر ہے اور جب تک درس وتدریس اور تحقیق وتجربہ کی یہ درسگاہ' یہ جامعہ علم ودانش کی روشنی پھیلاتی رہے گی حکیم صاحب کے مجاہدہ کا فیض دنیا بھر کے متلاشی علوم کی پیاس بجھاتا رہے گا۔

حکیم صاحب میری کتاب میں ان افراد کی فہرست کے سرآغاز پر آتے ہیں جن کے متعلق خوف وخطر یہ فیصلہ دیا جاسکتا ہے:

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں!

شہید حکیم محمد سعید کی یاد میں

(جاوید چودھری)

کیلنڈر پر جب بھی اکتوبر طلوع ہوتا ہے' میرے دل کی دھڑکنیں رُک سی جاتی ہیں اور حکیم سعید صاحب کی یادوں کی ریت آنکھوں کی پتلیوں پر رگڑ کھانے لگتی ہے۔ میں حکیم صاحب سے نومبر 1993ء میں پہلی بار ملا تھا' حکیم صاحب کے ہونٹوں پر ایک طلسماتی مسکراہٹ اور ہاتھوں میں خوشبودار گرمائش تھی۔ میں اس وقت ایک عام' معمولی صحافی تھا جب کہ حکیم سعید عالمی شخصیت، مگر حکیم صاحب نے اپنائیت سے میری طرف دیکھا اور ان کے ساتھ زندگی بھر کا تعلق پیدا ہوگیا۔ میں عام زندگی میں ایک غیر سنجیدہ اور کیئرلیس انسان ہوں' میں زیادہ دیر تک، خاموش اور باادب نہیں بیٹھ سکتا جب کہ حکیم صاحب کی محفل میں ایک مقدس اور متبرک سی خاموشی ہوتی تھی مگر اس تضاد کے باوجود ان کے ساتھ میری دوستی ہوگئی' حکیم صاحب نے میری غیر سنجیدگی کے ساتھ خاموش سمجھوتا کرلیا۔ وہ شروع شروع میں میری غیر سنجیدہ باتوں پر خاموش رہتے تھے' پھر انھوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کردی۔ اس کے بعد وہ ان سے لطف لینے لگے اور آخر میں انھوں نے میری غیر سنجیدگی کو قبول کرلیا۔ مجھے ان

دنوں شوگر کا مرض لاحق ہوگیا' میں حکیم صاحب کے پاس حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا ''حکیم صاحب مجھے شوگر ہو گئی ہے' میں کیا کروں'' انھوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولے ''کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ چھوٹی سی بیماری ہے یہ تمہارا کیا بگاڑ لے گی'' میں نے عرض کیا ''حکیم صاحب میں بیماری سے خوفزدہ نہیں ہوں' میں اندیشے میں مبتلا ہوں'' فرمایا ''کیا مطلب'' میں نے عرض کیا ''جناب میں نے سنا ہے شوگر کے مریض اعصابی کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں اور میں اس کیفیت سے بہت ڈرتا ہوں'' حکیم صاحب نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر بولے ''یار میرا بھی یہی مسئلہ ہے'' میری ہنسی نکل گئی اور میں نے عرض کیا ''حکیم صاحب چلیے پھر دونوں مل کر کوئی حکیم تلاش کرتے ہیں'' حکیم صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے ''بالکل ٹھیک ہے' کوئی حاذق حکیم تلاش کرتے ہیں''۔

دنیا میں کوئی شخص اس وقت تک بڑا انسان نہیں بن سکتا جب تک اس میں تین خوبیاں نہ ہوں' ایک' اس میں حس مزاح نہ ہو۔ دو' اس میں جمالیاتی حس نہ ہو اور تین' اس کی ذات میں رومانویت نہ ہو۔ حکیم صاحب میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔ وہ خوشگوار مزاج کے انسان تھے' آپ ان کی محفل میں بیٹھ کر بور نہیں ہوتے تھے' ان کی طبیعت میں حسن جمال خون بن کر دوڑتی تھی' وہ صاف ستھرا اور شفاف لباس پہنتے تھے' حکیم صاحب کی گفتگو تک میں کوئی سلوٹ نہیں ہوتی تھی' حکیم صاحب کے فقرے ایسے ہوتے تھے جیسے ابھی ابھی دھوبی کے گھاٹ سے دھل کر استری ہو کر آئے ہیں' لفظوں کا چناؤ ایسا جیسے ان کے تمام لفظوں نے عطار کی دکان میں آنکھ کھولی ہے اور آپ کے دائیں بائیں ماحول میں نفاست کے انبار۔ رہ گئی رومانویت تو آپ شاعر کا دل' مصنف کی آنکھ اور موسیقار کا احساس لے کر پیدا ہوئے تھے۔

آپ حکیم صاحب کی تحریریں پڑھیں' آپ کو ان کے ایک ایک فقرے میں رومانویت کی ہلکی ہلکی تپش اور جذبوں کی بھینی بھینی خوشبو ملے گی۔ حکیم صاحب کی رومانویت اور عام انسانوں کی رومانویت میں فرق تھا' عام لوگ اس جذبے کو لیلاؤں کی گلیوں میں ''رول'' دیتے ہیں جب کہ حکیم صاحب نے اپنے اس جذبے کو ملک' قوم اور ملت کے ساتھ وابستہ کر کے اسے عبادت گاہ کی شکل دے دی چنانچہ حکیم صاحب کی رومانویت قوم کی کردار سازی کا فرض ادا کرتی نظر آتی ہے۔ امریکا کے ایک ادارے نے دس برس قبل دنیا کے ایک ہزار نو سو ایک کامیاب لوگوں کی عادتوں کی ایک فہرست بنائی تھی' ان تمام کامیاب لوگوں میں سات عادتیں مشترک تھیں' یہ لوگ وقت کے پابند تھے' حکیم صاحب بھی وقت کی انتہاء پابندی کرتے تھے' ان کے دس بجے ٹھیک نو بج کر 59 منٹ پر بجتے تھے' وقت سے معاملے میں گھڑی کی سوئیاں دھوکا کھا سکتی تھیں لیکن حکیم صاحب کے معمولات میں لغزش نہیں آتی تھی' دنیا کے کامیاب لوگ کام کرتے رہتے تھے' حکیم صاحب کام کو ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔

انھوں نے لاکھوں خطوط کا جواب اپنے ہاتھ سے دیا تھا' وہ گاڑی میں ہوں' جہاز میں یا پھر کسی تقریب میں وہ مسلسل لکھتے رہتے تھے' وہ سندھ کے گورنر بھی تھے تو معمول کے مطابق مریضوں کا معائنہ کرتے تھے۔ حکیم صاحب نے مختصر سی زندگی میں اتنے ادارے قائم کیے جتنے ہزاروں لوگ مل کر سینکڑوں برسوں میں قائم نہیں کر پاتے۔ دنیا کے کامیاب لوگ ایماندار ہوتے ہیں' حکیم صاحب کی ایمانداری ایمان کو چھوتی تھی' حکیم صاحب نے پوری دنیا میں کوئی ذاتی جائیداد نہیں بنائی' آپ کا اربوں روپے کا ادارہ ہمدرد پاکستان کے نام وقف ہے۔ وہ اپنی بیٹی سعدیہ راشد کے گھر میں ایک کمرے میں رہتے تھے اور اس کا بھی باقاعدہ کرایہ ادا کرتے تھے' سندھ کے

گورنر تھے' لاہور میں مریضوں کے معائنے کے لیے آتے تھے تو ذاتی جیب سے اکانومی کلاس کا ٹکٹ خریدتے تھے' خود اکانومی میں بیٹھتے تھے اور ان کے ملٹری سیکرٹری فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے' ملٹری سیکرٹری کو شرم آتی تھی لیکن آپ انھیں کہتے تھے ''بیٹا آپ میرے لیے اپنا اسٹیٹس خراب نہ کریں' میں ذاتی کام سے سفر کر رہا ہوں' آپ اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں' آپ اپنے اسٹیٹس کے مطابق رہیں' مجھے اپنے اسٹیٹس کے مطابق رہنے دیں''۔

لاہور اُترتے تھے تو ہمدرد ادارے کی سوزوکی کار میں مطب جاتے تھے' کراچی میں بھی ذاتی کاموں کے لیے ذاتی کار استعمال کرتے تھے' دنیا کے کامیاب لوگوں میں عاجزی تھی' حکیم صاحب بھی انکسار سے بھرے ہوئے تھے' وہ کسی تقریب میں جاتے تو ریکارڈ سے اس علاقے کے مریضوں کے ایڈریس نکلوا کر ساتھ لے جاتے اور جاتے اور آتے ہوئے مریضوں کے گھر جا کر ان کی خیریت معلوم کرتے' پاؤں تک سے جھک کر ملتے تھے' انھوں نے کبھی ڈرائیور کو ڈرائیور اور چپڑاسی کو چپڑاسی نہیں سمجھا' وہ سب کو انسان سمجھتے تھے اور انھیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیتے تھے۔

دنیا کے کامیاب لوگ بے لوث تھے' حکیم صاحب کو بھی لالچ اور ترغیب چھو کر نہیں گزری تھی' انھوں نے جو کچھ کمایا ملک کے نام کر دیا' کراچی کے مضافات میں اسکول قائم کیا اور ڈاکوؤں کے دیہات میں جا کر ان کے بچوں کو مفت تعلیم دینا شروع کر دی' اس ملک میں جس میں ہر زور آور کے دامن پر کسی نہ کسی این آر او کا داغ ہے اس میں حکیم سعید واحد انسان تھے جن کے شفاف دامن کی قسم فرشتے بھی کھا سکتے ہیں۔ دنیا کے کامیاب لوگ بہادر تھے' حکیم صاحب کے لہو میں بہادری سرخی کی حیثیت رکھتی تھی' ان کی شہادت بھی بہادری کی وجہ سے ہوئی تھی' انھوں نے ملک کے ان طبقوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا جن کی طرف قانون تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا' آپ کو رفقاء نے سمجھایا تو آپ نے جواب دیا ''میں نہیں بولوں گا تو کون بولے گا'' اور دنیا کے کامیاب لوگوں کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا' حکیم صاحب بھی جو کہتے تھے وہ کرتے تھے اور جو کرتے تھے اسی کی تبلیغ فرماتے تھے' ان کی ذات میں قول اور فعل جڑواں بھائیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے 17 اکتوبر 2009ء کو لاہور میں حکیم سعید کی 11 ویں برسی منائی گئی' میں بھی اس تقریب میں شریک تھا' تقریب کی نظامت ٹیلی ویژن کے مشہور کمپیئر نور الحسن نے کی' نور الحسن نے تقریب کے آخر میں فرمایا ''ہم 17 کروڑ لوگ حکیم سعید صاحب کی صاحبزادی محترمہ سعدیہ راشد سے معافی مانگتے ہیں کہ ہم حکیم صاحب کے قاتلوں کو سزا نہیں دے سکے'' یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوگی حکیم سعید 17 اکتوبر 1998ء کو کراچی میں شہید ہوئے' ان کے قتل کے الزام میں لوگ پکڑے گئے لیکن صدر پرویز مشرف کے این آر او کی وجہ سے ان لوگوں کا جرم بھی معاف کر دیا گیا' یہ لوگ بھی این آر او کی واشنگ مشین میں دھو دیئے گئے اور اس ظلم پر ہماری پارلیمنٹ کے کسی رکن نے آواز نہیں اٹھائی۔ کیا یہ حکیم صاحب کی شہادت سے بڑی بدقسمتی نہیں...! ہم سب واقعی اس قابل نہیں ہیں کہ حکیم سعید صاحب جیسے انسان ہمارے درمیان ہوتے کیونکہ حکیم سعید حضرت امام حسینؓ کے قافلے کے بچھڑے ہوئے رکن تھے اور حضرت امام حسینؓ کے قافلے کے لوگ کبھی کوفے میں قیام نہیں کیا کرتے۔

مدینے کا شہید

پچھلے موسم سرما میں ایک نامور پاکستانی دانشور بھارت گئے، دورے کے اختتام پر ایک غیر سرکاری تنظیم نے

دہلی میں ان کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا جس میں پاکستانی دانشور کو ''خراج عقیدت'' پیش کرنے کیلئے چوٹی کے بھارتی دانشور تشریف لائے ،نشست کے آخر میں جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ہندو دانشور نے اپنے معزز مہمان سے ایک عجیب سوال پوچھا، پوچھنے والے نے پوچھا۔ ''یہاں بھارت میں تو مسلمان مساجد میں نماز ادا کرتے ہیں وہاں پاکستان میں کہاں پڑھتے ہیں؟'' ۔پاکستانی دانشور نے اس سوال کو مذاق سمجھ کر فلک شگاف قہقہہ لگایا لیکن جب انہیں محفل کی طرف سے کوئی خاص ردِعمل موصول نہ ہوا تو انہوں نے کھسیانا سا ہو کر سوالی کی طرف دیکھا، ہندو دانشور کے چہرے پر سنجیدگی کے ڈھیر لگے تھے۔

پاکستانی دانشور نے بے چینی سے پہلو بدل کر جواب دیا۔''ظاہر ہے مسجدوں میں ہی پڑھتے ہیں'' ۔ یہ جواب سن کر ہندو دانشور کھڑا ہوا ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور پھر مسکرا کر بولا ''لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق تو پاکستانی مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کو گولی مار دی جاتی ہے۔'' ہندو دانشور کا تبصرہ پاکستانی دانشور کو اسکڈ میزائل کی طرح لگا، اس کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا، ہاتھوں پر لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھوں میں سرخی آ گئی، منتظمین موقع کی نزاکت بھانپ گئے لہٰذا انہوں نے فوراً نشست کے اختتام کا اعلان کر دیا یوں پاک بھارت تعلقات مزید بگڑنے سے بچ گئے۔

یہ واقعہ مجھے مرحوم حکیم سعید نے سنایا تھا، مجھے آج بھی وہ گرم سہ پہر یاد ہے میں ہمدرد دوا خانہ راولپنڈی میں حکیم صاحب، کے کمرے میں بیٹھا تھا، مرحوم خلاف معمول تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ میں نے ادب سے طبیعت کے اس بوجھل پن کی وجہ دریافت کی تو دل گرفتہ لہجے میں بولے ''ہم نے اس دکھ سے بھارت چھوڑا تھا کہ ہمیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہ تھی، ہم نماز پڑھنے جاتے تھے تو ہندو مسجدوں میں سور چھوڑ دیتے تھے، خانہ خدا کے دروازے پر ڈھول پیٹتے تھے، بول و براز کی تھیلیاں ہمارے اوپر پھینکتے تھے، ہندو شر پسند پچھلی صفوں میں کھڑے نمازیوں کو چھرے گھونپ کر بھاگ جاتے تھے، ہم نے سوچا چلو پاکستان چلتے ہیں وہاں کم از کم ہمارے سجدے تو آزاد ہوں گے، ہماری مسجدیں، ہماری درگاہیں تو محفوظ ہوں گی لیکن افسوس آج مسلح گارڈز کے پہرے کے بغیر پاکستان کی کسی مسجد میں نماز کا تصور تک نہیں، مجھے میرے بڑے بھائی حکیم عبد الحمید دہلی سے لکھتے ہیں ''سعید واپس آ جاؤ'' پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں، یہاں ادھر کم از کم مسجدیں تو محفوظ ہیں۔۔۔۔۔لیکن میں۔ ان کی آواز اکھڑ گئی۔'' پاکستان آنے پر آپ کو کبھی پچھتاوا ہوا؟'' میں نے نرمی سے پوچھا انہوں نے اچکن کے بٹن سہلائے ''نہیں'' ہرگز نہیں، یہ سودا ہم نے خود کیا تھا، حمید بھائی میرے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے، ان کی خواہش تھی میں دہلی میں ہی ان کا ہاتھ بٹاؤں، لیکن مجھے لفظ پاکستان سے عشق تھا ،لہٰذا ادھر چلا آیا، اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور وہ ادارہ جس کی بنیاد میں نے بارہ روپے سے رکھی تھی، آج پاکستان کے چند بڑے اداروں میں شمار ہوتا ہے، یہ سب پاکستان سے عشق کا کمال ہے، ان کی آواز میں بدستور ملال تھا، ''لیکن پاکستان کے حالات سے دکھ تو ہوتا ہوگا'' میں نے اپنے سوال پر اصرار کیا ''ہاں، بہت ہوتا ہے، اخبار پڑھتا ہوں، سیاستدانوں کے حالات دیکھتا ہوں، عوام کی دگرگوں صورتحال پر نظر پڑتی ہے تو بہت دُکھ ہوتا ہے، جب ادھر دہلی سے کوئی عزیز رشتے دار پاکستان آ کر کہتا ہے، کیوں پھر، تو دل پر چھری سی چل جاتی ہے، لیکن کیا کریں، گھر جیسا بھی ہے، ہے تو اپنا، ہم اسے چھوڑ تو نہیں سکتے ،لہٰذا لگے ہوئے ہیں اور لگے رہیں گے آخری سانس تک''۔

خون کی کمی اور عام کمزوری کے لئے ایک عمدہ ٹانک

اچھی صحت کے لیے معدنی اجزاء نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ اور بدن کو ان کی روزانہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے اہم معدنی اجزاء کی طرح فولاد (آئرن) ایک ناگزیر ضرورت کا حامل عنصر ہے۔ جس پر صالح خون اور توانا بدن کا دارومدار ہے۔ فولاد کا معدنی جزو خون بناتا اور صاف کرتا ہے۔ اس کی روزانہ ضرورت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرد کو روزانہ 28 ملی گرام عورت کو 30 ملی گرام حاملہ عورت کو 38 ملی گرام اور بچے کو 26 سے 40 ملی گرام تک فولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

خون کے سرخ ذرات مخصوص پروٹین اور فولاد سے بنتے ہیں۔ اور سائنسی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بدن کی پرورش اور انسانی زندگی کے لئے فولاد ایک اہم ضرورت ہے۔ جس کا روزانہ خوراک میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔

فولاد بیماریوں کے خلاف مزاحمت کرتا اور توانائی کی نشوونما کرتا ہے۔ لہٰذا فولاد کا روزانہ حصول ہی صحت کا ضامن ہے انسانی صحت اور زندگی کی ان ضرورتوں کے پیش نظر **مرحبا** لیبارٹریز نے نباتاتی اجزاء پر مشتمل شربت فولاد بنایا ہے جو بدن میں فولاد کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ ان تمام اعضاء کو صحت مند اور فعال بناتا ہے جو فولاد کے معدنی اجزاء کو ذخیرہ کرتے اور انہیں جزو بدن بناتے ہیں۔

بدن میں فولاد کی کمی، وجوہات اور علامات

فولاد کا بدن سے اخراج بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً انفیکشن، ادویات اور کیمیکلز کا زیادہ استعمال، خون کے زیادہ بہنے، اندرونی اعضاء کے متاثر ہونے، اسقاط حمل، حیض میں زیادہ خون آنے، بار بار حمل ٹھہرنے، زیادہ عرصہ تک بچے کو دودھ پلانے، گرمیوں میں بے تحاشا پسینہ بہنے سے فولاد کی کمی ہو جاتی ہے۔ فولاد کی کمی کے باعث تھوڑی سی محنت مشقت پر سانس پھول جانا، چہرے کا رنگ زرد ہونا، جنسی کمزوری غالب آ جانا، چڑچڑے پن کا شکار ہو جانا، ڈیپریشن کا عود آنا، بیماریوں کے خلاف مزاحمت میں کمی ہو جانا، نڈھال اور بے سکون رہنا ایسی علامات پائی جاتی ہیں۔

مرحبا شربت فولاد کی خصوصیات

- جگر معدہ اور اعصابی نظام کو درست کرتا ہے۔
- چہرے کی چھائیاں اور زردی کو ختم کر کے چہرے پر شادابی لاتا ہے۔
- جسم میں توانائی اور چستی بڑھاتا ہے۔
- بھوک بڑھاتا اور ہاضمہ کا عمل تیز کرتا ہے۔
- جوڑوں کے درد رفع کرتا ہے اور دل کی دھڑکن اعتدال پر لاتا ہے۔
- وضع حمل کے دوران خواتین کو جسمانی کمزوریوں سے بچاتا ہے۔

مرحبا لیبارٹریز
142-مین انڈسٹریل اسٹیٹ کوٹ لکھپت لاہور۔ پاکستان
فون نمبر: 5118679-5156068 E-mail: info@marhaba.com.pk

''کوئی ایسی خواہش جس کا آپ نے آج تک کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا'' انہوں نے کچھ دیر تک سوچا ''ہاں کبھی کبھی، جی چاہتا ہے میری موت حمید بھائی سے پہلے ہو، وہ میرے جنازے پر آئیں، میرے چہرے سے چادر سرکا کر دیکھیں اور پھر آہستہ سے مسکرا کر کہیں، ہاں سعید تمہارا فیصلہ غلط نہیں تھا''۔

وہ گرم دوپہر ڈھل گئی تو اس کے بطن سے آج کی خنک اور غمناک صبح طلوع ہوئی، میرے سامنے میز پر آج کے اخبار بکھرے پڑے ہیں، ہر اخبار کی پیشانی کے ساتھ آج کے سب سے بڑے انسان کی تصویر چھپی ہے، خون میں نہائی اور حسرت میں ڈوبی ہوئی تصویر جو ہر نظر سے چیخ چیخ کر ایک ہی سوال کر رہی ہے۔ میرا جرم کیا تھا، مجھے کیوں مارا گیا، میں تو زخموں پر مرہم رکھنے والا شخص تھا پھر میرے جسم کو زخم کیوں بنا دیا گیا'' میرا دماغ سلگتی لکڑیوں کی طرح چٹخنے لگا میں نے سوچا، یہ تصویر آج دہلی کے کسی اخبار میں چھپی ہوگی، وہ اخبار ہمدرد نگر کے ایک چھوٹے سے غریبانہ کمرے میں بھی پہنچا ہوگا، چٹائی پر بیٹھے ہوئی بیاسی برس کے ایک بوڑھے نے بھی اسے اٹھایا ہوگا، اس کی آنکھیں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح چھلک پڑی ہوں گی، اس نے بھی شدت جذبات سے اخبار پرے پھینک دیا ہوگا، اس نے بھی بازو پر دانت جما کر چیخ ماری ہوگی، اس نے بھی اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا ہوگا، اس نے بھی چلا چلا کر کہا ہوگا۔ ''سعید تمہارا فیصلہ غلط تھا، مجھے دیکھو بیاسی برس کے اس بوڑھے کو دیکھو، یہ بغیر محافظ کے مسجد جاتا ہے، پیدل مطب پہنچتا ہے، روز صبح شام کافروں کے درمیان چہل قدمی کرتا ہے، لیکن اس پر بھی کوئی گولی نہیں چلی، اس کا کبھی کسی نے راستہ نہیں روکا۔ ہاں اس بیاسی برس کے کمزور بوڑھے نے چلا چلا کر کہا ہوگا'' سعید کربلا میں تو میں کھڑا تھا لیکن مدینے میں تم مارے گئے''۔

....

HAKIM MOHAMMED SAID (SHAHEED)

(1920 - 1998)

- Chairman, and Waqif Mutawalli, Hamdard Laboratories (Waqf) Pakistan
- President, Hamdard Foundation Pakistan
- Founder-President, Madinat al-Hikmah
- Chancellor, Hamdard University
- President, Hamdard Public School
- Waqif Mutawalli, Hamdard Bangladesh
- Chief Physician, Hamdard Clinics
- President, Pakistan Historical Society, Karachi
- President, Institute of Health and Tibbi Research, Karachi
- President, Institute of Central and West Asian Studies, Karachi
- Federal Minister / Advisor to the President of Pakistan on Tibb from 1979 to 1982
- Governor of Sindh, from 1993 to 1994

Academic Qualifications:

- BEMS from The Ayurvedic and Unani Tibbi College, Delhi, 1940

• D Sc. "Medician Altermative", The International Multidisciplinary Scientific Society on Alternative Medicine - 1984

Languages:

• Urdu and English
• Working knowledge of Arabic and Persian

Honours, Prizes, Awards:

• Sitara-i-Imtiaz. Pakistan 1966
• "Sadiq Dost Award" from the people of Bahawalpur through commissioner of Bahawalpur, Pakistan
• Certificate of Merit from the Institute of History of Science and Technology, Istanbul Technical University, Turkey 1981
• Islamic Medicine Prize. Kuwait Foundation for the Advancement of Sciences. Kuwait 1982
• Winner of the Novosti Press Agency's Abu Ali Ibn Sina (Avicenna) International Prize for 1989. U S S R.
• World No-Tobacco Day Medal. World Health Organization 1965
• Award by the Pakistan League of the United States of America New York, for the services in the fields of health education and social work, 1996
• Outstanding Pakistani Award from the Rotary Club Islamabad Cosmopolitan. 1996
• Commemorative Postage Stamp issued on 17th October 1999 on 1st anniversary of Martyrdom of Hakim Mohammed Said
• Nishan-i-Imatiaz (Posthumous) in the field of Medicine (Hikmat) conferred by the President of the Islamic Republic of Pakistan on the occasion of the Independence Day. 14th August 2000

Editorship (Urdu):

• Hamdard-i-Sehat (Monthly)
• Hamdard Naunehal (Monthly)
• Akhbar-ul-Tibb (Monthly)
• Payami (Urdu version of UNESCO's Courier)

Editorship (English):

• Hamdard Medicus (Quarterly)
• SPEM. Bulletin of the Society for the Promotion of Eastern Medicine
• Medical Times (Fortnightly)
• Hamdard Islamicus (Quarterly)
• Endeavour. Newsletter of Madinat al-Hikmah

Other Achievements:

Author and editor of more than 189 books both in Urdu and English

languages

• Has written more than 500 articles on science, medicines History and Islam

• Treated more than 5 million patients

• Participated in more than 92 international conferences round the globe and presented papers

ابا جان

(سعدیہ راشد)

ہمیں پورا آئیڈیل کسی شخصیت میں مل جائے ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ اس کے ٹکڑے ضرور لوگوں کی شخصیت میں بکھرے مل جاتے ہیں۔ کبھی ایسی کوئی شخصیت بھی مل جاتی ہے جس کے وجود میں ہمارے آئیڈیل کے بیشتر رنگ، بیشتر ستارے، زیادہ سے زیادہ نقوش چمک رہے ہوتے ہیں اور پھر ہم غیر شعوری طور پر اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایک شخصیت ایسی مل گئی جس میں میرے آئیڈیل کے سارے رنگ، سارے نقوش موجود تھے۔ یہ ابا جان تھے، میرے آئیڈیل۔ وہ ایک مکمل شخصیت تھے۔

بیٹیاں یوں بھی باپ سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ میں اپنی امی کے مقابلے میں ابا جان سے زیادہ قریب تھی۔ حالانکہ میں شروع سے ان سے بہت ڈرتی تھی لیکن سب سے زیادہ ان سے محبت کرتی تھی میں وہی ہونا چاہتی تھی جو وہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھ سے یہ کسی نے نہیں کہا۔ میری امی نے بھی نہیں لیکن مجھے یہ احساس شدت سے رہتا تھا کہ میں کوئی بات ایسی نہ کروں جو ابا جان کے معیار عمل سے گری ہوئی ہو۔ میرے قول وعمل میں کوئی پہلو ایسا نہ ہو کہ کوئی کہے۔ یہ حکیم محمد سعید کی بیٹی ہیں۔ مجھے ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ ابا جان نے بڑی محنت، بڑی قربانیوں سے اپنا ایک مقام بنایا ہے، ایک نام پیدا کیا ہے۔ ان کی نیک نامی پر کوئی حرف نہ آئے۔ یہ احساس بچپن کے بالکل ابتدائی زمانے سے میرے لاشعور میں جاگزیں تھا اور جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی یہ احساس شعوری طور پر بڑھتا گیا۔

ابا جان نے میری تربیت اس طرح کی کہ کبھی مجھے بٹھا کر یہ نہیں کہا کہ یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔ تربیت کا ان کا اپنا طریقہ تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ عمل کر کے دکھایا کرتا ہوں۔ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے خاموشی سے میری تربیت کی اور وہ تمام قدریں جو کہ انہیں عزیز تھیں اپنے عمل سے بتا دیں۔ سچائی، دیانت داری، تواضع، شائستگی، رواداری، اخلاق، دین داری۔ انہوں نے مجھے سب سکھا دیا۔ ان کا انداز یہ تھا کہ بس چند گھنٹے ہی تھے جس میں ہم الگ ہوتے تھے ورنہ مستقل ساتھ رہتے تھے حتیٰ کہ جب کسی پروگرام میں جاتے تو ساتھ ہوتے، کوئی ریسیپشن ہوتا تو ساتھ ہوتے۔ دفتر جا رہے ہیں تو ساتھ ہوتا۔ دفتر کے معاملات پر بات ہوتی وقت تو وہ اپنا کوئی ضائع نہیں کرتے تھے، راستے میں ضروری کاغذات بھی دیکھتے جاتے۔ ہم ان کے حوالے سے بھی بات کر لیتے۔ گورنری کے زمانے میں بھی وہ ہماری تربیت کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں کوئی غلط احساس ہو، ہم کسی کمپلیکس میں مبتلا ہوں۔ ہم نے گورنر ہاؤس تو پوری طرح دیکھا بھی نہیں۔ گورنر ہاؤس کی گاڑی تو وہ خود بہت کم استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ سندھ کے گورنر تھے ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔

جہاز کے عملے نے ہمیں اکونومی کلاس میں آگے کی دو سیٹیں جو فرسٹ کلاس کیبن کے فوراً بعد تھیں، ہمیں دی تھیں۔ ائر ہوسٹس نے جو فرسٹ کلاس میں میزبانی کر رہی تھی دیکھا کہ گورنر صاحب بیٹھے ہیں تو اورنج جوس لے کر ہماری طرف آئی اور ابا جان کو پیش کیا۔ انہوں نے نہیں لیا۔ انہوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو میں نے بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابا جان نے جوس کیوں نہیں لیا ہے اور یہ وہ سمجھ رہے تھے لیکن اس کے باوجود جب ایئر ہوسٹس چلی گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا، تمہیں پتا ہے میں نے جوس کیوں نہیں لیا؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ یہ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے تھا۔ کہنے لگے، ہاں۔ ہم فرسٹ کلاس کے مسافر نہیں ہیں۔ اس پر ہمارا حق نہیں تھا۔

اس وقت بھی وہ چاہتے تھے کہ ہماری تربیت ہو اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ یہ ہمارا حق نہیں ہے۔ ورنہ کیا تھا، جوس وہ بھی پی لیتے، میں بھی پی لیتی۔

جب میں چھوٹی تھی تو ابا جان سے بہت ڈرتی تھی۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ ابا جان اتنا ضروری کام کر رہے ہیں کہ آواز بالکل نہیں نکلنی چاہیے۔ وہ گھر میں بیٹھے لکھ رہے ہوتے تھے تو گھر میں سب کو سانپ سونگھ جاتا۔ سانس تک کی آواز نہ آتی کیوں کہ ابا جان کام کر رہے ہیں۔ ہماری شروع سے ہی یہ ٹریننگ تھی کہ ابا جان گھر میں ہوں تو شور نہیں مچنا چاہیے۔ مجھے یاد ہے ایک دن میں صبح سکول جانے کے لیے کپڑوں پر ضد کر رہی تھی۔ ابا جان صبح مریضوں کو دیکھنے مطب جایا کرتے تھے۔ وہ بیٹھے شاید کوئی جوس پی رہے تھے۔ میں امی جان سے مسلسل ضد کر رہی تھی کہ میں یہ فراک آج نہیں پہنوں گی۔ ان دنوں سکول میں کوئی یونیفارم تو تھا نہیں۔ میرے ضد کرنے پر ابا جان کو بہت غصہ آیا۔ کافی دیر تو انہوں نے برداشت کیا۔ پھر ایک تھپڑ میری پیٹھ پر مارا۔ اوہو! میں تو ان سے پہلے ہی بہت ڈرتی تھی۔ اس وقت تو اتنا ڈری کہ بتا نہیں سکتی۔ میرا خیال ہے وہ دن اور آج کا دن، میں نے کپڑوں پر کبھی ضد نہیں کیا۔ جیسا بھی ملا پہن لیا۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ میچنگ ہے، یا یہ میچنگ نہیں ہے۔ بس وہ ایک تھپڑ کافی تھا۔

ابا جان میری تعلیم کی طرف سے بے فکر تھے۔ اس کی ذمہ داری میرے ماموں جان (حکیم محمد یحییٰ) نے سنبھال لی تھی۔ درحقیقت ابا جان کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ دیکھتے کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں، کیا نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا مشن تو چلتا رہا۔ شروع میں ہمدرد کو بنانے میں لگے رہے، پھر مدینۃ الحکمہ بنانے میں لگ گئے۔ ان کا مشن ان سے پورا وقت مانگتا تھا۔

ماموں جان ہماری تعلیم میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں میری تعلیم ان کی مرہون منت ہے۔ میری ابتدائی تعلیم تو سینٹ فلومینا سکول سے جو اب کراسٹ وائنگ سکول کہلاتا ہے، شروع ہوئی۔ یہ سکول ہمارے گھر کے قریب تھا۔ ہم پیدل جاتے تھے۔ کوئی ملازم ساتھ ہوتا تھا۔ پانچویں کلاس سے ہمارا داخلہ سینٹ جوزف کانونٹ میں ہو گیا۔ یہاں داخلہ بہت مشکل سے ملتا تھا۔ بی۔ کے شیخ ان دنوں ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے۔ وہ ماموں جان کے دوست تھے شاید انہوں نے مدد کی۔ ماموں جان کی بیٹی مسعودہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہم دونوں نے ساتھ پڑھا ہے۔ ہم ساتھ ہی رہتے تھے اور ہماری دوستی ایسی تھی کہ ہم میں سے کوئی ایک بیمار پڑتا تو دوسرا بیمار ہو جاتا۔ ماموں جان کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ہم اچھی تعلیم حاصل کریں۔ وہ ہمارے لیے کتابیں خرید خرید کر لاتے اور انہوں نے گھر میں ہمارے لیے لائبریری بنانی شروع کر دی تھی۔ وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ

ہم بچپن ہی سے پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ رہیں اور ان لوگوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں نہیں جو پڑھے لکھے نہ ہوں۔ میری اور مسعودہ کی تعلیم میں ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ہمارا اسکول یونیفارم بنوانے وہ خود جاتے تھے۔ رپورٹ کارڈ پر دستخط بھی وہی کرتے تھے۔ کتابیں بھی وہی دلواتے تھے۔ وہ ابا جان کے بہت قریب تھے اور ابا جان کو اطمینان تھا کہ ہماری تعلیم کا صحیح انتظام ہو رہا ہے۔ بھائی دیکھ رہے ہیں۔ ماموں جان ہمیں ہر ہفتے اولڈ کلفٹن بھی لے جاتے۔ یہ ہر جمعہ کا معمول تھا۔ ابتداء میں ہلکی پھلکی مزاحیہ اور پھر جب ہم بڑے ہوئے تو کلاسک، انگریزی فلمیں بھی دکھانے لے جاتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہماری انگریزی رواں ہو جائے۔

میں چودہ سال کی تھی کہ ابا جان نے مجھے پارٹیز میں لے جانا شروع کردیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی پارٹی جس میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے چینی سفارت خانے میں تھی۔ چینی سفارت خانہ ان دنوں ہمارے گھر کے قریب تھا۔ ابا جان کے ساتھ پہلی بار میں 1963ء میں ملک سے باہر گئی۔ ہم چین گئے، ہندوستان تو ہم شروع میں برابر جاتے رہتے تھے۔ اکثر گرمیوں کی چھٹیاں بڑے ابا حکیم عبدالحمید صاحب کے ساتھ دہلی اور نینی تال میں گزارتے۔ بعد میں بڑے ابا بھی کراچی آنے لگے۔

ابا جان اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے، بہت احترام کرتے تھے۔ نجانے وہ انہیں چھوڑ کر کیسے چلے آئے۔ کہیں انہوں نے ضرور لکھا ہوگا یہ پاکستان کا جذبہ تھا اور مسلم لیگ سے ان کی وابستگی جس نے انہیں

سیارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

قرآن نمبر
ایمان افروز، عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش (تین جلدوں میں۔ قیمت: 525 روپے)

رسولؐ نمبر
سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز (دو جلدوں میں۔ قیمت: 350 روپے)

آثارِ قیامت نمبر
قرآن وحدیث کی روشنی میں علاماتِ قیامت، روزِ آخرت اور حیات بعد از موت کا احوال (قیمت: 175 روپے)

اولیائے کرام نمبر
اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں (چار جلدوں میں۔ قیمت: 700 روپے)

عکس سیرت نمبر
حضرت محمد مصطفیٰؐ کی حیات طیبہ پر مبنی مقدس و نایاب کتاب (قیمت عام ایڈیشن 275 خاص ایڈیشن 450 روپے)

اخلاق رسولؐ نمبر
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات پر مشتمل دستاویز (قیمت: 175 روپے)

فرمانِ رسولؐ نمبر
عاشقانِ رسولؐ کی خدمت میں ایک بے مثال تحفہ (قیمت: 175 روپے)

خلفائے راشدینؓ نمبر
اسلام کی سربلندی کیلئے خلفائے راشدینؓ کی بے مثال قربانیوں کا ذکر (قیمت: 175 روپے)

صحابہ کرامؓ نمبر
ان عظیم ہستیوں کی کہانی جنہوں نے رحمت العالمینؐ کی معیت میں زندگی بسر کی (قیمت: 175 روپے)

ازواج مطہراتؓ نمبر
امہات المومنینؓ کی پاک زندگی کے واقعات جو آج تک یکجا نہیں کیے گئے تھے (قیمت: 200 روپے)

انبیائے کرام نمبر
پیغمبرانِ خدا کی حیات طیبہ جاوداں کے روح پرور تذکرے (قیمت: 175 روپے)

سماجی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں (قیمت: 175 روپے)

قرآنی وظائف نمبر
ہماری آپ کی اور ہر گھر کی الجھنوں، مشکلات کے حل کیلئے وظائف (قیمت: 175 روپے)

معجزات رسولؐ نمبر
سرورِ کونینؐ کی زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونے والے سینکڑوں معجزات پر مشتمل دستاویز (قیمت: 175 روپے)

دعا نمبر
دعا تقدیر بدل دیتی ہے
حدیث رسولؐ (قیمت: 175 روپے)

اسلامی حکایات نمبر
دلچسپ اور پُراثر طرزِ تحریر میں قوت ایمانی سے سرشار سبق آموز حکایات کا مجموعہ (قیمت: 175 روپے)

صحابیاتؓ نمبر
100 سے زائد صحابیاتؓ کا تذکرہ جنہوں نے رسول اکرمؐ سے بیعت کی (قیمت: 175 روپے)

قصص القرآن نمبر
ان واقعات کا مجموعہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ اور انکی امت کو بتانا ضروری سمجھے (قیمت: 175 روپے)

توبہ نمبر
توبہ اللہ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے۔ سنہرے واقعات سے مزین توبہ کے آداب و فضائل (قیمت: 175 روپے)

حج عمرہ اور زیارات نمبر
حج و عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں، اہم مقامات کی نشاندہی اور روڈ میپ (قیمت: 175 روپے)

حقوق العباد نمبر
حقوق و فرائض انسانی بیان کرتا مجموعہ جس پر عمل کرکے ہی سچا مسلمان بنا جاسکتا ہے (قیمت: 175 روپے)

شرعی احکام نمبر
عبادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک مکمل ضابطۂ حیات (قیمت: 175 روپے)

لازوال اسلامی واقعات نمبر
رسولؐ خدا، خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور صالحین کی زندگیوں کے ایمان افروز واقعات (قیمت: 175 روپے)

والدین نمبر
والدین کے فضائل، حقوق اور فرائض آشکار کرتی تاریخی دستاویز.... ہر گھر کی ضرورت! (قیمت: 175 روپے)

پاکستان چلے'' نے پر مجبور کردیا۔ انہیں اپنے بھائی سے بہت محبت تھی اور انہیں چھوڑ کر آنا ان کے لیے یقیناً ایک کٹھن کام تھا۔ میں سمجھتی ہوں یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی۔ اللہ کو ان سے اچھے کام کرانے تھے۔ انہوں نے دل و جان سے پاکستان کی خدمت کی' لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کیا۔

ابا جان کو یوں تو اپنی بہنوں حمیدی بیگم اور محمودی بیگم دونوں سے محبت تھی۔ دونوں ان سے بڑی تھیں لیکن وہ محمودی بیگم کو زیادہ چاہتے تھے۔ وہ انہیں پیار سے موٹا کہتے تھے۔ وہ ابا جان سے آٹھ سال بڑی تھیں اور جب ابا جان چھوٹے سے تھے تو انہیں گود میں لیے پھرتی تھیں۔ پھوپی جان ابا جان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کا دستور تھا کہ وہ عید سے دو تین دن پہلے ہمارے ہاں آجایا کرتی تھیں اور عید کے دو تین دن بعد اپنے گھر واپس جایا کرتی تھیں۔ وہ حکیم یلیسن صاحب کی والدہ تھیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ ابا جان کی شہادت سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ پھوپی اماں کو اللہ سلامت رکھے ہمارے درمیان ہیں۔ وہ ابا جان کے پاس ہی رہتی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ کبھی انہیں اس کا خیال آتا تو میری امی سے کہتیں ''سعدیہ آپ کی بھی بیٹی ہے''۔

حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید کی قدریں ایک تھیں، ان کی سوچ' خدمت کا جذبہ عام لوگوں کی بھلائی، ذاتی خوبیاں ایک تھیں البتہ شخصیتیں مختلف تھیں۔ کام کرنے کا انداز مختلف تھا۔ بڑے ابا خاموش طبع تھے، ابا جان اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کرتے تھے لیکن یہ بعد کے زمانے کی بات ہے۔ شروع میں ابا جان زیادہ نہیں بولتے تھے۔ بہت سی باتوں کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے اندرونی خیالات اپنے تک ہی رکھتے تھے۔ جیسا کہ عموماً لوگ گھر میں بیٹھ کر کچھ اپنی' کچھ دوسروں کی باتیں کرتے ہیں ویسا نہیں ہوتا تھا۔ اس قسم کی باتوں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اکثر کھانے پر اس طرح کی باتیں ہوجاتی ہیں لیکن ہمارے ہاں تو کھانے پر بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ خاموشی سے کھانا کھانا ہوتا تھا۔ اگر گودا بھی کھانا ہوتا تو سڑپ کی آواز نہیں آنی چاہیے۔ گودے والی ہڈی الگ رکھ لی جاتی تھی کہ ابا جان چلے جائیں تو شغل ہوگا۔

ہر اتوار کو البتہ شروع میں ابا جان کے کچھ دوست جمع ہوجایا کرتے تھے لیکن یہ گنے چنے لوگ تھے شام کے وقت ہمارے گھر ایک محفل ہوتی تھی مغرب کے وقت یہ لوگ آجاتے تھے اور رات کا کھانا ساتھ کھاتے تھے۔ اس محفل میں مختلف موضوعات پر' حالات حاضرہ پر آپس میں باتیں ہوتیں تھیں۔ اس محفل میں آنے والوں میں ایک مولانا ظہیر الحسن تھے' عزیز کارٹونسٹ تھے' ایک مرزا فرخ بیگ تھے جو ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ ماموں جان ہوتے تھے۔ بس یہی پانچ چھے افراد تھے۔

ابا جان کے دو قریبی دوست تھے۔ ایک مسرت زبیری اور دوسرے کموڈور آصف علوی، عبداللہ بنگالی اور محمد علی رنگون والا بھی ابا جان کے ابتدائی دوستوں میں سے تھے۔ ان دونوں سے ابا جان کی بڑی قربت تھی۔ ایڈ آرٹس کے عبدالغفور صاحب سے بھی ابا جان کی بہت دوستی تھی۔ وہ ہمارے ہاں آتے تھے اور کبھی وہ آتے اور مجھے کوئی انگریزی میں مضمون لکھنا ہوتا تو میں ان سے مدد لے لیا کرتی تھی۔ میران محمد شاہ بھی ابا جان کے بہت قریب تھے۔ مجھے یاد ہے وہ ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ ابا جان ان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ جب ہمارے ہاں آکر ٹھہرنے لگے، تو ابا جان نے ان کے آرام کی خاطر گھر میں بہت سی تبدیلیاں کرائیں۔ میران محمد شاہ کا ایک پرانا ملازم تھا۔ اس کا نام عرب تھا وہ بھی ان کے ساتھ آتا تھا۔ ڈاکٹر سید برکات احمد اور سید یوسف حسین نقوی بھی

اباجان کے بہت قریبی دوست تھے۔ برکات احمد صاحب سے ان کی دوستی دہلی کے زمانے سے تھی۔ برکات احمد صاحب ہندوستان کی فارن سروس میں تھے اور زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ اباجان 1956ء میں جب ترکی گئے تو برکات احمد صاحب ہی کے ہاں ٹھیرے تھے۔ بڑے ابا بھی ساتھ تھے۔ برکات احمد صاحب وطن آتے جاتے کراچی میں ضرور ٹھیرتے۔ ان کا قیام ہمارے ہاں ہی ہوتا۔ ان کی بیگم اور بچے بھی ساتھ ہوتے۔ اباجان ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے بچے بھی اباجان سے بہت محبت کرتے تھے۔ برجیس ان کی بیٹی ہیں۔ نیویارک میں رہتی ہیں۔ اباجان وہاں جاتے تو سب کام چھوڑ کر ان کے ساتھ رہتیں۔ سید یوسف حسین نقوی صاحب کا قیام لندن میں تھا۔ ایک زمانہ میں جب اباجان لندن جاکر وہاں مطب کرتے تھے تو اس کا سارا انتظام نقوی صاحب ہی کرتے تھے۔ ان کے بیٹے بھی اباجان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ محمد شعیب صاحب سے بھی جو صدر ایوب کے دور میں پاکستان کے وزیرِ خزانہ تھے اور بعد میں ورلڈ بینک میں چلے گئے تھے۔ اباجان کی بہت دوستی تھی۔ جمشید نسروانجی مہتہ اور حاجی عبداللہ بنگالی اباجان کے ایسے دوستوں میں تھے جنھوں نے ان کی ہر طرح مدد کی۔

اباجان کے دوسرے دوستوں میں جی الانا' ادریس احمد مینائی اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی بھی شامل تھے اور اکثر ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔ اباجان نے جرمنی' ترکی' کویت' سعودی عرب اور لبنان میں بھی بہت دوست بنائے۔ ان دوستوں میں شیخ ذکی یمانی' ڈاکٹر عبدالرحمٰن العواضی اور ڈاکٹر احسان ڈوگر اماشی شامل تھے۔ اباجان ان ملکوں کا اکثر دورہ کرتے رہتے تھے۔ وہ صحت اور ثقافت سے متعلق کئی تنظیموں کے رکن تھے اور ان کے اجلاسوں اور عالمی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔ اپنی شہادت سے ایک ماہ پہلے وہ اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی کے ایک ذیلی ادارے کی کانفرنس میں شرکت کے لیے ترکی گئے تھے۔ جہاں ان دوستوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اباجان کا بہت دل تھا کہ میں بھی اس سفر میں ان کے ساتھ ہوتی انہوں نے استنبول کے سفرنامے میں لکھا بھی ہے کہ اچھا ہوتا کہ سعدیہ اس سفر میں میرے ساتھ ہوتیں۔ میں بعض نجی مجبوریوں کی وجہ سے نہ جاسکی تھی اور مجھے اب اس کا بہت ملال ہے۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔

امریکہ میں بھی اباجان نے بہت دوست بنائے تھے وہاں کے علمی حلقوں میں اباجان کا بہت احترام تھا۔ واشنگٹن میں ڈاکٹر وی کے شاہ اباجان کے معالج سے زیادہ دوست ہوگئے تھے۔ ان کا پورا گھرانا اباجان کا گرویدہ تھا۔ اباجان بھی ان کا بڑا خیال کرتے تھے اور ہمیشہ احسان مندی کے جذبے سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ اباجان کے بہت سے غیر ملکی دوست جن میں جرمنی کے ڈاکٹر ہان ہولز قابلِ ذکر ہیں کراچی آکر اباجان کے مہمان رہ چکے ہیں۔

گھر کے معاملات میں اباجان کے کچھ اصول تھے اور ان پر سختی سے کاربند رہتے تھے اور ہم سے بھی یہی چاہتے تھے۔ ان کو اس کا بہت خیال رہتا تھا کہ ملازموں کے اوقاتِ کار مقرر ہونے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ ملازم ہے تو سارا دن کام کررہا ہے۔ اس کو آرام نہیں، رات کو دیر تک ہمارے ہاں کبھی کام نہیں ہوا۔ ان کا حکم تھا کہ نو ساڑھے نو بجے ملازم کو رخصت ہوجانا چاہیے اور اسی طرح ڈیڑھ دو بجے جب وہ مطب سے آئیں تو ملازم گھر میں نظر نہ آئے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کام ختم نہیں ہوا ہے اور اباجان کے آنے کا وقت ہوگیا ہے تو ملازم کو کچن میں بند کردیا جاتا تھا۔ وہ ہماری والدہ سے کہتے تھے کہ ملازموں کا ایک دن چھٹی کا مقرر کردو۔ ورنہ وہ ایک دن خود تم سے اس کا مطالبہ کریں

گے۔ ابا جان اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازم ہے تو وہ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح لگا ہے۔ کچھ آرام کا بھی وقت ہونا چاہیے وہ وقت کے بڑے پابند تھے اور چاہتے تھے کہ گھر میں بھی وقت کی پابندی ہو۔

وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت ابا جان نے کہہ دیا کہ فلاں کام فلاں وقت ہوگا تو وہ کام اسی وقت ہوتا تھا۔ میری شادی کے موقع پر فوٹوگرافر آیا اور کہنے لگا کہ پورٹریٹ بنانی ہے۔ مجھے تیاری میں دیر ہوگئی تھی میں نے کہا کہ میں پورٹریٹ نہیں بنواؤں گی۔ دیر ہوجائے گی۔ ہماری تمام سہیلیاں کہہ رہی تھیں کہ پورٹریٹ بنے گی لیکن میں نے منع کردیا کیوں کہ ابا جان نے جو وقت سٹیج پر پہنچنے کا مقرر کردیا تھا، اس وقت وہاں پہنچنا ضروری ہے، دیر کا سوال ہی نہیں ہے۔

ہماری شادی پر دہلی سے قاضی سجاد حسین صاحب آگئے تھے وہ ابا جان کے استاد تھے۔ امی جان کی ان کے آنے سے گویا عید ہوگئی کہ اب ساری خریداری ان کی معرفت ہوجائے گی۔ ابا جان ان سے کہتے مولانا صاحب آپ سنبھال لیجئے۔ ابا جان شروع میں خود خریداری کے لیے جاتے تھے۔ ایک دو دفعہ مجھے جُوتے پہنانے انگلش بوٹ ہاؤس لے گئے۔ وہاں ان کا حساب تھا۔ ابا جان پیسوں سے ڈیل نہیں کرسکتے تھے۔ خریداری کرتے تھے۔ بل آجاتا تھا ادائیگی کردی جاتی تھی۔ جلال دین بھی ایسا ہی تھا۔ ابا جان دکانوں پر جاتے تھے لوگ انہیں پہچان جاتے تھے اور ان کے گرد جمع ہوجاتے۔ ابا جان کہتے تھے کہ میرے دکانوں پر جانے سے دکان داروں کو تکلیف ہوتی ہے اور گاہکوں کو بھی، پھر وہ شاپنگ کے لیے کم ہی جانے لگے۔

شادی کے معاملے میں ابا جان رسم و رواج کے قائل نہ تھے۔ وہ زیادہ خرچ کے بھی قائل نہ تھے۔ شادی میں کھانے کے خلاف تھے۔ میری شادی پر شام کو چائے کا انتظام تھا۔ میرا خیال ہے کئی ہزار مہمان بلائے گئے تھے۔ بہت اچھا انتظام تھا۔ ابا جان چاہتے تھے کہ میں دیکھوں کہ کیسے انتظامات ہورہے ہیں۔ وہ کہتے ''سعدیہ! تم دیکھ رہی ہو جو انتظامات ہورہے ہیں۔ جب میں دلہن بنی بیٹھی تھی تو اس وقت بھی وہ سٹیج پر آکر مجھ سے کہنے لگے۔ ذرا اُٹھ کر دیکھو تو کیسا انتظام ہے''۔ میں سوچنے لگی کہ میں دُلہن بنی بیٹھی ہوں میں کیسے اُٹھ کر دیکھ لوں کہ کیسا انتظام ہے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں میری شادی کا انتظام انہوں نے کیسا کیا ہے۔ مطمئن ہوجاؤں، خوش ہوجاؤں۔

ہماری بڑی بیٹی پیدا ہوئی تو ابا جان اسلام آباد میں تھے، وہ مطب کے لیے آئے ہوئے تھے۔ شعبان کی 14 تاریخ تھی۔ وہ بہت خوش تھے۔ پورے چاند کو دیکھ کر انہوں نے بچی کا نام ماہ نیم ماہ رکھا۔ پھر انہوں نے بچی کو قرآن پاک اور ایک قلم دیا۔ یہ میرے پاس اب بھی رکھا ہے۔ قرآن پاک سونے کے ایک چھوٹے سے کیس میں رکھا تھا۔ کہتے تھے دیکھو! میں نے اسے کتاب اور قلم دیا ہے۔ میری دوسری بیٹی آمنہ بھی اسلام آباد میں پیدا ہوئیں لیکن ابا جان اس موقع پر وہاں موجود نہ تھے میری والدہ تھیں۔

آمنہ کی پیدائش کے بعد ہم نے بہت سفر کیا۔ ابا جان کے ساتھ سفر کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ ہوتا یہ تھا کہ ہم بچی کو دادی کے پاس چھوڑ دیتے تھے اور آمنہ کو نانی کے پاس۔ لوگ کہتے تھے تمہارا بڑا اچھا ارینجمنٹ ہے۔ ایک کو دادی کے پاس چھوڑ دیا اور دوسری کو نانی کے پاس اور چلی گئیں۔ اس طرح میں نے ابا جان کے ساتھ کافی سفر کیے۔ اس ارینجمنٹ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ماہ نیم ماہ اپنے دادا دادی سے زیادہ مانوس ہوگئیں اور آمنہ نانا نانی سے۔
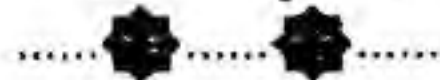
January 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
1					1	2	3
2	4	5	6	7	8	9	10
3	11	12	13	14	15	16	17
4	18	19	20	21	22	23	24
5	25	26	27	28	29	30	31

February 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
6	1	2	3	4	5	6	7
	8	9	10	11	12	13	14
	15	16	17	18	19	20	21
	22	23	24	25	26	27	28

March 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
10	1	2	3	4	5	6	7
	8	9	10	11	12	13	14
	15	16	17	18	19	20	21
	22	23	24	25	26	27	28
14	29	30	31				

April 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
14				1	2	3	4
15	5	6	7	8	9	10	11
16	12	13	14	15	16	17	18
17	19	20	21	22	23	24	25
18	26	27	28	29	30		

May 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
						1	2
	3	4	5	6	7	8	9
	10	11	12	13	14	15	16
	17	18	19	20	21	22	23
	24	25	26	27	28	29	30
	31						

June 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
		1	2	3	4	5	6
	7	8	9	10	11	12	13
	14	15	16	17	18	19	20
	21	22	23	24	25	26	27
	28	29	30				

October 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
40					1	2	3
41	4	5	6	7	8	9	10
42	11	12	13	14	15	16	17
43	18	19	20	21	22	23	24
44	25	26	27	28	29	30	31

July 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
27				1	2	3	4
28	5	6	7	8	9	10	11
29	12	13	14	15	16	17	18
30	19	20	21	22	23	24	25
31	26	27	28	29	30	31	

August 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
31							1
32	2	3	4	5	6	7	8
33	9	10	11	12	13	14	15
34	16	17	18	19	20	21	22
35	23	24	25	26	27	28	29
36	30	31					

September 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
36			1	2	3	4	5
37	6	7	8	9	10	11	12
38	13	14	15	16	17	18	19
39	20	21	22	23	24	25	26
40	27	28	29	30			

November 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
45	1	2	3	4	5	6	7
46	8	9	10	11	12	13	14
47	15	16	17	18	19	20	21
48	22	23	24	25	26	27	28
49	29	30					

December 2015

	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu	Fri	Sat
49			1	2	3	4	5
50	6	7	8	9	10	11	12
51	13	14	15	16	17	18	19
52	20	21	22	23	24	25	26
53	27	28	29	30	31		

"خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں"

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ اپنی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جارہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

husain_sayyed2001@yahoo.com

"میں نے پڑھا"

☆ ملک کو بڑی طرح لوٹا اور برباد کیا گیا ہے۔ سوائے جمہوریت کے کچھ بھی نہیں بچا۔

☆ آج مغرب بحران زدہ ہوگیا ہے کیونکہ سرمایہ داری کی بنا پر انسانی فلاح نہیں، صرف منافع اور سود کا حصول چاہیے۔ جنگوں سے حاصل ہو، ہیروئن اور گانجا فروخت یا اسمگل کر کے ہو!

☆ دن کو رزق کی تلاش کرو اور رات کو اسے جو تمہیں رزق دیتا ہے (حضرت علیؓ)

☆ جاندار خواہ انسان ہو، چونٹی ہو یا ہاتھی، اس کو روح زندہ رکھتی ہے۔ نیویارک کے چند سائنس دانوں نے کچھ عرصہ قبل انسانی روح کا وزن کیا تھا۔ ان کے مطابق انسانی روح کا وزن 21 گرام ہوتا ہے۔ اگر ایک بار یہ 21 گرام انسانی جسم سے نکل جائیں تو پھر پیچھے دوسو پاؤنڈ گندگی اور بدبو رہ جاتی ہے جو بے روح لاش کے سوا کچھ نہیں۔

☆ ایک روایت ہے کہ بھارت کے لیڈروں سے پوچھا گیا کہ 1965ء میں جنگ کے دوران آپ نے پاکستان سے مار کھائی لیکن 1971ء میں پاکستان نے مار کھائی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ 1965ء سے 1971ء تک ہم اسلحہ بناتے رہے اور فوج تیار کرتے رہے اور پاکستانی جنگی ترانے بناتے رہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

''بہن' بھائی کی نوک جھوک،''.....پریشان ہونے کی ضرورت نہیں 'مذہب دونوں کو شرم و حیا کا دامن تھامے رکھنے کی تاکید کرتاہے

مرد کے دامن کی کیچڑ کیچڑ رہے گی، عورت کا داغ بن جائے گی ''بیٹا' بیٹی میں تخصیص کیوں .....؟'' سوال ایک' جواب کئی۔

''امی! بھائی سے بولیں کہ میرے پیسے واپس کرے''۔ امی دیکھیں! بھائی نے آج پھر میری آئس کریم بغیر پوچھے کھالی ہے''۔ ''امی! بھائی نے آج پھر اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ڈرائنگ روم کا حلیہ بگاڑ دیا ہے، حالاں کہ تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے ڈسٹنگ کی تھی اور دیکھیں، یہ دیکھیں، کارپٹ پر گندے جوتے لیے آرہا ہے اور'' ''امی! بھائی کی ایک بات بالکل غلط ہے کہ مجھے چھٹی کے بعد اکثر دیر سے پک کرتا ہے۔ بیس بیس منٹ اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آپ، مجھے وین یا رکشے کا بندوبست کردیں میں روزانہ اس کا انتظار نہیں کرسکتی، بس کہہ دیا ہے میں نے ......!!''

یہ وہ شکایات ہیں، جو آپ کی پیاری، راج دلاری بیٹی کو ہفتوں یا مہینوں نہیں بلکہ ایک ہی دن میں کئی کئی بار بھائی سے پیدا ہو جاتی ہے جو روتی، منہ بسورتی اپنے بھائی سے سخت نالاں ہے اور خوب برا بھلا کہتی ہے۔ کبھی آپ ماما کی آنچ دے کر اس کو شانت کرتی ہیں، تو کبھی اس کے بھائی کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں۔ آپ نہ تو بیٹی کے نازک دل کو دکھانا چاہتی ہیں اور نہ ہی آنکھ کے تارے، بیٹے کو شرمندہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ اپنے بیٹے اور بیٹی کے درمیان بہن بھائی کا یہ رشتہ آپ کو بھی بہت پیارا ہے۔ دلی آسودگی کا سامان ہے۔ آپ کے گھر میں انہیں کے دم سے رونق ہے۔ یہ ہلکے پھلکے، میٹھے شکوے اور جھگڑے بہن، بہن، بھائی، بھائی، کے رشتے میں بھی موجود ہیں۔ مگر بہن، بھائی کے رشتے کی زد میں زیادہ شدت پکڑ جاتے ہیں۔ عموماً ہر ماں ہی اس کوفت میں مبتلا نظر آتی ہے تو کبھی وہ شائستگی سے اسے ختم کرنا چاہتی ہے، تو کبھی لامحالہ ڈانٹ ڈپٹ کا ہتھیار استعمال کرنا پڑتا ہے۔

لیکن ٹھہریئے، ذرا غور کیجئے ناراضی سے لبریز لہجے میں، ان شکایات میں غصیلے بھڑکیلے جملوں میں کہیں بہت پیارا، دل رُبا، اٹوٹ اور گہرا رشتہ بھی تو موجود ہے۔ کسی بہت ہی پاکیزہ اور روح پرور تعلق کا ذکر ہے اور وہ ہے ''بھائی'' کا۔ یہ لفظ محض چند حروف سے نہیں بنا بلکہ یہ تو ماما کی خوش بو اور پدرانہ شفقت کے رنگوں کا مرکب ہے یہ وہ آسمانی رشتہ ہے، جو زمین پر اُتر کر بہن اور بھائی دونوں کو معتبر بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ رشتہ بہن اور بھائی دونوں ہی کو ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر عطا کیا ہے۔ والدین کے بعد یہ رشتہ خلوص اور ایثار و وفا میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہی شکوے گلے اس بندھن کا حُسن ہیں۔ یہ معصوم، انوکھی شرارتیں وقتی بدمزگی کا باعث تو بنتی ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں دل سے بدگمانی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ جہاں بہن اور بھائی کو متاع حیات کے درجے پر فائز کرتی ہے، وہیں ہر بھائی بھی اپنی بہن کا لاڈ اٹھانے میں نہال ہوا جاتا ہے۔ بہن کی آنکھ کے آنسو بھائی کو تڑپا دیتے ہیں، پیسے ادھار لے کر واپس نہ کرنے والا بھائی بلاچوں چراں بہن کی فرمائش پوری کرنے میں اپنی ساری پاکٹ منی خرچ کردیتا ہے۔ بہن کے چہرے کی افسردگی بھائی کے ملال میں اضافہ کرتی ہے اور وہ عہد کرتا ہے کہ آئندہ کبھی بہن کو تنگ نہیں کرے گا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد وہی دھما چوکڑی اور نتیجتاً دونوں کی تُوتُو میں میں شروع ہو جاتی

ہے اور ماں، بے چاری اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، کے مصداق پھر سے ان گتھیوں کو سلجھانے میں کوشاں ہو جاتی ہے۔

والدین سے روزانہ ایک دوسرے کی شکایتیں کرتے یہ بچے معصوم ہیں۔ ان کے درمیان ایسا ان مول رشتہ موجود ہے، جس کی پاکیزگی اور تقدس لفظوں کا محتاج نہیں۔ لہٰذا والدین معمولی اور معمول کی ان رنجشوں پر ہرگز دل گیر نہ ہوں بلکہ ان شکوؤں، گلوں کو اپنے لاڈلوں کے بچپن کی یاد بنا کر دل کے نہاں خانوں میں چھپائیں۔ یہ شرارتیں اور اٹکھیلیاں، ان بچوں کی عمر کا تقاضا ہے اور ہر عمر کا ایک اپنا حُسن ہے۔ خفت اور دباؤ سے اس حُسن کو مت گہنایئے۔ گزرتا وقت بچوں کے ہاتھ میں سنجیدگی اور بردباری خود ہی تھما دیتا ہے۔ سو! آپ کی تربیت کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔ دعاؤں کا وہ جوار بھاٹا جو آپ کے دل میں ہمہ وقت موجزن رہتا ہے وہ خود ہی ان کی حفاظت کرے گا انہیں صلح صفائی پر آمادہ کرے گا۔ بھائی خود ہی جان جائے گا کہ بہن تو مہمان ہے۔ ایک نہ ایک دن گھر آنگن کو ویران کر کے نئی دنیا بسائے گی اور پھر اپنی بہن کے لیے بہترین، ہم سفر کے چناؤ میں یقیناً سب سے زیادہ ممد و معاون اس کا بھائی ہی ہوگا اور اگر آپ (ماں) ان روز روز کی الجھنوں اور شکایتوں پر اپنا دل میلا نہ کرتیں تو یقیناً اپنی بیٹی کے دل کی بات بھی جان لیتیں، کہ جو ہم نے جان لی ہے، وہ یہ کہ آپ کی دلاری بیٹی اپنے لیے ایک من موہنی سی بھابھی لینے جلد ہی چاند پر جانے والی ہے، ذرا اسی سے پوچھیے۔

''گناہ برابر ہے تو بیٹا، بیٹی میں تخصیص کیوں......؟'' نفے، لاہور کے اٹھائے ہوئے سوال کے جواب میں موصول ہونے والے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی حوالے سے چند مزید منتخب خطوط نذرِ قارئین ہیں۔

بے شک مرد اور عورت قدرت کا شاہ کار ہیں، ان میں قدرے مماثلت بھی ضرور ہے۔ دونوں دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ دونوں کے بازو ہاتھ ہیں اور دونوں کے شانوں پر سر ہے۔ کھانے کے لیے ایک منہ ہے، دیکھنے کے لیے دو آنکھیں اور سننے کے لیے دو کان مگر دیکھنے والے نے اس حقیقت کو نہ جانا۔ دونوں باہر سے ایک ہیں اور اندر سے قطعی مختلف، ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ عورت کو دماغ کم زور ملا تھا، اس لیے تخلیقی قوت دماغ کی بجائے رحم کو عطا کی گئی ہے۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت رحم سے۔ عورت کی کوکھ سے ایک نسل نے جنم لینا ہوتا ہے، کیوں کہ کوئی ماں کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔ یورپ میں تو مرد اپنی شناخت ماں سے بھی کرانے کا مجاز ہے!

بات یہ ہے کہ عورت کی عصمت ایک سفید سمور کی طرح ہوتی ہے۔ اس پر ایک دھبا بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے چرچل نے کہا تھا کہ تم مجھے نیک عورتیں دو! میں تمہیں بہترین قوم دوں گا''۔

عورت چراغ خانہ ہے، شمع محفل نہیں اور اسلام میں بھی مرد اور عورت کے لیے علیحدہ علیحدہ ضابطۂ حیات موجود ہے۔

(قلندر حسین سید)

یہ سچ ہے کہ لڑکا، لڑکی دونوں برابر ہے۔ اسلام دونوں کو تاکید کرتا ہے کہ شرم وحیاء کا دامن نہ چھوڑیں، لیکن لڑکی پر لڑکے سے زیادہ ذمے داری اس لیے عائد ہوتی ہے کہ لڑکی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہے۔ یہ وہ رشتے اور ہستیاں ہیں جن کی وجہ سے مرد باپ، بھائی اور شوہر معاشرے میں سر اٹھا کر چلتے ہیں پھر عورت کسی بھی معاشرے کی بنیاد اور اکائی ہے۔ یہی ایک عورت سارے خاندان کو سنوارتی ہے، اسی لڑکی کی گود میں پل کر ایک نسل جوان ہوتی ہے

اگر ایک لڑکی خراب ہوگئی تو پوری نسل کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے، جب کہ اولاد کی پرورش میں مرد کا اتنا اہم کردار نہیں ہوتا، ایک لڑکا خراب ہو تو اس کو ایک سلجھی ہوئی باکردار لڑکی درست کرسکتی ہے لیکن کسی لڑکے میں ایسے جوہر نہیں ہوتے۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ ایک عورت کی بدکرداری یا بے حیائی کی وجہ سے 4 مرد جہنم میں جائیں گے۔ اس کا باپ، بھائی، شوہر اور اس کا بیٹا، کیوں کہ مختلف ادوار میں یہ لوگ وہ ہیں جو ایک عورت کو کنٹرول کرتے ہیں اور اس کو اگر بے راہ روی سے نہ روکیں (قدرت رکھنے کے باوجود) تو وہ جہنمی ہوں گے، جب کہ ایک مرد اپنے کیے کا گنہگار ہے۔

(شیخ نعمان ساجد)

(فریحہ اسحاق کا کالم ''پیارا گھر'' سنڈے میگزین جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

نوحہ قلم

''خاص اشتہارات''

کالے علم اور کالے علم کی کاٹ کے ماہر کالے شاہ المعروف سائیں لفنگا سرکار کا اعلان ہے کہ دنیا میں ہر مصیبت کا حل موجود ہے۔ چاہے وہ کالے علم کے اثرات ہوں یا کالے دھن کے۔ ایک رات کے عمل سے آپ پر کالا علم کرنے والے کا منہ کالا اور اگر آپ کالا دھن اکٹھا کرکے اپنا منہ کالا کرچکے ہیں تو شرطیہ ایک ہفتے میں آپ کا دھن اور منہ چٹا سفید۔ کالا دھندا کرنے والوں کے لیے پولیس اور قانون نافذ کرنے والے، دیگر اداروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے یا رام کرنے کے تیر بہدف نسخے، مخالفین اور رقیبوں کو کالے پانی کی سزائیں دلوانے کے کامیاب گر۔ سرکاری محکموں کی کالی بھیڑوں کا گارنٹی شدہ تحفظ، کالی رتوں کی شرمناک وارداتوں پر پردہ ڈالنے کا حیرت انگیز ہنر۔ کالے کرتوت میڈیا سے چھپانے کے موثر عملیات اور کالا دھن کسی پر ظاہر نہ ہونے کے آزمودہ تعویزات۔ امتحان میں ناکامی یا دھرتا بازوں کو منتشر کرنے میں ناکامی۔ ہر ناکامی کو کامیاب میں بدلنے کا کام بذریعہ عملیات وتعویزات وجنات وچکریات کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ سائیں لفنگا سرکار کے قبضے میں جنات کا پورا ریوڑ ہے۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ کی بنیاد پر جنات سے دشمنوں کی ٹانگیں تڑوائیں۔ اسمبلیاں تڑوائیں۔ ٹیکنو کریٹس کی حکومت بنوائیں۔ اپنے حق میں ووٹ ڈلوائیں۔ عوام کو بے وقوف بنوائیں۔ قرضے معاف کروائیں۔ رقم ڈبل کروائیں یا کوئی دو نمبر کا کام کروائیں۔ ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ سنگدل محبوب آپ کے قدموں میں۔ دل پھینک شوہر منٹوں میں تارک الصورات، ساس آپ کی اگلے جہاں، دولت کی دیوی آپ پر مہربان، بجلی چوری آپ کی دسترس میں۔ انعامی رقم آپ کے کھیسے میں۔ شہرت آپ کی لونڈی اور کھایا پیا آپ کا ہضم۔

نوٹ: ہر کام بغیر لالچ اور نذرانے کے کیا جاتا ہے۔ البتہ جنات کے قیام اور طعام پر کافی خرچہ اٹھ جاتا ہے۔ عاقل را اشارہ کافی است۔ اشتہاری سائیں لفنگا سرکار، بھنگ پورہ۔

(وقار خاں کالم جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

''دعاؤں سے چلنے والا ملک''

میں نے شمسی توانائی سے چلنے والی کار بنائی ہے۔ امریکی سائنسدان نے بتایا۔

''جلد پٹرول اور ڈیزل سے جان چھوٹ جائے گی''۔

''میں نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنایا تھا''

برطانوی سائنس دان نے بتایا ''ایسے انجن برسوں تک ریل گاڑیاں کھینچتے رہے''۔

''میں نے ہوا سے چلنے والی چکی بنائی تھی''

یونانی سائنسدان نے بتایا۔ ”اب انہیں کام میں لا کر بجلی بنائی جا رہی ہے“۔

پھر ان تینوں نے وہاں موجود سیاست دان سے پوچھا ”آپ نے بھی کچھ بنایا ہے؟“

”جی ہاں!“ وہ نحیف آواز میں بولے ”میں نے دعاؤں سے چلنے والا ملک بنایا ہے“۔

☆☆☆

فاطمہ بھٹو کے کالم سے

کراچی سے بھنبھور کا فاصلہ چالیس میل ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوا۔ اگرچہ اب بھنبھور کے قدیم آثار اینٹوں اور مٹی کے ساختہ ٹائلز کی صورت میں ہی نظر آتے ہیں اور بہت کچھ وقت کے ہاتھوں فنا ہو چکا ہے لیکن وہاں اس بات کے آثار اور نشانات آج بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں جن کے سبب یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی قدیم عہد میں دریائے سندھ کے کنارے پر ایک شاندار تہذیب کا وجود رہ چکا ہے جسے تخیل کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حیرت ناک واقعہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے خطے میں پائی جانے والی پہلی مسجد کی بنیادوں کے آثار بھی بھنبھور میں دریافت کیے گئے ہیں۔ سندھ میں مسلمانوں اور اسلام کی آمد سے قبل بھنبھور میں پہلے مغربی ایشیاء کی سلطنت پارتھیا کے باشندے آباد ہوئے۔ جن کے بعد ہندو اور بدھ مت کے پیروکاروں نے بھنبھور کو اپنا مسکن بنالیا جسے برصغیر میں ایک اہم تجارتی اور کاروباری مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ بھنبھور میں ایک عجائب گھر بھی قائم کیا گیا ہے جہاں چین کے بنے ہوئے برتن، اسلامی خطاطی کے کوفی زبان میں تحریر کیے گئے نمونے، چکنی مٹی سے تیار شدہ بھٹیاں اور تنور، ہاتھی دانت اور ٹیرا کوٹا سے بنی جیولری بھی رکھی گئی ہے۔ میں اپنی دو سہیلیوں کے ہمراہ اندرون سندھ کے سفر پر روانہ ہوئی تو بھنبھور ہمارا پہلا پڑاؤ تھا۔

بھنبھور کے بعد ہمارا دوسرا پڑاؤ ہالے جی جھیل پر تھا جو سندھ وائلڈ لائف کے تحت جنگلی حیات کے تحفظ کا ایک اہم مقام ہے۔ ٹھٹھہ ضلع میں واقع کینجھر جھیل بھی جسے پاکستان کی سب سے بڑی جھیل کہا جاتا ہے۔ اس زمرے میں آتی ہے جسے مصنوعی طریقے سے وسیع کیا گیا ہے۔ سرد ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے پرندے ہالے جی جھیل پر اُترتے ہیں۔ ان ہجرتی پرندوں اور جھیل میں موجود مگرمچھوں کو دیکھنے والے مہم جو افراد کے لیے یہاں سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ٹھٹھہ شہر سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران صوبہ سندھ کا دارالحکومت رہ چکا ہے بلکہ کئی معنوں میں یہ قدیم شہر آج بھی سندھ کا ثقافتی دارالحکومت سمجھا جاتا ہے۔ سندھ کی روایتی ”اجرک“ کی بلاک پرنٹنگ آج بھی پورے سندھ میں ٹھٹھہ سے بہتر کہیں نہیں کی جاتی۔ مکلی کا تاریخی قبرستان بھی ٹھٹھہ میں واقع ہے جسے دنیا کا سب سے بڑا قبرستان کہا جاتا ہے یہاں دس لاکھ سے زائد قبریں اور ایک لاکھ صوفیوں کے مزارات اور مقابر موجود ہیں۔ جن کا تعلق چودھویں صدی کے وسط سے تھا۔ مکلی قبرستان کی پہاڑیوں کو ”اقوام متحدہ کے عالمی ورثے“ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

ان تمام مقامات سے گزرتے ہوئے ہم بھٹ شاہ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ بھٹ شاہ کے معنی ہیں ”بادشاہ کا ٹیلہ“ جو حیدرآباد سے قریب واقع ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سالانہ عرس کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہم لوگوں نے ان کے مزار کو گھوم پھر کر دیکھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے تمام مادی آسائشوں اور آسانیوں کو ترک کر کے اپنی پوری زندگی غریبوں اور مفلسوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کی تقریبات ایک میلے کی صورت میں منائی جاتی ہیں۔ شاہ

عبداللطیف بھٹائی کے مقبرے کو پاکستان کے واحد مقبرے کی حیثیت حاصل ہے جہاں پورے سال غروب آفتاب کے بعد قوالی کا دور چلتا ہے۔

لاڑکانہ میں مختصر قیام کے بعد دوسرے دن ہم لوگ کراچی واپس روانہ ہوگئے۔ دوپہر تک ہم منچھر جھیل تک پہنچ چکے تھے جس کی لہروں پر کشتیوں سے بنے مکانات ڈول رہے تھے۔ منچھر جھیل کو آپ صحیح معنوں نہ صرف پاکستان بلکہ ایشیاء کی بڑی جھیل کہہ سکتے ہیں۔ آسمان اس جھیل کے پانی میں تیرتا نظر آتا ہے۔ یہاں ہم نے ماہی گیروں کی تیار کردہ پلا مچھلی اور سائبیریا سے ہجرت کرکے آنے والی مرغابیوں کے گوشت سے لنچ کیا جو روسی موسم سرما کی شدید سردی سے بچ کر اس طرف آنکلی تھیں تاکہ ہماری لذت، کام و دہن کا سامان مہیا کرسکیں۔

سہون شریف میں واقع حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے مزار پر وہاں دھمال ڈالنے والے صوفی فقیر ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ تھے بلکہ میری سہیلی سونی (جس کا تعلق لندن سے تھا اور وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی) بھی ان کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکی تھی۔ ہم اس مزار کے دروازے سے باہر نکلے جو سونے کا بنا ہوا ہے اور جسے شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی نے تحفتاً پاکستان کو پیش کیا تھا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں“

اکثر حکیموں اور ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی بیماری ایسی نہیں، جس کا علاج ان کے پاس نہیں، علاج بھی بڑا موثر، بڑا ہی آسان اور بڑا ہی سستا، جس کا کوئی سائیڈ افیکٹ نہیں۔ اسی لیے بے شمار لوگ طرح طرح کی بیماریاں لے کر بڑی امید کے ساتھ ان حضرات کے پاس جاتے ہیں لیکن کیا کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے اکثر کی حقیقت کیا ہے؟ اور جن ادویات کا بے دریغ استعمال یہ ہم پر کرتے ہیں وہ کہاں اور کیسے تیار کی جاتی ہیں؟

ان میں سے کئی نیم حکیموں کے پاس کسی مستند ادارے کی سند یا ڈپلوما بھی نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ ہم یہ کام شوقیہ کرتے ہیں تو کیا ایک انسان کی صحت سے کھیلنا بھی کسی کی (Hobby) ہوسکتی ہے؟ یونانی ' آیورویدک اور ہومیو پیتھک تعلیم اور ادویات پر جو نام نہاد نگرانی ہوتی ہے۔ وہ نیشنل کونسل برائے ہومیو پیتھی اور نیشنل کونسل برائے طب کے ذریعے ہوتی ہے۔ جن کے ممبران کی اکثریت ”میرا قاتل ہی میرا منصف ہے“ کے مصداق انہی تعلیمی اور ادویات ساز اداروں کے مالکان پر مشتمل ہوتی ہے۔

وطن عزیز میں تقریباً ایک لاکھ 35 ہزار ہومیو پیتھک ڈاکٹر 50 ہزار طب کے پریکٹشنر موجود ہیں لیکن یہ تمام بھی اپنی کونسل کے پاس رجسٹرڈ نہیں۔ نہ جانے کتنوں نے پیشہ ورانہ تعلیم ایسے اداروں سے حاصل کررکھی ہے۔ جہاں داخلے سے فراغت تک کوئی مستند معیار سرے سے مقرر ہی نہیں۔ امتحان کا کوئی ٹھوس طریقہ کار ہے اور نہ تعلیم کا کوئی مستند نظام، نہ ہی کسی بورڈ یا یونیورسٹی سے الحاق، ان میں سے بعض ان کے اپنے بقول ایسی ایسی بیماریوں کے علاج پر بھی قدرت رکھتے ہیں جن کا علاج ہے ہی نہیں۔

ہومیو پیتھک اور طب کی جن ادویات کا بے دریغ استعمال ہم پر کیا جاتا ہے ان کے متعلق بھی کوئی قانون لاگو نہیں۔ جس کا جہاں جی چاہے وہ اپنی مرضی کی کوئی بھی دوا بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان ادویات میں (Steroids) کا استعمال کرکے لوگوں کو بے وقوف بنانے، ان کے مدافعتی نظام کو کمزور کرنے اور ان کی صحت کو بگاڑنے کی شکایات سننے میں اکثر ملتی رہتی ہیں۔ اس طرح جو کشتے بنائے جاتے ہیں ان میں دھاتوں کا استعمال کیا جاتا ہے جو درست

پراسیسنگ نہ ہونے کی وجہ سے نقصان دہ ہوتی ہے۔
ہمارے یہاں انگریزی ادویات بھی بالعموم قانون کے مطابق نہیں بنائی جاتیں لیکن ان کے متعلق کوئی قانون کم از کم موجود تو ہے۔ روایتی طریقہ علاج کا کوئی قانون تو سرے سے نافذ ہی نہیں لیکن اس پر میری طرح آپ کو بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ہم بھیڑ، بکریوں کا ریوڑ ہیں جو ان اشاروں اور آوازوں سے ہانکے جانے کا عادی ہو چکا ہے جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ہماری قومی غیرت جن چیزوں سے مجروح ہوتی ہے ان میں اور تو اور وینا ملک اور میرا جیسی اداکاروں کی وہ اداکاری بھی شامل ہے جو بھارت میں کی گئی ہو لیکن ادویات سازی میں پائی جانے والی لاقانونیت شامل نہیں کیونکہ ہم ایک ایسی "سپر پاور" ہیں جو بین الاقوامی مسائل میں اتنی الجھی ہوئی ہے کہ اس کے پاس کوئی دوسرا کام کرنے کی فرصت ہی نہیں۔
(اسرار ایوب کالم، خبریں ڈاٹ کام سے اقتباس)

غزل

دور رہ کر قریب کتنے تھے
فاصلے بھی عجیب کتنے تھے
درد دل کی دوا نہیں ورنہ
اس جہاں میں طبیب کتنے تھے
عمر بھر جو ساتھ رہا تیرے
اس کے اچھے نصیب کتنے تھے
کیوں نہ آیا میں سپنوں میں تیرے
مرے شکوے عجیب کتنے تھے
(فیس بک ڈاٹ کام سے)

زندگی پیچھے کہیں منہ دیکھتی ہی رہ گئی
کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی
عمر ساری صحرا نوردی کی مگر شادی نہ کی
قیس دیوانہ بھی تھا کتنا سمجھ دار آدمی

دانش و حکمت کی ساری روشنی کے باوجود
کم ہی ملتا ہے زمانے میں کم آزاد آدمی

"زندگی"

میرے نزدیک زندگی ایک شمع کی مانند نہیں ہے جو ایک مختصر دورانیے تک روشنی بہم پہنچا کر اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے بلکہ میرے نزدیک زندگی ایک مشعل کی مانند ہے اور میں اس مشعل کو آنے والی نسل کو منتقل کرنا چاہتا ہوں تا کہ وہ اسے مزید روشنی سے ہمکنار کرے۔
(برناڈ شا)

اس جہاں رنگ و بو کی رونقیں، چہل پہل، رعنائیاں، پھولوں کی خوشبو، قوس وقزح کے رنگ، پرندوں کی چہچہاہٹ، سریلی آوازیں، دریاؤں اور سمندروں کے پانی کی روانی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی نت نئی ایجادات، جس میں حضرت انسان کا چاند پر قدم بھی ہے۔ یہ سب زندگی کی علامات اور قبرستان موت کی بے جان نشانیاں ہیں۔ حادثات سے زندگی نہیں رُکتی اور نہ ہی موت زندگی کو روک سکی ہے۔ موت اپنے تمام تر صدمات، سختیوں، پریشانیوں، غموں اور خوف و ہراس کے باوجود زندگی کو فتح نہیں کر سکی۔ موت شکست خوردہ ہے، شکست کو اہمیت نہ دو۔ آج بھی موت کی آغوش میں منہ چھپائے لوگ قبروں میں دفن پڑے ہیں۔ ان پیاروں، دل کے جگر گوشوں کے لیے وقتی طور پر آہ و بقا اور ماتم داری محض رسمی ہوتی ہے کیونکہ زندگی اپنی پوری آب و تاب سے اس جہاں کو رواں دواں رکھے نظر آتی ہے۔ موت بچاری ششدر اور حیران نگاہوں سے زندگی کی بہاروں کو حسرت بھری نظروں سے تکتی ہے۔ اس لیے کہ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
(جعفر بخاری)

وسیلہ خاتون

جیک رچی، منفرد اور تیکھی کہانیاں لکھنے میں عالمی شہرت رکھتے ہیں
22 منٹوں کی ایک دہشت پسند کہانی

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز کسی نوجوان لڑکی تھی۔ ''سنو کتے سنو!'' نامعلوم لڑکی نے کہا ''ٹھیک بائیس منٹ بعد بلسن ہال میں بم کا دھما کا ہوگا''۔
میں نے جلدی سے سارجنٹ موریسن کو اشارہ کیا۔ وہ میرا اشارہ پاتے ہی راہداری کی طرف لپکا جس کے آخری سرے پر ٹیلیفون کا سوئچ بورڈ لگا ہوتا تھا۔ ''معاف کیجئے گا جناب!'' میں نے ریسیور میں کہا ''لائن کچھ خراب محسوس ہوتی ہے۔ مجھے آپ کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کیا آپ ذرا اونچی آواز میں نہیں بول سکتیں؟''

لڑکی دوبارہ اتنی زور سے چیخ کر بولی کہ اس کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی ''سنو کتے! یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اب سے ٹھیک بائیس منٹ بعد ولسن ہال بم کے ایک زبردست دھماکے کے ساتھ زمیں بوس ہوجائے گا''۔

لڑکی کی باتوں میں الجھائے رکھنا میرا مقصد تھا۔ ''رہنے بھی دیکھئے محترمہ!'' میں نے کہا ''آج کل کی لڑکیاں مذاق بھی کرتی ہیں تو وہی گھسا پٹا برسوں پرانا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے ہاں کوئی پارٹی ہورہی ہے اور کسی نے ازراہِ مذاق آپ سے پولیس کو تنگ کرنے کی فرمائش کی ہے''۔

''کیا تمام پولیس والے گدھے ہوتے ہیں؟'' لڑکی کی آواز سے سخت الجھن جھلک رہی تھی'' کان کھول کر سن لو احمق کتے کہ اس مرتبہ ہونے والا دھماکا پچھلے تمام دھماکوں سے زیادہ تباہ کن ہوگا اور اطلاعاً عرض ہے کہ اب تمہارے پاس ولسن ہال خالی کرنے کے لیے صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں''۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا' نامعلوم لڑکی نے ٹیلی فون بند کردیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر کلاک کی طرف دیکھا شام کے چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اگر لڑکی کی تنبیہ درست تھی تو ٹھیک ساڑھے چھ بجے ولسن ہال کی عمارت ایک زبردست دھماکے کے ساتھ اڑ جانی چاہیے تھی۔ میرا تعلق یونیورسٹی کیمپس کے پولیس تھانے سے ہے۔ یونیورسٹی کیمپس کی آبادی چودہ ہزار نفوس سے زائد پر مشتمل تھی۔ ہوسٹلوں میں رہنے والے طلبہ' تدریسی عملہ' اس کا خاندان اور یونیورسٹی کا انتظامی عملہ اوران کا خاندان اس آبادی میں شامل تھے۔ چودہ ہزار کی آبادی کم نہیں ہوتی۔ یہ اتنی آبادی ضرور تھی کہ یونیورسٹی کیمپس کو ایک چھوٹا سا شہر کہا جاسکتا تھا۔ ایک بڑے شہر میں ایک علیحدہ پرسکون چھوٹا سا شہر لیکن پچھلے دو مہینوں سے اس شہر کا سکون تہہ وبالا ہوگیا تھا۔

پچھلے دو مہینوں میں ہمیں بم پھینکنے کی سات دھمکیاں موصول ہوئی تھیں جن میں سے پانچ تو صرف دھمکیاں ثابت ہوئی تھیں۔ باقی دو دھمکیاں' دو دھماکے ثابت ہوئے۔ پہلا دھماکہ انتظامی شعبے کی عمارت میں ہوا تھا جس میں برائے نام نقصان ہوا تھا یعنی چند کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے لیکن دوسرا دھماکہ بڑا نقصان دہ ثابت ہوتا تھا۔ دھماکہ سائنسی تجربہ گاہ میں ہوا تھا اور اس کے نقصانات کا تخمینہ ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ لگایا گیا تھا۔ اس دھماکے کے بعد ہی ہم نے آنے والے فون ٹیپ کرنے کا انتظام کرلیا تھا۔ بس ہمیں سوئچ بورڈ پر بیٹھے ٹیلی فون آپریٹر کو اشارہ کرنا ہوتا تھا۔ وہ ہمیں نصف منٹ میں یہ بتادیتی تھی کہ وہ ٹیلی فون کس نمبر اور کس جگہ سے کیا جارہا ہے؟

سارجنٹ موریسن واپس آیا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ٹیلیفون ہیزل ہال کے ٹیلی فون بوتھ سے کیا گیا ہے''۔ سارجنٹ نے اطلاع دی۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس گیا اور جھانک کر باہر دیکھنے لگا، سڑک کے اس پار سامنے والی عمارت کے دائیں جانب ہیزل ہال کی آٹھ منزل عمارت کھڑی تھی۔ یہ لڑکیوں کا ہوسٹل تھا اور اس میں اس وقت تقریباً سات سو لڑکیاں رہ رہی تھیں۔ اس سے آگے مزید دو عمارتوں کے بعد ایک چوراہا واقع ہے یہیں کونے میں کھڑی ہوئی پانچ منزلہ عمارت ولسن ہال کہلاتی تھی۔ اس دن اتوار تھا اور رات کے کھانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس وقت عمارت میں سینکڑوں طلبہ اور درجنوں اساتذہ کے بجائے بمشکل درجن بھر طالب علم موجود ہوں گے جو سر جھکائے اپنے کمروں میں مطالعہ کررہے ہوں گے۔

سارجنٹ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا ''صرف اٹھارہ منٹ'' اس نے تلملاتے ہوئے بے بسی سے کہا ''بھلا صرف اٹھارہ منٹ میں پانچ منزلہ عمارت

کی تلاشی کس طرح لی جاسکتی ہے اور وہ بھی ایک ٹائم بم کی تلاشی جو کہیں بھی چھپایا جاسکتا ہے۔ اب ہمارے سامنے ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ عمارت فوراً خالی کرالی جائے تاکہ بم پھٹنے سے کوئی جانی نقصان نہ ہو"۔

میں نے تائید میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔ اتوار کے دن ہمارے پاس صرف ایک پٹرولنگ گاڑی ہوتی ہے اور اس پر دو آدمیوں کی ڈیوٹی رہتی ہے۔ میں نے سارجنٹ سے کہا کہ وہ ریڈیو کے ذریعے اس گاڑی سے رابطہ قائم کرے اور انہیں فوراً ولسن ہال پہنچنے کی ہدایت کردے۔ سارجنٹ نے فوراً ریڈیو روم کی طرف بھاگا۔ میں نے اپنا ہیٹ سر پر رکھا اور کمرے سے باہر نکلنے والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اس نازک موقع پر ٹیلی فون کرنے والے کو آہستہ سے بُرا بھلا کہا اور لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ بولنے والے نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"جناب! میرا نام پرلیٹن ہے" دوسری طرف سے آواز آئی۔

میں اس سے یہ کہنے والا تھا کہ بھائی آدھے گھنٹے بعد دوبارہ فون کر لو کیونکہ اس وقت میں ہنگامی حالت میں پھنسا ہوا ہوں اور تھانے میں عملہ بہت کم ہے لیکن اس کے اگلے جملے نے میرا کھلا ہوا منہ بند کردیا" جناب! میں ولسن ہال سے بول رہا ہوں۔ میں یہاں کا نگراں ہوں' مجھے ابھی ابھی ایک بم ملا ہے" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کیا کہا؟" میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا" کیا ملا ہے" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ایک بم جناب" نگراں نے اپنی بات دہرائی" یہ بم الماری میں رکھا تھا۔ پلاسٹک کے تھیلوں میں بہت سارا آتش گیر مادہ اور پوری الماری ان تھیلوں سے بھری ہوئی تھی"۔

"اُف میرے خدا" میں نے ریسیور مضبوطی سے پکڑ لیا۔" سنو تم جو کوئی بھی ہو میری ایک بات ذہن نشین رکھو تم کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا، سمجھ گئے تم کسی چیز کو چھونا مت"۔

"لیکن میں نے وہ بم ناکارہ بنادیا ہے" نگراں نے کہا۔" تم نے کیا کردیا ہے؟" مجھے ایک بار پھر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"میں نے وہ بم' وہ آتش گیر مادہ ناکارہ بنادیا ہے یعنی اس کا خود کار میکانکی نظام، تار علیحدہ کرکے بے کار کردیا ہے اب جب تک اسے ماچس کی تیلی نہیں دکھائی جائے گی، آتش گیر مادہ بے ضرر رہے گا"۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ایک سانس لیا" تم آخر ہو کون؟"

"ولسن ہال کا نگران جناب! میں کوریا کی جنگ میں سارجنٹ رہ چکا ہو۔ وہاں میں بہت سے دستی اور ٹائم بم ناکارہ بناتا رہا ہوں"۔

میں چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا" آخر تمہیں اس آتش گیر مادے کی موجودگی کا علم کس طرح ہوا؟"

"آج کھانا کھانے کے دوران میں مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ کل صبح لانڈری سے کچھ فالتو چادریں' تولیے وغیرہ دُھل کر آئیں گے تو انہیں رکھا کہاں جائے گا؟ پھر اچانک مجھے اس الماری کا خیال آیا جو ایک راہداری کے آخری سرے پر بنی ہوئی ہے۔ کبھی استعمال میں نہیں آتی۔ میں وہاں یہ دیکھنے پہنچا کہ اس الماری میں کچھ رکھا تو نہیں ہے اور الماری کو کھولتے ہی مجھے یہ بم نظر آیا"۔

"اور اب تم کہاں سے فون کررہے ہو؟"

"پروفیسر ایرکسن کے دفتر سے جو اس الماری کے نزدیک ہی واقع ہے" جواب ملا۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا" تم فون بند کرکے واپس جاؤ اور اس الماری کی حفاظت کرو، کسی کو اس کے قریب نہ آنے دینا۔ میں چند آدمی تمہارے پاس بھیج رہا ہوں"۔

جب میں ریسیور کریڈل پر رکھ کر ہٹا تو سارجنٹ موریسن کمرے میں داخل ہورہا تھا میں نے اسے فون پر ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا تو اس نے اطمینان کا

گہرا سانس لیا۔ ''ہیزل ہال گھیرے میں کیوں نہ لے لیا جائے ؟'' سارجنٹ نے تجویز پیش کی ''اس لڑکی نے وہیں سے ٹیلیفون کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لڑکی یا تو مجرموں کی ساتھی ہے یا پھر ان سے اچھی طرح واقف ہے ورنہ اسے اس بم کی موجودگی کا علم کس طرح ہوا؟ اگر یہ لڑکی کسی طرح ہمارے ہاتھ لگ جائے تو اس دہشت پسند گروہ کے باقی ارکان بھی پکڑے جاسکتے ہیں۔ ان کم بختوں نے ہماری نیند حرام کررکھی ہیں اور یونیورسٹی کا پرسکون ماحول تباہ کرکے رکھ دیا ہے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے'' میں نے کہا ''لیکن یہ کیوں بھولتے ہو کہ آج اتوار ہے اور تھانے کا بیشتر عملہ چھٹی پر ہے ظاہر ہے سات سولڑکیوں پر قابو پانا اور ان سے سوالات کرنا چند آدمیوں کے بس کا روگ نہیں ہے اور اگر ہم شہر سے مدد طلب کرتے ہیں تو مدد آنے میں بہت دیر ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ جس لڑکی نے ہمیں ہیزل ہال سے ٹیلیفون کیا تھا، وہ اس عمارت میں نہیں رہتی ہوگی اور معلوم نہیں کہ وہ اتنے بڑے کیمپس کی کس عمارت میں مقیم ہوگی، کوئی شخص بھی ہیزل ہال کی عمارت میں داخل ہوکر ٹیلی فون بوتھ سے ہمیں فون کرسکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ لڑکی یونیورسٹی کی طالبہ ہی ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ شہر سے آئی ہو۔ خیر تم نے وائرلیس سے برٹن کو ولسن ہال پہنچنے کی ہدایت کردی ہے؟''

''ہاں اس وقت ان کی گاڑی ولسن ہال سے آدھے فرلانگ کی دوری پر تھی اور اب تک وہ دونوں پہنچ چکے ہوں گے۔ برٹن آتش گیر مادوں کے بارے میں کافی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ بم وہ سنبھال لے گا۔ اصل مسئلہ بم کی تلاش کا تھا، وہ حل ہو چکا ہے''۔

''میرا خیال ہے، کہ نگران بھی آتش گیر مادے کے بارے میں کافی تجربہ رکھتا ہے۔ خیر میں پہلے اس معاملے کی اطلاع مرکزی دفتر کو دے دوں......''۔

میں نے مرکزی دفتر فون کرکے پورا معاملہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہاں سے کہا گیا ''ٹھیک ہے ہم یہاں سے چند ماہرین بھیج رہے ہیں لیکن انہیں کیمپس پہنچنے میں کافی دیر لگ جائے گی۔ اتوار کی وجہ سے بیشتر عملہ چھٹی پر ہے۔ تمہیں اس کے علاوہ اور کسی قسم کی مدد تو نہیں چاہیے؟''

کیمپس میں ہم نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ جب تک باہر کی مدد ناگزیر نہ ہو مدد طلب نہیں کی جائے۔

''نہیں'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم یہاں حالات قابو میں رکھ سکتے ہیں''۔

جیسے ہی میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ فوراً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس مرتبہ بولنے والا برٹن تھا جو ولسن ہال پہنچ چکا تھا اور وہیں سے ٹیلی فون کر رہا تھا ''میں نے ابھی ابھی بم کا معائنہ کیا ہے'' برٹن نے کہا ''آتش گیر مادے کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ اگر وہ پھٹ جائے تو پوری عمارت فضا میں اچھال سکتی ہے''۔

''کیا اب بھی ایسا کوئی امکان ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''نہیں...... نگراں نے اسے ناکارہ بنادیا ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے''۔

''پھر بھی احتیاطاً عمارت خالی کرلو، خوامخواہ خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں''۔

''عمارت میں کوئی موجود بھی تو ہو'' برٹن نے کہا ''بظاہر یہاں میرے اور نگراں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا''۔

میں نے فون بند کرکے ہیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں اور سارجنٹ کمرے سے نکلنے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے چیخی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر ٹیلی فون کے پاس پہنچا۔

وہی لڑکی بول رہی تھی جس کے پہلے فون کے بعد یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا۔ وہ غصے میں بھری ہوئی تھی ''تم لوگ اب تک کیا کررہے ہو؟ ولسن ہال خالی کیوں نہیں کراتے؟ اب صرف بارہ منٹ رہ گئے ہیں''۔

میری نظریں خود بخود کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے ایک نظر ولسن ہال پر ڈالی۔ باہر سے ایسا معلوم ہوتا

تھا کہ جیسے وِلسن ہال میں کچھ بھی نہ ہو رہا ہو۔ برٹن نے یقیناً اپنی گاڑی عمارت کے عقب میں کھڑکی کی ہوگی اور وہ عقبی دروازے سے اندر داخل ہوا ہوگا۔ ورنہ اس کی گاڑی یہاں سے ضرور نظر آتی اور یہ لڑکی مجھ سے یہ سوال ہرگز نہ کرتی ”سنو ماریا!“ میں نے ناراضی سے کہا ”تم مجھے تنگ مت کرو مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں اس وقت میں بہت مصروف ہوں“۔

”میں تمہاری ماریا نہیں ہوں“ لڑکی نے چلاتے ہوئے کہا۔”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ بارہ منٹ بعد ولسن ہال کی عمارت بم کے دھماکے سے اڑ جائے گی“۔

”واہ وا! کیا کہنے ہیں کیا میں اپنی شریر بھتیجی کی آواز بھی نہیں پہچان سکتا؟“ میں نے کہا”بس ماریا اب فون بند کردو۔ میں بہت مصروف ہوں“۔

غصے کی شدت سے لڑکی کی آواز کانپنے لگی”سنو کتے! میں تمام پولیس والوں سے نفرت کرتی ہوں۔ ان کی کھوپڑیوں میں بھیجے کی جگہ گوبر بھرا ہوتا ہے۔ میں کس طرح تمہاری کھوپڑی میں یہ بات بٹھاؤں کہ میں تمہاری بھتیجی نہیں ہوں اور مذاق نہیں کر رہی۔ بارہ منٹ بعد جب ولسن ہال تباہ ہو جائے گا تمہاری ہی عقل درست ہوگی“۔ ٹیلی فون کا رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری کوئی بھتیجی بھی ہے“ سارجنٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری کوئی بھتیجی نہیں ہے“ میں نے کہا اور کھڑکی کے پاس جا کر ہیزل ہال کی عمارت دیکھنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس لڑکی نے یہ فون بھی ہیزل ہال ہی سے کیا تھا اور کیا وہ ابھی تک اس عمارت میں موجود ہے اور دھماکے کا انتظار کر رہی ہے؟ یا وہ کسی دوسری عمارت میں چلی گئی ہے اور ولسن ہال کے داخلی دروازے پر نظریں جمائے پولیس کی آمد کی منتظر ہے؟

”چلیں؟“ سارجنٹ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا”نہیں“ میں نے جواب دیا۔”ہم یہیں انتظار کریں گے“۔”کس کا؟“۔

”پتہ نہیں، لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤں گا“۔

سارجنٹ میرے قریب آ گیا” یہ پہلا موقع ہے کہ کسی لڑکی نے ہمیں بم کی موجودگی سے مطلع کیا ہے۔ اس سے پہلے کی تمام آوازیں مردانہ تھیں“۔ اس نے میری توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی۔

”مجھے احساس ہے اور میں خود بھی اسی پہلو پر غور کر رہا ہوں“ میں نے جواب دیا اور کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا چھ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔

”وہ لڑکی تنہا تو یہ بم نہیں بنا سکتی تھی“۔

”ہاں۔ اس کے ساتھ دو چار لڑکے ضرور شامل ہوں گے“ میں نے کہا۔

”مجھے ابھی تک تو ولسن ہال سے کوئی شخص باہر نکلتا دکھائی نہیں دیا“۔ صرف دس منٹ باقی ہے۔ آخر یہ برٹن کیا کر رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے عمارت میں چند طالب علم موجود ہوں گے، جنہیں برٹن نے عقبی دروازے سے باہر نکال دیا ہوگا“۔

”آخر کس قسم کے لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں؟“ سارجنٹ نے فلسفیانہ انداز میں کہا”آخر یہ کیسے طالب علم ہوتے ہیں؟ انہیں پاگلوں کی کس قسم میں شمار کیا جائے؟“

”اس قسم کے طالب علم عموماً کم گو اور شرمیلے ہوتے ہیں۔ اتنے کم ہمت کہ گاڑی چلاتے وقت ٹریفک کے کسی معمولی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں“۔ میں نے کہا”ایسے لڑکے کھاتے پیتے گھرانوں سے آتے ہیں اور چونکہ انہیں معاش کی فکر نہیں ہوتی اس لیے اپنے ذہنوں میں زندگی کے عجیب عجیب مقصد بنا لیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑی لگن اور استقلال سے اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس قسم کی حرکتیں انہیں اپنے مقصد حیات سے قریب تر کر دیتی ہیں“۔

”لیکن وہ اس خطرے سے قبل از وقت مطلع کر

دیتے ہیں''۔ سارجنٹ نے کہا''اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی خاطر انسانوں کی ہلاکت پسند نہیں کرتے۔ ابھی ان کی نظروں میں انسانی جان کی قدر و قیمت باقی ہے''۔

''یا یوں کہہ لو کہ اس میں ان کی خوش قسمتی کو زیادہ دخل ہے کہ ان کی حرکتوں کے نتیجے میں اب تک ایک بھی انسانی جان تلف نہیں ہوئی لیکن جب کوئی مسلسل ایسے خطرناک ہتھیاروں کے کھیلتا ہے تو انسانی جان تلف ہونا لازمی ہے اور جب ایسا ہوگا تو انہیں حیرت زدہ ہونے کا حق حاصل نہیں رہے گا بلکہ انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا''۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف وہی نامعلوم لڑکی تھی''تم لوگ کچھ کرتے کیوں نہیں؟ آٹھ منٹ بعد ولسن ہال تباہ ہوجائے گا۔ تم گدھوں کی عقل میں اتنی سی بات کیوں نہیں آتی کہ عمارت فوراً خالی کرالی جائے؟''

میں نے جواب دینے سے پیشتر ولسن ہال کی طرف دیکھا۔''میں تمہارا کھیل سمجھ رہا ہوں ماریا!'' میں نے پرسکون آواز میں کہا۔

''جہنم میں جائے تمہاری ماریا'' لڑکی نے پوری قوت سے چیختے ہوئے کہا''میں ماریا نہیں ہوں''۔

''میں سب سمجھ رہا ہوں ماریا!'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔''میں خوب جانتا ہوں کہ تم پروفیسر ایرکس کا سیمینار ناکام بنانا چاہتی ہو''۔

''کیا بکواس لگا رکھی ہے؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا بک رہے ہو؟''

''سنو ماریا!'' میں نے کہا''تمہارے ڈیڈی نے مجھے سب کچھ پہلے ہی بتادیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کلاس میں تمہارے نمبر اچھے نہیں تھے اس لیے تمہیں پروفیسر کے سیمینار میں شامل ہونے سے روک دیا گیا ہے اور اب تم بم کے دھماکے کی افواہ اڑا کے سیمینار ناکام بنانا چاہتی ہو۔ تمہاری یہ انتقامی کوشش بے حد طفلانہ ہے ماریا!''۔

دوسری طرف چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا ''کیا اس وقت ولسن ہال میں سیمینار جاری ہے؟''

''ہاں اور اس میں تقریباً دو سو طلبہ شریک ہیں''۔

''دو سو طالب علم؟'' دوسری طرف پھر سکوت طاری ہوگیا۔''ہاں ماریا! پروفیسر ایرکس کے سیمینار طالب علموں میں بہت مقبول ہیں۔ اچھا اب فون بند کردو میں بہت مصروف ہوں، سمجھ گئیں۔ اگر تم نے اب مجھے پریشان کیا تو میں تمہارے ڈیڈی سے شکایت کردوں گا''۔

''سنو!'' لڑکی زور سے چیخی۔''میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ بم کہاں چھپایا گیا ہے اور اسے کس طرح ناکارہ کیا جاسکتا ہے؟''۔

میں نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھ کر سلسلہ منقطع کردیا۔ دس سیکنڈ بعد فون کی گھنٹی زور سے چیخی۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ سارجنٹ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ وہ غیر یقینی انداز میں ریسیور اٹھانے کے لیے ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

''ٹھہر جاؤ موریسن!'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل دو منٹ تک بجتی رہنے کے بعد بند ہوگئی اور کمرے پر اچانک قبرستان جیسی خاموشی طاری ہوگئی۔

دس سیکنڈ گزرے، پھر بیس سیکنڈ، پھر تیس سیکنڈ اور اچانک ایک لڑکی ولسن ہال کے مقابل کی ایک عمارت سے نکلی۔ وہ بے تحاشا ولسن ہال کی طرف بھاگ رہی تھی جیسے بم پھٹنے سے پیشتر عمارت میں جا کر اسے ناکارہ بنادینا چاہتی ہو۔ بم اس کے خیال میں صرف چھ منٹ بعد پھٹنے والا تھا۔

میں نے ایک گہرا اور پراطمینان سانس لیا''اب چلو موریسن'' میں نے سارجنٹ سے کہا'' لیکن ہتھکڑیاں لینا نہ بھولنا۔ میں لڑکیوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے ہمیشہ ہی ڈرتا رہا ہوں''۔

پُراسرار کہانی

اُچھلتی گڑوی

دُودھ والی خالی گڑوی اُچھل رہی تھی، ایک پُراسرار رات کا حیرت انگیز قصہ

غلام نبی عارف

یہ واقعہ بالکل سچا سنسنی خیز اور میرے بینک میں بھرتی ہونے کے دس سال بعد کا ہے جب میرے والدین میری شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے اور میں تن تنہا اپنے نئے کمرے میں سویا کرتا تھا، سردیوں کے دن تھے، اخبار بینی' ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے اور قسم قسم کی کتابیں رکھنے کا شروع سے شوق رہا ہے۔ ویسے تو سردیوں کی لمبی اور سرد رات میں مطالعہ کرنا اور صبح سویرے نماز کے لیے اُٹھ جانا بہت لطف دیتا ہے۔ والدہ صاحبہ ایک جست کی گڑوی (دودھ کا برتن) میں خالص دودھ رکھ جاتی تھیں اور میں عادت کے مطابق مطالعہ کے دوران دودھ پی کر گڑوی چارپائی کے ساتھ فرش پر رکھ دیتا تھا جو کہ ڈھکنے کے بغیر ہوتی ہے۔ ایک روز نیند زوروں پر تھی دودھ پی کر کوئی کتاب وغیرہ پڑھی۔ باتھ استعمال کیا، باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، بادل گرج رہے تھے سردی بہت زیادہ تھی، دروازہ بند کر کے لمبی تان کر سو گیا۔ میں عادت کے مطابق اندھیرے میں سونے کا عادی ہوں۔ روشنی اور شور میں نیند بالکل نہیں آتی۔ نہیں معلوم کیا وقت تھا کیا سماں تھا ایک عجیب سے شور میں نیند سے بیدار ہو گیا۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا کالا سیاہ اندھیرا کچھ نظر نہیں آرہا تھا آنکھوں کو ہاتھوں سے ملا۔ خوب غور کیا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دودھ والی خالی گڑوی کمرے کے فرش پر اُچھل رہی ہے اور اِدھر سے اُدھر ٹکریں مار رہی ہے۔ میرا ایک سانس اوپر ایک سانس نیچے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں اور غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک کالی سیاہ بلی کا منہ دودھ والی خالی گڑوی میں پھنسا ہوا ہے جو کہ نکل نہیں رہا اور بلی جان کے عذاب سے تڑپ تڑپ کر گڑوی منہ میں پھنسائے ٹکریں لگا رہی ہے اور اُس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔

صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد چارپائی سے نیچے اترا۔ باہر کا دروازہ کھولا، بلی برابر مشکل میں تھی آخر کار اچانک بلی کا منہ گڑوی سے آزاد ہوا اور وہ فوراً باہر کی طرف نکل کر غائب ہو گئی اور میری بھی جان میں جان آئی۔ حقیقت کچھ اس طرح آشکار ہوئی کہ رات کو ہی بلی کمرے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور گڑوی میں جو بچا کھچا دودھ رہ گیا تھا اُس کو چاٹنے کے لیے گڑوی میں منہ ڈال دیا اور منہ تو پھر منہ ہے پھنس کر رہ گیا اور بلی بے تاب ہو گئی۔ اس لیے تو کہتے ہیں کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ اُس دن کے بعد وہ کالی سیاہ بلی کچھ عرصہ تک نظر نہ آئی اور میں بھی دودھ پینے کے بعد اچھلتی گڑوی کو اُلٹا کر رکھ دیتا تھا تاکہ اس قسم کا دل ہلا دینے والا واقعہ دوبارہ نہ ہونے پائے، جس نے بھی سُنا دنگ رہ گیا۔

پُراسرار انتقام

جاوید راہی

نوری بے چینی کی حالت میں اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی میں نے محسوس کرلیا تھا کہ شمی کہیں قریب ہی ہے۔ ابا جی پکھی کے باہر پڑے سو رہے تھے اور اماں کی چارپائی میرے دوسری جانب تھی۔ میں نے کروٹ لیتے اپنی ماں کا کندھا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئی......

بہن بھائی کا قصہ، ایک ''بچے'' نے اُن کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی

میرا نام محمد بشیر ہے اور میں ذات کا اوڈھ ہوں۔ ہمارا روز اول سے خاندانی روزگار بھیڑیں پالنا اور محنت مزدوری کرنا ہے۔ ہماری عورتیں بھی ہمارے ساتھ مل کر زیر تعمیر عمارتوں میں کام کرتی آرہی ہیں۔ مگر نئی نسل نے بھیڑوں کے ساتھ ساتھ گائے کے بھی ریوڑ بنالئے ہیں اور ساتھ میں چوری اور ڈکیتی کا بھی دھندہ شروع کردیا ہے۔

پولیس مقابلے میں قتل وغارت گری بھی عام ہوکر رہ گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے میرے گھر میں کوئی بھی ایسا کام نہیں جس سے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ والد صاحب

نوری

سعودی عرب میں بطور کاریگر گئے اور کچھ ماہ بعد مجھ سے بڑے دونوں بھائیوں کو بھی اسی کمپنی میں لیبر کے ویزہ پر بلوالیا۔ پیچھے چھوٹا ہونے کے ناطہ میں گھر میں رہ گیا، مال ڈھور کو سنبھالنا میری ذمہ داری تھی۔ سب سے بڑی بہن کی شادی ہوگئی تھی۔ ایک مجھ سے بڑی بہن اور میں اپنی بھیڑوں کو دن بھر چراتے پھرتے۔ والدہ پیچھے رہ جاتی اس کے ذمہ گھر داری تھی۔

باہر سے والد روپیہ پیسہ بھجواتا تو والدہ بینک میں ڈال دیتی۔ جب بھیڑوں کے چھترے ذرا بڑے ہوجاتے تو میں بکر منڈی میں جا کر بیچ دیتا، ہم اوڈ برادری ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے کبھی اس گاؤں تو کبھی اس شہر۔ ہمارے مکان نہیں ہوتے ہم عارضی چھپر ڈال کر اس میں ہی رہتے آرہے ہیں۔ مال کیلئے بڑے بڑے باڑے اور ان کی رکھوالی کیلئے خونخوار کتے پالنا بھی ہماری ریت میں شامل ہے۔ ہمارے کتے شیروں تک کا مقابلہ کرنے میں مشہور ہیں۔

نوری اور میں بھیڑوں کا ریوڑ لے کر پرانے قبرستان کی طرف جارہے تھے میری بہن نوری نے مجھے آواز دی

"بوزو دکھائی نہیں دے رہا۔"

بوزو ہمارے کتے کا نام تھا۔ بوزو صرف بول نہیں سکتا تھا مگر ہر بات سمجھ کر باقاعدہ اس پر عمل بھی کرتا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر بوزو دکھائی نہیں دیا تو مجھے بھی پریشانی لاحق ہوگئی کہ وہ ہمارے آگے پیچھے ہی مال کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب ہم گھر سے مال لے کر چلے تھے اس وقت تو ساتھ تھا مگر اچانک کہاں غائب ہوگیا۔

قبرستان قریب آگیا تو بوزو مخالف سمت سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔

"یہ بھی اب آوارہ گردی کرنے لگا ہے" نوری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

جواباً میں اپنی بہن کی بات پر زور سے ہنس پڑا۔ ہم دونوں بہن بھائی مال کو چرنے کیلئے چھوڑ کر برگد کے بڑے درخت کی چھاؤں میں آ بیٹھے۔

"بشیر، اماں تیری شادی۔۔۔۔" میں نے بات کاٹتے اپنی بہن کا فقرہ پکڑ لیا "ہم دونوں کی شادی۔"

"ہاں ہاں اماں حاجی ابراہیم کی گھر والی سے اسی کی بات کر رہی تھی، اماں کو فکر تو ہے نا" نوری نے مجھے جواباً پھر بتایا۔

میں نے اٹھتے ہوئے مال کا رُخ جو آگے کی طرف جارہا تھا واپس موڑنے کیلئے آواز لگائی۔ ساتھ ہی بوزو اُٹھ کر بھیڑوں کی طرف بھاگا جو قبروں کے اوپر اِدھر اُدھر منہ مار رہی تھیں۔ ایک دو بار قبروں کے متولی سے ہمارا اس بات پر جھگڑا بھی ہو چکا تھا۔ بھیڑوں کو دوبارہ قبرستان کے کونے کی طرف موڑتے میں نوری کے پاس آن بیٹھا جو ہاتھ میں پکڑی ٹہنی سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

نوری مجھ سے دو سال بڑی تھی مگر ہم دونوں میں بڑی بنتی تھی۔ جب وہ اماں کے ساتھ شہر سودا سلف لینے جاتی تو میرے لئے جو بھی کپڑے خریدتی وہ اسی کی پسند کے ہوتے۔ میں اپنی بہن کی لائی ہوئی ہر چیز کو پسند کرلیتا تھا چاہے مجھے اچھی لگے یا نہ مگر اس کے سامنے میں تعریف ضرور کردیتا۔

مال چرتے ہوئے جب بیٹھنے لگ جاتا تو ہمیں پتہ چلتا کہ اب ہمیں گھنٹہ بھر آرام کا موقع مل گیا ہے۔ نوری بہن ساتھ لائی ہوئی روٹی کھولتے مجھے پانی لانے کا کہتی اور میں قبرستان کے ہینڈ پمپ سے جو متولی کی کوٹھڑی کے قریب لگا تھا سے پانی لانے اُٹھ جاتا۔

جب سے ہم سکھ پور گاؤں میں آکر آباد ہوئے تھے اپنا مال زیادہ تر اس پرانے قبرستان میں ہی لایا کرتے تھے جبکہ ہماری بستی کے دوسرے لوگ اپنا اپنا مال شہر کی طرف لے کر جاتے تھے۔ ان کے مال میں ڈنگر ڈھور بھی تھے مگر ہمارے پاس اپنے گزارے کی صرف

بھیڑیں ہی تھیں یا ان کے چھترے جو ہم عید قربان پر فروخت کرنے کیلئے پالتے تھے۔

میں جب پانی بھر کر نوری کے پاس لایا تو اس کے قریب سات آٹھ سالہ لڑکے کو بیٹھے پایا جو اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید وہ قبرستان میں فاتحہ پڑھنے والوں کے ساتھ ہو مگر دُور دُور تک کوئی بھی نظر نہ آیا تو میں نے نوری کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں اس بچے کے بارے سوال تھا۔

''بشیر! یہ اپنی ماں کی قبر پر آیا ہے گاؤں میں ہی رہتا ہے'' نوری نے میرے چہرے پر اٹھنے والے سوال کو پڑھتے مجھے بتایا۔ پھر ہم کھانے میں لگ گئے۔ نوری نے اسے بھی روٹی اور چٹنی جو روٹی کیساتھ تھی دیتے ہوئے کھانے کیلئے کہا۔

ایک دو نوالے لیتے ہی تیز مرچ کے باعث اس کی زبان جل گئی اور اس نے مجھ سے پانی مانگا۔ میں نے ڈولنی سے پانی ڈال کر دیتے اس کا نام پوچھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس لیتے بتایا کہ اس کا نام شہباز ہے سارے شوبا کہتے ہیں۔

''گاؤں میں کس جانب رہتے ہو؟'' میرے سوال پر اس نے جواب دیا مسجد والی گلی میں ہمارا گھر ہے۔ اتنا بتا کر وہ اٹھنے لگا تو نوری نے اسے روک لیا۔

''شوبی بہت تیز دھوپ ہے تھوڑی دیر رُک جاؤ ہم بھی واپسی کیلئے اٹھنے والے ہیں''۔

''نہیں، گھر والے پریشان ہو جائیں گے پہلے ہی کب کا نکلا ہوا ہوں'' کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔

''نوری! اسے ڈر نہیں لگا یوں اکیلے قبرستان آتے''۔ میں نے اسے قبرستان سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتے دیکھ کر پوچھا۔

''بچہ ہے، ابھی اسے ڈر ور کا کیا پتہ'' نوری نے پانی والی ڈولنی اور برتن باندھتے میری بات کا جواب دیا۔

دن ڈھلنے سے پیشتر ہم دونوں بہن بھائی مال ہانکتے اپنی پکھیوں کی طرف چل پڑے تھے گاؤں سے باہر خالی زمین پر ہمارا قبیلہ کئی سالوں سے رہتا آ رہا تھا اور رہائش اوڑ جانے جاتے تھے۔ اپنے مال کو باڑہ میں بند کر کے میں بھائی خلیل کی پکھی کی طرف آ گیا نوری کھانا وغیرہ بنانے کیلئے اماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

روز مرہ کی طرح ہماری پکھی کی سب سہیلیاں کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دور گپ شپ لگانے نکل جاتی تھیں۔ ہم مرد قبیلہ کے پنچ حاجی غفور کی پکھی کے سامنے اکٹھے ہو جاتے یوں رات گئے تک اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

یکدم لڑکیوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سن کر ہم سب جو حاجی غفور کی پکھی کے آس پاس پڑی چار پائیوں پر بیٹھے تھے اٹھ کر ان کی طرف بھاگے۔ سامنے آتی لڑکیوں نے نوری کو اپنے بازوں میں اٹھایا ہوا تھا اور وہ بُری طرح مچل رہی تھی بار بار وہ سر گھما کر حلق سے بچوں جیسی آوازیں نکالتی اور ''مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے'' کی تکرار کر رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے لا کر اپنی پکھی کی چارپائی پر ڈال دیا۔ حاجی غفور اور دوسرے لوگ بھی میری پکھی پر جمع تھے۔ نوری کی آنکھیں اُلٹی ہوئی تھیں اور وہ بدستور وہی فقرہ بولے جا رہی تھی کہ'' مجھے چھوڑو میں نے جانا ہے۔''

حاجی غفور کچھ پڑھنے میں معروف تھے وہ حافظ قرآن بھی تھے، پھر انہوں نے پانی کا گلاس جو انہوں نے میری اماں سے منگوایا تھا نوری پر اُلٹ دیا۔ پانچ سات منٹ بعد نوری جیسے ہوش میں آ گئی اور جلدی جلدی اپنا آپ درست کرنے لگ گئی۔ اماں گھبراتی ہوئی حاجی صاحب سے پوچھ رہی تھی کہ کیا ہوا میری بیٹی کو؟ تو انہوں نے آہستہ آواز میں بتایا کہ اسے

سایہ کی شکایت ہو گئی ہے، فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائیگا میں پانی دم کر دیتا ہوں اسے وقفہ وقفہ بعد پلاتی رہنا۔

جب سب اپنی اپنی بکھی میں چلے گئے تو میں نے نوری کی چارپائی پر بیٹھتے پوچھا نوری یہ سب کیا تھا؟

اس نے میری طرف دیکھتے بڑی نقاہت بھری آواز میں بتایا کہ "وہ لڑکا جو قبرستان میں آج ملا تھا وہ درحقیقت جنات میں سے تھا اور اس کا خاندان بھی اسی قبرستان میں رہتا ہے۔ ہم جب واپس گھر لوٹ رہی تھیں تو وہ اچانک، مجھے اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا اور پھر میرے کندھوں پر اِدھر اُدھر ٹانگیں رکھ کر سوار ہو گیا۔ میری گردن کو اس نے اپنے ہاتھوں میں اس طرح آہستگی سے، پکڑ رکھا تھا کہ مجھے تکلیف بھی نہیں ہو رہی تھی مگر میں، اپنی گردن گھما نہیں سکتی تھی جب حاجی صاحب پڑھ رہے تھے تو وہ مجھ سے یہی تکرار کر رہا تھا کہ میرے ساتھ چلو میرے گھر میں اپنے گھر والوں کو تم سے ملانا چاہتا ہوں" یہ بتا کر نوری چپ ہو گئی۔

میرے لئے یہ سب سن کر پریشان ہونا ایک لازمی بات تھی۔ میری اماں نوری کو ساتھ لگاتے اس کی چارپائی پر ساکت بیٹھی تھی۔ پوری رات تمام بکھیوں کے لوگ نوری کیلئے پریشان رہے۔

اماں نے نوری کو میرے ساتھ جانے سے روک لیا تھا اور میرے ساتھ خلیل کو بھیج دیا۔ ہم دونوں چچا زاد تھے اور ایک دوسرے کے پکے دوست بھی۔ اماں نوری کو خلیل کیساتھ اور خلیل کی بہن سمو کو میرے ساتھ بیاہنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ خلیل بھی نوری کو چاہتا تھا اور خاصا پریشان تھا میں نے جان بوجھ کر اس سے شی جن کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

شام کو ہم واپس آئے تو ہماری بکھی میں آس پڑوس کی بکھیوں کی عورتیں جمع تھیں اور نوری اپنی چارپائی پر بیٹھی سب سے بے نیاز عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھی جیسے وہ کسی کو پکڑتی اور کوئی اسے پکڑتا کبھی لیٹ کر اور کبھی بیٹھ کر اور کبھی چارپائی سے نیچے اتر کر اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیتی۔ مجھے اور خلیل کو دیکھ کر وہ بھاگتی ہوئی بکھی کے اندر چلی گئی اور پیچھے کچی چٹائی پر لیٹ کر اوپر چادر اوڑھ لی جیسے ہم سے چھپ گئی ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شی اسے دکھائی دے رہا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو سب سے دُور رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

میں نے اماں سے حاجی غفور کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کہہ رہا ہے میرے بس کی بات نہیں کسی عامل کو لانا پڑے گا۔ اماں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو اپنے ڈوپٹے سے صاف کرتے مجھے بتایا۔

نوری کی حالت کل سے بھی بُری ہو رہی تھی۔ میں چلتا ہوا حاجی غفور کی بکھی میں آ گیا اور نوری کے بارے میں جو حالات بن چکے تھے، اُن کی بابت پوچھا تو حاجی صاحب نے کہا کہ میں مسجد کے امام کے پاس گیا تھا مگر اس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ کسی ایسے عامل کے پاس جاؤ جو جنات اور بدروحوں کو اُتارنے کا ماہر ہو ہمارے بس کی بات نہیں ابھی تو پانی سر سے اوپر نہیں گیا اور اس کا سدباب ہو جائیگا یُوں یُوں دن گزرتے رہے نوری اس کے قبضہ میں آتی جائیگی۔

حاجی صاحب کے لہجہ میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

"حاجی صاحب مجھے تو پتہ نہیں کہ عالم، عامل کہاں ملے گا؟" میں نے تذبذب میں ہاتھ مسلتے اپنی بے بسی کا اظہار کیا ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میری حالت دیکھ کر حاجی غفور نے میری ڈھارس بندھائی اور مجھے شہر میں سائیں شیر علی کا پتہ بتایا کہ اس کے پاس جا کر ساری حقیقت بیان کروشائد وہ کوئی مدد کر سکے۔

وہ رات تو ہم نے یُوں تُوں کر کے کاٹی صبح میں مال خلیل کے سپرد کرتے ہوئے خود شہر جانے کیلئے ویگن سٹاپ پر آ گیا۔

- خواتین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں!
- قرآن وحدیث کی روشنی میں عورتوں کے لئے اسلامی عقائد، ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ذکر، تلاوت، وظائف اور دعا کے مفصل احکام!
- اس کے علاوہ ازدواجی زندگی، نکاح، طلاق، خُلع، عدت، غیبت، وراثت، توبہ، اخلاق، اولاد کی تعلیم وتربیت کے مسائل اور اُن کا حل
- غرضیکہ خواتین کی دینی زندگی سنوارنے کے لئے جامع اور نایاب نسخہ جو ہر مسلمان گھرانے کی ضرورت ہے۔

قیمت 175/روپے

سیارہ ڈائجسٹ 240۔ مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

سائیں شیر علی ریلوے پھاٹک کے پاس اسلام بلڈنگ میں کرایہ کی دکان میں اپنا آستانہ بنائے ہوئے تھا اور کافی سارے لوگ اِرد گرد موجود تھے۔ میں نے ان کے قریب بیٹھتے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنی بہن کیساتھ گزرنے والے حالات سے انہیں آگاہ کیا۔

انہوں نے کہا کہ ”میں تو چل پھر نہیں سکتا میں تمہیں ایک عامل کا پتہ بتاتا ہوں تم اس کے پاس چلے جاؤ پھاٹک کے دوسری طرف شہزاد دواخانہ کے قریب وہ ملے گا۔ لیاقت عرف عامل شہباز نام ہے اس کا سنا ہے وہ جادوٹونہ اور جنات اُتارنے کا دھندا کرتا ہے“

میں سائیں شیر علی خان کا شکریہ ادا کرتے عامل شہباز کو تلاش کرتا اس کی جادونگری میں پہنچ گیا۔ باہر دوکان کے چاروں جانب خوفناک شکلوں کے جنات کی تصاویر آویزاں تھیں۔ دوکان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا پہلے حصہ میں ایک نوعمر اٹھارہ سالہ عامل کرسی میز پر موجود تھا جس سے میں نے لیاقی عرف عامل شہباز کالے علم کی کاٹ، محبوب آپ کے قدموں میں، امتحان میں بغیر پڑھے کامیابی وغیرہ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے آنے کا مقصد پوچھا تو میں نے سارے حالات اس کے گوش گزارے۔ وہ اٹھ کر اندر گیا اور آکر مجھے انتظار کرنے کا کہا۔ مجھ سے چائے پینے کا پوچھا میں نے پینے کیلئے ہاں کردی تو اس نے اُٹھ کر باہر کسی کو اشارہ کیا اور اندر آکر پھر اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آگئی اور میں کپ پکڑ کر پینے لگا۔

اسی دوران اندر سے ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نکلی جس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے جس کے ہاتھ میں پکڑی کتابیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کوئی سٹوڈنٹ ہے اور بغیر پڑھائی کے لئے عامل شہباز لیاقت سے امتحان میں فسٹ کلاس نمبر لگوانے آئی تھی۔

میں نے جلدی جلدی چائے کا کپ ختم کیا اور لڑکے نے مجھے اندر جانے کا کہا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ناگواری بدبو کا احساس ہوا، میرے سامنے گاؤ تکیہ کا سہارا لئے ایک دو من وزنی پہلوان نما عامل بیٹھا تھا جس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

”آؤ بیٹا“، اس نے خمار آلود آواز میں میرا خیر مقدم کیا اور کارپٹ کے اوپر پڑی گدیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ عامل شہباز لیاقت نے میرے آنے کا مقصد پوچھا۔

میں نے سارا واقعہ پرانے قبرستان سے لیکر جو جو نوری کو پیش آیا اسے بتایا تو اس نے پچاس ہزار روپے کڑاہی کے نام پر اور آنے جانے کا خرچہ الگ مانگا۔

ٹیکسی اسٹینڈ ساتھ ہی تھا اس نے لڑکے کو بھیج کر گاڑی کے مالک کو بلوایا اور سکھ پور کا کرایہ پوچھا۔ اُس نے آنے جانے کے تین ہزار علاوہ پٹرول اور روٹی پانی مانگے۔ عامل لیاقت نے خود ہی بھاؤ تاؤ کیا اور پچیس سو روپے پر بات پکی کرلی۔

گھر سے چلتے وقت میں نے تھوڑے بہت پیسے پاس رکھ لئے تھے ان میں سے دو ہزار گاڑی والے کو دیئے اور باقی سکھ پور جا کر ادائیگی کرنے کا کہا۔

عامل شہباز آگے، میں اور لڑکا پیچھے بیٹھ گئے۔ گاڑی پٹرول پمپ پر آرکی، دو ہزار کا پٹرول ڈلوانے کے بعد عامل صاحب نے لڑکے کو اور مجھے پٹرول پمپ سے کھانے پینے کی اشیاء لانے بھیج دیا۔ میرا سات آٹھ سو روپے کا خرچہ ہوا۔ پتہ نہیں اس کے جسم سے اتنی ناگوار بدبو کیوں اُٹھ رہی تھی۔ کھانے پینے کے بعد وہ خراٹے لینے لگا۔ اگر گاڑی کے اندر اے سی آن نہ ہوتا تو میں اس گندی بدبو جو عامل کے بھینسے نما جسم سے اُٹھ رہی تھی سے نجات پانے کیلئے گاڑی کا شیشہ نیچے کر دیتا۔

سکھ پور آتے نیم تاریکی پھیل چکی تھی اور ہم اپنی پکھیوں میں پہنچ گئے۔ اماں نے مجھے بتایا کہ نوری دن بھر اسی عالم میں رہی ہے اب تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی آنکھ لگی ہے۔ گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کروا کر میں نے خلیل کو چارپائی لانے کا کہا اور اماں کو چائے بنانے کا کہہ دیا۔

عامل لیاقت نے سب موجود لوگوں کو ہماری پکھی سے دُور ہٹا دیا اور ساتھ ہی بکس سے ایک بڑی سی چادر جس پر خوفناک تصویر بنی ہوئی تھی جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ شہنشاہ جنات کی تصویر ہے جو میں حاضر کرونگا اور اس کے ذریعہ سے نوری پر عاشق جن کو قابو کر کے ساتھ لے جاؤں گا تاکہ وہ پھر کبھی نوری کو تنگ نہ کرے۔ کچھ ایسا ہی الٹر پڑ اور بھی سامان تھا جو اس نے ہماری پکھی کے چاروں جانب پھیلا دیا اور خود اپنے جسم پر سیاہ رنگ کا ریشمی لبادہ پہن لیا۔

اس کیساتھ آیا لڑکا پکھی کے باہر چٹائی پر بیٹھ گیا اور کوئی عمل پڑھنے لگا جبکہ عامل شہباز لیاقت ہمیں پکھی سے دور رہنے کی تلقین کرتا میری پکھی کے اندر داخل ہو گیا اور اکٹھا کیا ہوا پردہ اس نے کھول کر پکھی کا داخلی حصہ کور کر دیا۔ نوری اُٹھ بیٹھی تھی اور سہمی نظروں سے عامل شہباز لیاقت کی جانب دیکھ رہی تھی۔

میں نے اپنی بہن کو تسلی دیتے کہا کہ ''یہ بہت بڑے عامل ہیں یہ اس جن کو پکڑنے آئے ہیں''۔

''بشیر، تم یہ سب کیوں کر رہے ہو وہ مجھے کچھ نہیں کہتا وہ تو سارا دن میرے ساتھ ہنستا کھیلتا پھرتا ہے مجھے آپی کہہ کر مخاطب کرتا ہے خود ہی چلا جائیگا۔ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی''۔ اس سے پہلے کہ میں بولتا عامل شہباز نے تو نے نوری کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔

''بد بخت چکمہ دیتے ہو میں بندوبست کرتا ہوں تمہارا'' نوری کو یہ توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا وہ مارے ڈر کے سہم گئی۔

''بشیر تم کڑاہی کی رقم کا بندوبست کرو میں اس بد بخت کو قابو کرتا ہوں'' اس نے ساتھ لائی مٹی کی ہنڈیا کا ڈھکن اُتارتے ہنڈیا زمین پر رکھتے جیب سے بڑا سارا چاقو نکالتے اسے کھولا۔

''اور ہاں تم پکھی سے دو سو قدم دور رہو گے اور جو حصار میں نے کھینچا ہے اس کے اندر کوئی نہ آنے پائے تمہیں سختی سے ہدایت ہے ورنہ اگر کسی کا نقصان ہو گیا تو وہ خود ذمہ دار ہوگا''۔

جی بہتر۔ میں نے اپنی بہن کی طرف دیکھتے کہا اور پکھی سے باہر آ گیا۔

باہر وہ لڑکا اوٹ پٹانگ کچھ اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا سارے قبیلہ کے لوگ ایک جگہ بیٹھے نوری کیلئے دُعائیں مانگ رہے تھے پکھی کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ میرے سمیت ہر کسی کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا کہ دیکھیں اب کیا ہو؟

یکدم میری پکھی سے نوری کے گالی گلوچ اور مار پیٹ کی آوازیں آنے لگیں ہم سب نے سمجھا کہ اندر عامل شہباز لیاقت جنات کیساتھ ہاتھا پائی کر رہا ہے۔ اسی اثنا میں نوری درختوں سے لکڑیاں کاٹنے والا کاپا لہراتی عامل شہباز کے پیچھے بھاگتی پکھی سے باہر نکلی۔ عامل کی شلوار پیروں میں تھی اور وہ چیخ و پکار کر رہا تھا۔

نوری نے بتایا کہ ''یہ مجھ سے بدتمیزی کرنے لگا تھا یہ کوئی عامل وامل نہیں یہ تو کوئی بدکار مسٹنڈا ہے'' اُس کے منہ سے یہ سب کچھ سن کر ہم سب قبیلہ والوں نے دونوں استاد شاگرد کو جوتوں پر رکھ لیا۔ حاجی غفور نے بڑی مشکل سے ہم سب پر قابو پایا اور وہ اپنا سارا جادو ٹونہ چھوڑ کر گاڑی میں نو دو گیارہ ہو گئے۔

نوری نے مجھے بتایا کہ ''بشیر، اس بچے سے مجھے کوئی خطرہ نہیں جتنا تم اس کے پیچھے پڑو گے وہ مجھے تنگ کرے گا''۔

میں اپنی بہن کی بات پر رضا مند ہو گیا اور زندگی آہستہ آہستہ پرانی ڈگر پر چل پڑی۔

اب نوری دوبارہ میرے ساتھ مال لے کر جانے لگ گئی تھی۔ قبیلہ کی دوسری لڑکیاں جو نوری کی ہم عمر تھیں اس سے۔ ملنے سے کتراتی تھیں۔ میرا دھیان اپنی بہن پر رہتا، مجھے، پتہ چل جاتا تھا جب شمی ہمارے درمیان آجاتا اکثر اوقات وہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا تھا کبھی کسی جانور کی شکل کبھی بڑے سے سانپ کی شکل ہاں نوری ان سب کو پہچان لیتی تھی۔ میں اس دوران نوری سے دور جا کر مال کی نگرانی میں لگ جاتا۔

نوری اور شمی کے معاملے کو دوسرا سال جا رہا تھا میرے والد اور بھائی اس صورت حال سے خاصے پریشان تھے مگر میری اماں اور میں انہیں مطمئن کر دیتے کہ نوری کی جان کو کوئی خطرہ وغیرہ نہیں وہ جنات کا چھوٹا سا بچہ ہے اور نوری کو آپی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ہماری باتوں کے باوجود میرے والد مطمئن نہیں ہو پاتے تھے۔

اب یہ ہونے لگا تھا کہ نوری راتوں کو بکھی سے نکل کر قریبی کھیتوں کی طرف چلی جاتی اور گھنٹوں شمی کے ساتھ گھومتی پھرتی۔۔ ہم ماں بیٹا بھی اس بات کے عادی ہو چکے تھے۔ جب بھی نوری کے پاس شمی آتا تو میری اماں کو اماں اور مجھے، بشیر بھائی کہہ کر مخاطب کرتا نوری کی آواز اس وقت۔ بچے کی آواز میں بدل جاتی تھی اور وہ اسی لب ولہجہ میں ہم سے باتیں کرتی رہتی۔ نوری نے بتایا کہ شمی سے چھوٹا اس کا بھائی شاہ زیب بھی ہے کل رات کو اسے بھی ساتھ لایا تھا وہ بھی مجھ سے بڑے پیار سے ملا اور ہم تینوں کھیلتے رہے تھے۔

اب یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ نوری مجھے مال کے پاس چھوڑ کر قبرستان کے آخری حصہ کی جانب چلی جاتی جہاں پہاڑی کیکروں کے گنجان جھنڈ تھے۔ نوری کی زبانی پتہ چلا کہ شمی اور اس کے گھر والے اس گنجان جھنڈ میں رہتے تھے اور وہ اس کے سارے گھر والوں کو مل چکی تھی۔ اس نے مجھے یہاں تک بتایا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح زندگی بسر کرتے ہیں وہ باقاعدہ انسانوں میں رہ کر کام دھندہ کر کے اپنی روزی کماتے ہیں نماز قرآن کی پابندی کرتے اور سب انسان دوست ہیں۔

میں نے نوری سے اظہار کیا کہ وہ شاہ زیب کو میرا دوست بنا دے مگر اس نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کروا دیا کہ ”شمی تم سے سخت ناراض ہے جو تم اس بدمعاش پاکھنڈی موٹے بھینسے کو لے آئے تھے جس نے مجھے بے آبرو کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ شمی اور شاہ زیب جا چکے تھے اگر ان کی موجودگی میں آجاتا تو دونوں نے اسے جان سے مار دینا تھا۔“

جب سے نوری جنات میں رہ رہی تھی اس میں دن بہ دن بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ کھانا کم کھاتی تھی سوتی بھی بہت کم تھی الگ تھلگ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ پہلے ہم بہن بھائی جب مال نکالتے تھے تو وہ چلتے چلتے دنیا جہان کی باتیں کرتی جاتی مگر اب وہ خاموشی سے آگے چلتی رہتی۔ پہلے پہلے بوزو شمی پر بھونکتا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بھی ان کا عادی ہو گیا نہ ان کے آنے کا کوئی نوٹس لیتا نہ جانے کا۔

میرے والد اور بھائی دو ماہ کی چھٹی پر آئے ہوئے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ نوری کی اور میری شادی کر کے جائیں مگر ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ نوری کی بات چلائیں۔ نوری پر شمی کا دھبہ پڑا ہوا تھا کہ میں نے ہمت کر کے شمی کو مخاطب کیا۔

”ہاں بولو بھائی“ اس نے اپنی آواز میں جواب دیا۔

”ابو نوری کی اور میری شادی کرنا چاہتے ہیں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“۔ جواباً اس نے خاموشی اختیار کر لی اور تھوڑی دیر بعد نوری کو چھوڑ کر چلا گیا۔

نوری جب ہوش میں آتی تھی تو اسے بالکل بھی یاد

نہیں رہتا تھا کہ شمی سے کیا باتیں ہوئیں یا کیا چلتا رہا۔

میرے والد صاحب نے نوری پر سختی کر دی تھی کہ خبردار جو رات کو اُٹھ کر اکیلی باہر گئی، اپنی اماں کو ساتھ لے کر جایا کرو۔ نوری حاجی صاحب سے بہت ڈرتی تھی۔۔

''جی اباجی''۔۔

نوری بے چینی کی حالت میں اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ شمی کہیں قریب ہی ہے۔ اباجی بیٹھک کے باہر پڑے سو رہے تھے اور اماں کی چارپائی میرے دوسری جانب تھی میں نے کروٹ لیتے اپنی ماں کا کندھا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ نوری باہر جانا چاہتی ہے۔ اماں نے نوری کی جانب دیکھا جو اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اماں سر ہلاتی اُٹھی اور دونوں ماں بیٹی بیٹھک سے باہر نکل گئیں۔

میں اپنی بہن کی زندگی میں اٹھنے والی اس صورتحال کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے لئے سوچتا رہا۔کافی دیر ہو گئی تھی انہیں گئے ہوئے ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ جب سے نوری کی شادی کے بارے میں میں نے شمی سے بات کی تھی اس کے آنے کی روٹین ذرا کم کم ہو گئی تھی ۔آج بھی وہ تین دن کے بعد آیا تھا ۔نوری اس کے نہ آنے پر کافی پریشان تھی کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گیا ۔اماں اور نوری واپس بیٹھک میں آئیں تو اماں کے پاس کپڑے میں کچھ تھا۔میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شمی اور اس کے ماں باپ آئے تھے اور جاتے ہوئے یہ دے گئے ہیں۔ اماں نے کپڑے میں بندھے چاندی کے زیورات میرے سامنے رکھتے بتایا۔وہ زیورات پرانے تھے مگر دیکھنے میں اچھے نظر آئے ۔ یہ شمی نے نوری کی شادی کیلئے دیئے ہیں۔شمی کی والدہ بتا رہی تھی کہ وہ زیورات اس کے ہیں اور اپنی بیٹی نوری کو اپنی خوشی سے دے رہی ہے۔

''اماں سن رکھا ہے کہ جنات جو کچھ دیتے ہیں بعد میں غائب ہو جاتا ہے''میں نے سنی سنائی بات دہرائی تو نوری بیچ میں بول اٹھی۔

''بشیر! وہ میرے ماں باپ کی جگہ ہیں بہت پیار کرتے ہیں۔تم نے شمی سے میری شادی کی بات کی تھی تو اس نے واپس جا کر اپنے گھر والوں کو بتایا تھا یہ جو اس کے آنے میں کئی دن لگ گئے وہ یہاں سے کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے'' بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔

ہمارے لوگ سونا بہت کم استعمال کرتے ہیں زیادہ تر ہماری شادیوں پر ہماری عورتیں اور لڑکیاں چاندی کے ہی بھاری بھر کم زیورات پہنتی ہیں ۔ جو دھڑکا میرے دل کو لگا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا کہ شمی نوری کی شادی میں روڑے نہ اٹکائے۔ میرے سر پر سے بوجھ اُتر گیا تھا۔ دو چار روز بعد نوری کا خلیل سے اور میرا خلیل کی بہن روشنی سے رشتہ پکا ہو گیا اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

جوں جوں شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی ہم بہن بھائی جہاں اپنی اپنی شادی کیلئے خوش تھے وہاں خلیل کی طرف سے بھی پریشان ہو رہے تھے جس نے دبی زبان میں اپنی برادری کے لوگوں کو نوری پر جن عاشق کا بھی شوشہ چھوڑا ہوا تھا جبکہ شمی نوری کو آپی کہہ کر پکارتا تھا۔ میں اور اماں شمی کے والدین کی طرف سے دیئے گئے گہنے جو خاصے سال خوردہ تھے کو لیکر سنار کے پاس آئے کہ ان کو دھو دے مگر سنار وہ خریدنے پر بضد تھا کہ میں ان کے بدلے جدید انداز کے زیورات آپ کو دوگنے وزن میں دے دیتا ہوں آپ انہیں مجھے دے دیں کیونکہ مجھے پرانی چیزیں اکٹھی کرنیکا شوق ہے مگر ہم نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور آخر کار اس نے ہمارے سامنے ان زیورات کو مختلف محلول میں ڈبو کر نکالا تو ان کے نکھار میں چمک آ گئی۔ زیورات

لے کر ہم ماں بیٹا دوسری خریداری میں لگ گئے۔

آخر کار نوری خلیل کی بیوی بن گئی اور روشنی میری۔ وہ بارات لیکر ہماری پکھی میں آئے اور دوسرے روز میری بارات ان کی پکھی میں گئی۔ خوب خوشی منائی جارہی تھی نوری کی شادی میں شمی سمیت اس کے گھر والوں نے بھی شرکت کی اور دعوت میں ہمارے ساتھ شریک رہے۔

نوری خلیل کے ساتھ بہت خوش تھی۔ جو مال پہلے روشنی اور خلیل لے کر جاتے تھے اب روشنی کی جگہ نوری اور میرے ساتھ روشنی تھی۔ روشنی کے آجانے پر میری پکھی کے طور طریقے بدل گئے تھے نوری کا میل سب سے الگ تھا جبکہ روشنی کی عادتیں مختلف تھیں۔ جب سے شادی ہوئی میری سات بھیڑیں معمولی اونچ نیچ کی بنا پر ذبح ہو چکی تھیں۔ کبھی اپھارہ ہو گیا کبھی چارہ لڑ گیا کبھی منہ خور ہو گیا میرے والد اس صورتحال سے بہت دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ ان کا دھیان شمی کی طرف تھا کہ یہ سب کچھ جنات کی کارستانیاں ہیں مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا لیکن اندر سے میں بھی پریشان تھا کہ یہ سارا کچھ صرف میرے مال کیساتھ کیوں؟ دوسرے لوگوں کے بھی تو سینکڑوں بھیڑ چھترے تھے۔

گاؤں کے مولوی صاحب سے دم جھاڑا بھی کروایا حاجی غفور صاحب سے بھی تعویز لے کر بھیڑوں کے گلے میں ڈالے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ روشنی کا پیر بھاری نکلا وغیرہ وغیرہ۔ جتنے منہ اتنی باتیں مگر میں کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ حاجی صاحب کے جانے کا وقت ہو گیا وہ مجھے کئی ہدایتیں دیتے واپس چلے گئے۔

اب میں اور روشنی اپنے مال کو سنبھالنے میں لگ گئے تھے۔ خلیل نوری کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا وہ اگر رات کو اٹھ کر پکھی سے نکل جاتی تو وہ بیٹھ کر انتظار کرتا رہتا مگر اس کے پیچھے ہرگز نہیں جاتا تھا۔ شمی نے دو چار بار خلیل سے بات بھی کی تھی جس کی وجہ سے اس کا ڈر قدرے کم ہو گیا تھا پھر ان کی خانگی زندگی میں شمی کی کوئی مداخلت نہیں تھی۔

رہنے سہنے کا ڈھب قدرے بدلتا جارہا تھا۔ ہوس زر نے دونوں کو اپنا غلام بنا ڈالا تھا۔ پے در پے بھیڑ چھترے قصابوں کے پاس بکنے لگے تھے۔ میں نے دبی زبان میں اس بات کا تذکرہ روشنی سے کیا تو اس نے یہ کہہ کر مجھے چپ کروا دیا کہ "بشیر تم نوری اور خلیل کو ان کے حال پر چھوڑ دو خلیل اپنی مرضی کا مالک ہے گھر پر اس کا ہی کنٹرول ہے ابا اماں اور دوسرے گھر کے لوگ اس کے [illegible] میں بالکل بھی دخل نہیں دیتے" روشنی نے مجھے سمجھایا۔ میں نے روشنی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

خلیل اور نوری نے اپنی پکھی ذرا دور ہٹ کر بنالی تھی۔ گو کہ وہ قبیلہ میں ہی تھے مگر سب سے الگ تھلگ ویسے بھی نوری پہ جن کی وجہ سے سبھی ملنے جلنے سے کتراتے تھے۔

شمی کو نوری اور خلیل نے اپنے اشاروں پر چلانا شروع کر دیا تھا وہ دونوں اس سے سودا سلف منگوانے لگے تھے۔ پہلے پہل تو اسے پیسے دیکر بھیجتے پھر پیسوں کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب جو بھی کھانے پینے کی چیز مانگتے شمی پل بھر میں لا حاضر کرتا۔ شمی نے دونوں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ جب بھی شاہ زیب میرے ہمراہ آئے تو تم لوگ کوئی بھی ایسی بات یا فرمائش نہیں کرنا میرے والدین اس بات پر سخت ناراض ہونگے۔ وہ صوم و الصلوۃ کے پابند ہیں اور ان کو یہ بات ناگوار لگے گی۔

دونوں نے مجھے جب بات بتائی تو میں نے نوری کو منع کر دیا کہ وہ تمہیں بہن کی طرح پیار کرتا ہے اور پھر وہ مافوق الفطرت مخلوق ہونے کے ناطے کبھی ناراض ہو گیا تو تمہیں نقصان پہنچائے گا جیسا کہ مجھے پہنچا رہا ہے میرا مال پراسرار بیماری کا شکار ہے۔

"ارے نہیں بشیر، وہ بھلا بچہ تمہارے مال کو کیوں نقصان کریگا؟" نوری نے میرے وسوسے کو مسترد

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوۂ یار کا بے نقاب مشاہدہ کرکے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منبع رشد و ہدایت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست کسب فیض کیا۔
- جنہوں نے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے۔
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چمنستان اسلام کی آبیاری کی۔
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرۂ انسانیت کی سیاہیاں دھو ڈالیں۔
- جنہوں نے انتھک مخلصانہ جدوجہد سے جنت نظیر معاشرہ کی صورت گری کی۔
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالحانہ ٹکر لے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

شائع ہو گیا ہے

کرتے شمی کی طرفداری کی۔
خدا کرے، ایسا ہی ہو میں نے خاموشی اختیار کر لی کہ جو بھی ہو اس سے سمجھوتہ تو کرنا پڑیگا۔
خلیل کے، ٹھاٹھ باٹھ بدل رہے تھے نوری بھی اس کے ساتھ شامل تھی اور اس نے دبی زبان میں یہ اظہار کر دیا تھا کہ بہت مال کی خدمت کر دیکھی اب ہم سکھ پور سے نقل مکانی کر کے شہر جانا چاہتے ہیں خلیل اب کوئی اور کام کریگا۔ اب نوری اپنے گھر والی تھی میں اس پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتا تھا اس لئے میں نے چپ سادھ لی کہ جو مرضی آئے کرو۔
خلیل تھوڑا بہت راج گیری کا کام جانتا تھا دونوں میاں بیوی سکھ پور سے شہر منتقل ہو گئے۔ کوئی بڑی عمارت بن رہی تھی دونوں کو کام مل گیا۔ نوری مزدوری کا اور خلیل کو مستریوں کا۔
اسی عمارت میں انہوں نے مالک سے پوچھ کر رہائش اختیار کر لی۔ انہیں سکھ پور سے گئے تین ماہ سے اوپر ہو گئے تھے میں کبھی کبھار ان کو جا کر مل آتا تھا کئی بار میں نے خلیل کو واپسی کا کہا مگر وہ دونوں میری بات نہ مانے اور میں مایوس ہو گیا۔ خلیل اور نوری شمی سے ایسے کام لینے لگے تھے جس میں خلیل کی چالاکی شامل تھی وہ خود کو بڑا عامل تصور کرنے لگا تھا۔ سب سے پہلے بلڈنگ مالک حاجی نور احمد کو اس نے قائل کیا پھر یہ سلسلہ اس کے دوستوں رشتہ داروں تک پھیل گیا۔
شمی ان کے سامنے، جو بھی کوئی ہوتا مختلف چیزیں ادھر اُدھر کرتا تا کہ ان کو یقین آ جائے کہ خلیل کے ہاتھ میں جنات ہیں اور وہ ان سے کام لے سکتا ہے۔ کم عقیدہ کے لوگ تو دونوں میاں بیوی کی ہر بات من وعن تسلیم کر لیتے تھے اگر کوئی بیمار ہوتا تو اس سے یہ کہا جاتا کہ تم پر کالے جادو کا وار کیا گیا ہے یہ ختم کرنے کیلئے جنات کو حاضر کرنا پڑے گا وہ اس کا توڑ کریں گے ان کو بلوانے کیلئے کچھ چیزیں درکار ہونگی اس پر یہ خرچ آئے گا۔
شمی کو بلایا جاتا اور طرح طرح کے ہتھکنڈے دکھا کر سائل کو قابو کیا جاتا تھا۔ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی چل رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی دھڑا دھڑ چاندی سمیٹ رہے تھے۔ جب لوگوں کے سامنے شمی کو بلایا جاتا تو خلیل اسے گالی گلوچ کرتا تا کہ وہاں موجود کام کروانے والوں پر اس کی دھاک جمے۔ نوری نے بھی وہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔
ایک دن شمی کو حاضر کرنے کیلئے آوازیں دیں تو وہ شاید کہیں دُور تھا یا ویسے ہی وہ جان بوجھ کر سنی اَن سُنی کر رہا تھا۔ جب وہ نوری کے پاس آیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ شمی نے غصہ سے خلیل کو دھکا دیا جو اس سے بدتمیزی کر رہا تھا اور واپس چلا گیا۔
کئی دن تک شمی واپس نہ آیا دونوں کو تشویش ہوئی اور دونوں پریشان ہو گئے نوری دن رات شمی کو واپس بلانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ نہ آیا۔ اگر کوئی کام کے سلسلہ میں آتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔
اب ان کی توجہ صرف بلڈنگ میں کام کی طرف تھی جب شمی کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ نوری کو ملنے آ گیا دونوں بلڈنگ کی چوتھی منزل پر سامنے کی طرف لگے بڑے بڑے لکڑی کے پھٹوں پر کام کر رہے تھے۔ خلیل کو اس کی آمد کا پتہ چل گیا تھا اس نے پھنکار کر اسے ڈانٹا کہ کہاں گئے تھے اتنے دن۔ نوری نے مداخلت کی تو اسے بھی اس نے جھڑک دیا۔
یکدم خلیل ہوا میں اچھلا اور بیچ سڑک پر گرتے تربوز کی طرح بکھر گیا۔ نوری سکتے کی حالت میں اوپر کھڑی اس کی لاش کے گرد ہجوم کو دیکھ رہی تھی۔ نوری کے مطابق شمی کوئی بات کئے بغیر چلا گیا تھا۔ ہمیں پتہ چلا تو ڈیرہ کے دوسرے لوگوں سے مل کر ہم اس کی لاش اور نوری کو لے کر واپس سکھ پور آ گئے۔
نوری آج بھی شمی کو یاد کر کے دُکھی ہو جاتی ہے اسے اُمید ہے کہ ایک دن شمی اچانک آ کر کہے گا۔
''آپی کیا حال ہے؟''۔

”وفاداری“

جاوید احمد صدیقی

پھر مجھے آواز آئی، ”ہیلو مسٹر فاروقی!! گڈ مارننگ“ اس آواز میں کوئی چیز محسوس کرکے میں نے فوراً پلٹا کھایا اور چیئرمین صاحبہ کو دیکھا، آمنا سامنا ہوتے ہی ہم دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اور ہم دونوں بیک وقت بولے ”ارے تم، ارے تم!!“ میں تو دم بخود یک ٹک شیبا کے چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔

دو دلوں کا ماجرا، وہ ایک دوسرے کیلئے بنے تھے مگر حالات نے اُنھیں جدا کردیا تھا

آج بھی عرصہ کے بعد پیاری باجی کا ڈانٹ بھرا فون آیا۔ وہی رٹ کہ تم ابھی تک اکیلے ہو۔ میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ اُداسی‘ جدائی اور غمگین راتوں کی کٹھن ترین لمحات کو گزارنا میرے لیے عذاب سے کم نہ تھا اور نہ ہی ہے۔ اب تو عمر بھی آگے اور آگے چلتی جارہی ہے۔ وہ پرانی باتیں بھی تو اب یاد آتی ہیں اور ایک ایک لمحہ شیبا کے ساتھ گزرا ہوا، تیر بن کر دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ باجی کی ڈانٹ ڈپٹ

نے مجھے ایک بار پھر ماضی کی تلخ و خوشگوار یادوں کی طرف دھکیل دیا ہے۔

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ گھر میں خوب ہنگامہ رہا کرتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انجینئرنگ کرنے کے بعد ابو نے مجھے آگے پڑھائی کے لیے اپنے جگری اور پرانے دوست نواز صاحب کے پاس سنگاپور بھیج دیا۔ نواز صاحب کوئی بیس پچیس سال قبل وہاں پہنچے تھے اور کاروبار کو جمالیا تھا۔ اب وہ بڑے مقامی کاروباری لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ جن دنوں میں، میں وہاں پہنچا ان کی فیملی یورپ کی سیر کے لیے جا چکی تھی۔ نواز صاحب اور ان کے ایک کزن ہی تھے گھر میں۔ خیر میں نے داخلہ ہونے کے بعد پڑھائی میں دل لگا لیا۔ کوٹھی کی انیکسی پر میرا قبضہ تھا اور خوب آرام سے پڑھائی ہو رہی تھی۔ تین چار ہفتوں کے بعد فیملی بھی آگئی۔ نواز صاحب کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ چاروں ہی خوب پڑھ چکے تھے۔ ایک بیٹا انجینئر تھا اور دوسرا ڈاکٹر، جبکہ بیٹیوں میں بھی ڈاکٹر اور دوسری ایم بی اے تھی۔ وہ اپنے کاروبار کے علاوہ، کلینک چلاتے تھے اور فیکٹری کے ایچ آر اور اکاؤنٹس کی بھی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ہماری سب کی آپس میں اتنی بے تکلفی نہ تھی مگر پھر بھی خوب چھنتی تھی۔ میرا پی ایچ ڈی کا آخری سال تھا، شیبا جس نے ایم بی اے کر رکھا تھا، وہ میرے ساتھ وقت تو گزارتی تھی مگر ذرا لیے دیئے رہنے والی شخصیت تھی۔ پھر ذرا بے تکلفی ہوئی تو اکثر ہم مختلف مقامات پر سیر کے لیے نکل جایا کرتے تھے اور یہ جذبہ محبت ایک دوسرے کے لیے بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم مختلف پارکوں اور کلبوں میں بیٹھے گھنٹے باتیں کرتے رہتے، ایسا لگتا کہ جیسے راتیں مدہوش ہو چکی ہیں۔ ہم دونوں دیر تک جگمگاتی ہوئی چاندنی راتوں کے حسین سایوں میں بیٹھے رنگین سپنوں کے جال بُنا کرتے اور ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ جیسے ہماری باتوں کے ساتھ گرد و پیش کی چیزیں بھی اسی طرح تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ پھر خیالات کی سرسبز و شاداب راہوں پر پرواز کرتے کرتے اجنبی جزیروں پر اُتر جاتے۔ الف لیلیٰ کے کرداروں کی طرح، نفاست بھرے بازاروں میں گھومتے اور سجی سجائی دکانیں بھی خوب نظارہ دیتیں۔ اور اب احساس ہوتا ہے کہ وہ اتنے سارے وعدے وعہد جو کیے تھے وہ کیا ہوئے؟ لمبے لمبے پروگرام جو ہر روز مرتب ہوتے تھے اب کیسے پورے ہوں گے۔ ویسے یہ یادوں کی راہ گزر بھی کتنی عجیب ہوتی ہے، ہر وقت دھند چھائی رہتی ہے اور جب کبھی اتفاقیہ یہ دھند چھٹ جائے تو ہم ذہن کی چور کھڑکی سے ان یادوں کو تکتے ہی رہ جاتے ہیں اور پھر وہی حالت جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ سوچ کی لہروں پر چلتے چلتے لگتا ہے کہ ابھی کوئی آواز دیگا اور میں پلٹ کر جواب دونگا مگر سوائے ایک گہری خاموشی اور اُداسی کے وہاں کیا ہوتا ہے۔

اور پھر میں بہت سی اُمیدیں لیے واپس گھر آ گیا۔ ابو اور امی نے زور لگا لیا کہ شادی کے بندھن میں بندھ جاؤ۔ خاندان میں ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی ہے۔ مگر میرے ذہن کی سوئی وہیں اٹک گئی تھی۔ واپس آتے ہوئے نواز صاحب سے بات کی تو انھوں نے مجھے جواب دیا تھا کہ بھئی تم اتنے نزدیک ہی کیوں آئے کہ بعد میں افسوس ہو۔ شیبا کی کہیں بھی اور شادی ہو سکتی ہے کیوں کہ اسے ہم اپنے سے اور اس شہر سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتے اور نہ کریں گے۔ شیبا بھی کچھ کچھ بدلی بدلی سی لگی جس سے مجھے تو صدمہ کا گہرا جھٹکا لگا تھا!!

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ میں نے پہلے نوکری کی اور ترقی و تجربہ حاصل کرتے ہوئے آخر کار اپنی کمپنی بنا ڈالی۔ اپنی ناکامی اور تنہائی کے تمام دروازے کام کی ترقی پر کھول دیئے۔ اب تو گھر والے بھی بھول گئے کہ میری شادی بھی ہوسکتی ہے یا نہیں!!

ان دنوں میں اپنی کمپنی کی بہت بڑی برانچ سنگا پور میں کھولنے گیا ہوا تھا۔ کئی ماہ گزر گئے اور تمام سیٹ اپ بہترین بن گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصہ گزار لوں۔ دل کے اندر، شیبا کے ساتھ گزرے دنوں کی یادیں بھی تو شدت سے لوٹ آئی تھیں اور میں نے غیر ارادی طور پر ان جگہوں پر جانا شروع کر دیا تھا جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ کبھی کبھی سوچتا تھا

آپ کیا جمع کر رہے ہیں؟

ایک دن بادشاہ نے اپنے تین وزراء کو دربار میں بلایا اور تینوں کو حکم دیا کہ تینوں ایک ایک تھیلا لے کر باغ میں داخل ہوں۔ اور وہاں سے بادشاہ کے لیے مختلف اچھے اچھے پھل جمع کریں۔ وزراء بادشاہ کے اس عجیب حکم پر حیران رہ گئے اور تینوں ایک ایک تھیلا پکڑ کر الگ الگ باغ میں داخل ہوگئے۔ پہلے وزیر نے کوشش کی کہ بادشاہ کے لیے اسکی پسند کے مزیدار اور تازہ پھل جمع کرے اور اس نے کافی محنت کے بعد بہترین اور تازہ پھلوں سے تھیلا بھر لیا۔ دوسرے وزیر نے خیال کیا کہ بادشاہ ایک ایک پھل کا خود تو جائزہ نہیں لے گا کہ کیسا ہے اور نہ ہی پھلوں میں فرق دیکھے گا۔ اس لیے اس نے بغیر فرق دیکھے جلدی جلدی ہر قسم کے تازہ اور کچے اور گلے سڑے پھلوں سے اپنا تھیلا بھر لیا۔ اور تیسرے وزیر نے سوچا کہ بادشاہ کی توجہ صرف تھیلے کے بھرنے پر ہوگی۔ اس کے اندر کیا ہے، اسے بادشاہ نہیں دیکھے گا۔ یہی سوچ کر وزیر تھیلے میں گھاس پھوس اور پتے بھر لیے اور محنت سے بچ گیا اور وقت بچایا۔ دوسرے دن بادشاہ تینوں وزراء کو اپنے تھیلوں سمیت دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب تینوں دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے تھیلے کھول کر بھی نہ دیکھے اور حکم دیا کہ تینوں کو ان کے تھیلوں سمیت 1 ماہ کے لیے دور دراز جیل میں قید کر دو۔ اب اس دور دراز جیل میں تینوں کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں تھا، سوائے؟ اس تھیلے کے جو انھوں نے جمع کیا تھا۔ اب پہلا وزیر جس نے اچھے اچھے پھل چن کر جمع کیے تھے، وہ مزے سے اپنے انہیں پھلوں پر گزارہ کرتا رہا۔ یہاں تک کے 1 ماہ با آسانی گزر گیا۔ اور دوسرا وزیر جس نے بغیر دیکھے تازہ خراب تمام پھل جمع کیے تھے۔ اس کے لیے بڑی مشکل پیش آئی کچھ دن تو تازہ پھل کھا لیے لیکن پھر کچے اور گلے سڑے پھل کھانے پڑے، جس سے وہ بہت زیادہ بیمار ہوگیا اور اسے بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اور تیسرا وزیر جس نے اپنے تھیلے میں صرف گھاس پھوس ہی جمع کیا تھا۔ وہ کچھ دن بعد ہی بھوک سے مرگیا کیونکہ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔

اب آپ اپنے آپ سے پوچھیے ...... آپ کیا جمع کر رہے ہیں؟ آپ اس وقت اس باغ میں ہیں۔ جہاں سے آپ چاہیں تو نیک اعمال اپنے لیے جمع کریں اور چاہیں تو خراب اعمال؟

مگر یاد رہے جب بادشاہ کا حکم صادر ہوگا، تو آپ کو اپنی جیل قبر میں ڈال دیا جائے گا۔ اس جیل میں آپ اکیلے ہونگے جہاں آپ کے ساتھ صرف آپ کے اعمال کی تھیلی ہوگی۔ تو جو آپ نے جمع کیا ہوگا، وہی آپ کو وہاں کام دے گا۔ تو آج تھوڑی سی محنت کر کے اچھی اچھی چیزیں یعنی نیک اعمال جمع کر لیں اور وہاں آسانی اور آرام والی زندگی گزاریں۔

کہ آخر نواز صاحب نے اتنی سختی سے کیوں انکار کیا اور پھر شیبا کیوں ان کے دباؤ میں تھی کہ ایک لفظ بھی میری حمایت، میں نہ کہہ سکی!! اسے شائد احساس بھی نہ ہوگا کہ آج زندگی کے پندرہ سال اس کے بغیر میں نے تنہا گزار دیئے ہیں اور تنہائی کم کیا ہوتی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے سینے کے اندر درد کا انگارہ دہک رہا ہے۔ حالاں کہ کمپنی کے کام کے سلسلے میں روزانہ ہی بڑے بڑے ہوٹلوں یا کلبوں میں جانا ہوتا تھا، لیکن یہ سب میں دل سے نہیں کرتا تھا۔ میں تو جیسے روبوٹ بن کر رہ گیا تھا۔

اس دن میں، چند ضروری کام نپٹانے کے لیے اپنے آفس جلدی آ گیا تھا۔ سیکرٹری نے فائل لا کر سامنے رکھی۔ چائے اور کافی بھی آ گئی اور میرے ایک سینئر منیجر ساتھ بیٹھ گئے اور انہماک سے کام شروع ہو گیا۔ اصل میں یہ ایک نیا پروجیکٹ تھا جس کا میٹریل اور پروڈکٹ ہم ہی بناتے تھے، اربوں روپے کا یہ معاہدہ فائنل سٹیج پر تھا۔ ظاہر ہے اس پر پوری محنت کرنا ضروری تھا۔ کئی گھنٹے کام کرتے گزر گئے تو سیکرٹری نے بتایا کہ جناب دو بج چکے ہیں اور لنچ پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ ہاں اسی معاہدہ کی چیف انچارج اور آڈر فائنل کرنے کے لیے کل صبح ان کا وفد بھی آ رہا ہے۔ اس دن تو شام تک ہم لوگوں نے بہترین ورکنگ کر لی تھی اور انتہائی گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے قیمتوں میں اچھی خاصی کمی بھی کر دی گئی تا کہ قیمتوں کو دیکھتے ہوئے بھی یہ پراجیکٹ ہمارا ہی رہے۔

اگلے دن میٹنگ سے پہلے اصل پارٹی والے لوگ تو سب آ گئے اور جب میں خود اپنے نمائندوں کے ساتھ ہال میں آیا اور ہم سیٹوں پر براجمان ہو گئے تو دوسرے لوگوں نے اعلان کیا کہ انتہائی معذرت کے ساتھ انفارم کیا جاتا ہے کہ ہماری چیئرمین صاحبہ ایک انتہائی اور ہائی لیول کی میٹنگ (جو کہ فلاں ملک کے سربراہ نے بلوائی تھی اور وہ بھی اچانک) میں شرکت کے لیے تشریف لے گئی ہیں اور ہمارے جنرل منیجر صاحب کو ہر طرح کے اختیارات سونپ کر گئی ہیں۔ انشاء اللہ ہفتہ میں آ جائیں گی تو آپ کے چیئرمین غازی صاحب سے ضرور ملیں گی۔ بہرحال میٹنگ میں ہر طرح کے نکات اٹھائے گئے، ہر طرح سے تسلی سے کام پر بحث و مباحثہ ہوئے اور آخر کار جنرل منیجر صاحب نے معاہدہ کو حتمی شکل دیکر دستخط کر دیئے۔ مبارک باد کے پیغامات کے ڈھیر لگ گئے!

میں حسب معمول کمپنی کا کام دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک صبح آفس میں میری سیکرٹری نے اطلاع دی کہ محترمہ چیئرمین صاحبہ ملنے کے لیے ہمارے آفس آ چکی ہیں اور انہوں نے فرمایا ہے کہ تمام لوگ باہر ہی ٹھہریں گے میں اکیلی فاروقی صاحب سے گفتگو کر لوں گی۔ میں تمام

کوڈ

ایک صاحب تار گھر میں آپریٹر تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بھی تار کے کوڈ وغیرہ سکھا رکھے تھے۔ ایک دن ان کے ہاں میاں بیوی دو مہمان آ گئے۔ گھر میں جو کچھ موجود تھا ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ کھانے کے دوران میزبان نے محسوس کیا کہ کھانا کم پڑ جائے گا لہٰذا انہوں نے میز پر اپنی انگلی سے کھٹکھٹاتے ہوئے اپنی بیگم سے پوچھا ”کچن میں کچھ اور بھی کھانے کے لیے موجود ہے یا نہیں؟“

پیشتر اس کے کہ میزبان کی بیوی کچھ کہتی مہمان نے انگلی سے میز کھٹکھٹاتے ہوئے جواباً کہا ”شکریہ! ہم نے سیر ہو کر کھالیا ہے۔

(بسمہ ندیم ثاقب خان/لاہور)

تیاریوں کے ساتھ تیار تھا۔ اُٹھ کر اپنے آفس کے دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اتفاق سے میرا چہرہ دروازے کی طرف نہ تھا۔ سیکرٹری آئی اور کہا، "سر محترمہ چیئرمین صاحبہ تشریف لے آئی ہیں" اور وہ آفس سے باہر چلی گئی۔

پھر مجھے آواز آئی، "ہیلو مسٹر فاروقی!! گڈ مارننگ" اس آواز میں کوئی چیز محسوس کرکے میں نے فوراً پلٹا کھایا اور چیئرمین صاحبہ کو دیکھا، آمنا سامنا ہوتے ہی ہم دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اور ہم دونوں بیک وقت بولے "ارے تم، ارے تم!!" میں تو دم بخود یک ٹک شیبا کے چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ اور شیبا بھی ٹھٹھر کر بے خود سی ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف والہانہ بڑھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر خاموش گلہ شکوہ کرنے لگے۔ میں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا، "شیبا خدا کی قسم آپ آج بھی اتنی ہی خوبصورت اور پرکشش ہیں جتنی پندرہ سولہ سال پہلے تھیں۔" شیبا بولی "اور آپ جناب بھی اور گریس فل ہوگئے ہیں۔" ہم دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ خاصا وقت ایک دوسرے کے حالات جاننے میں نکل گیا۔ شیبا نے بتایا کہ ابو تو کاروباری لحاظ سے میری پسند ناپسند کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے ایک پارٹنر سے میری شادی کرانا چاہتے تھے، مگر میں نے سختی سے کبھی بھی شادی نہ کرنے کا عندیہ دے دیا اور کاروبار کو ہی اپنا سب کچھ بنالیا، اس دوران خوب ترقی ہوئی۔ اب تو ابو کو فوت ہوئے بھی 10 سال ہوگئے۔ والدہ پہلے ہی نہ تھیں۔" میں نے پوچھا، "تو...... آپ کے وہ کہاں ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں۔"

شیبا بولی، "غازی آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میری محبت جو آپ کے ساتھ آسمانوں تک اونچی تھی اور جس میں شہد سے زیادہ مٹھاس اور فولاد سے زیادہ مضبوطی تھی، ایسے ساتھی کے لیے میں محض دولت، دنیاوی جاہ و جلال اور اپنی عمر سے بھی خاصے بڑے شخص سے زندگی کا بندھن باندھ لیتی......" وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی،" اور ہاں آپ بتائیں بیگم صاحبہ کہاں ہیں ساتھ رکھا ہوا ہے یا پاکستان میں ہیں؟ کتنے بچے وغیرہ ہیں۔" میں بے بسی سے ہنس دیا۔ پھر کہا، "شیبا جی آپ کیا سمجھتی تھیں کہ آپ عورت کی حیثیت سے ہی قربانی کی اعلیٰ مثال قائم کرسکتی ہیں۔ ہم جیسا مرد بھی آپ کے شانے بشانے کھڑا ہے۔ میری زندگی میں کوئی بھی نہیں۔ آپ کی یاد میں زندگی گزار تا رہا ہوں۔ اکیلا اور تنہا ہوں!!"

شیبا، حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بولی، "تو جناب ہم بھی زندگی کا سفر اکیلے ہی بتا رہے ہیں!"

"تو پھر شیبا، یہ کولڈ ڈرنک لو اور آج ہی ہم ایک ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور اگلے ہفتہ ہم دونوں ایک ہوجائیں گے۔ جتنی مدت اذیت اور تنہائی میں گزری ہے شیبا جی اللہ نے آخر کار یہ خوشیوں بھرا وقت ہمارے مقدر میں لکھ ہی دیا۔"

اور ہم دونوں اُٹھ کر ایک دوسرے کے پاس آگئے۔ آنے والے کل کی خوشیاں اور گزرے ہوئے انمول مگر رائیگاں وقت کے پچھتاوے آنسو بن کر آنکھوں میں جھلملا رہے تھے۔

آج مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا خوشی سے جھوم اٹھی ہے اور لاکھوں کروڑوں شمعیں جل اٹھی ہیں۔ شیبا کے گھر تو ایسا کوئی نہ تھا جس کو اتنی بڑی خوش خبری سناتی مگر میں نے اپنے والد اور والدہ کو یہ خبر ضرور سنائی اور وہ خوشی سے رونے لگے۔

......⬤......⬤......

”زلزلے“

عارف محمود اُپل

اس خوفناک قدرتی آفت سے دنیا بھر میں ہر سال لاکھوں افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں
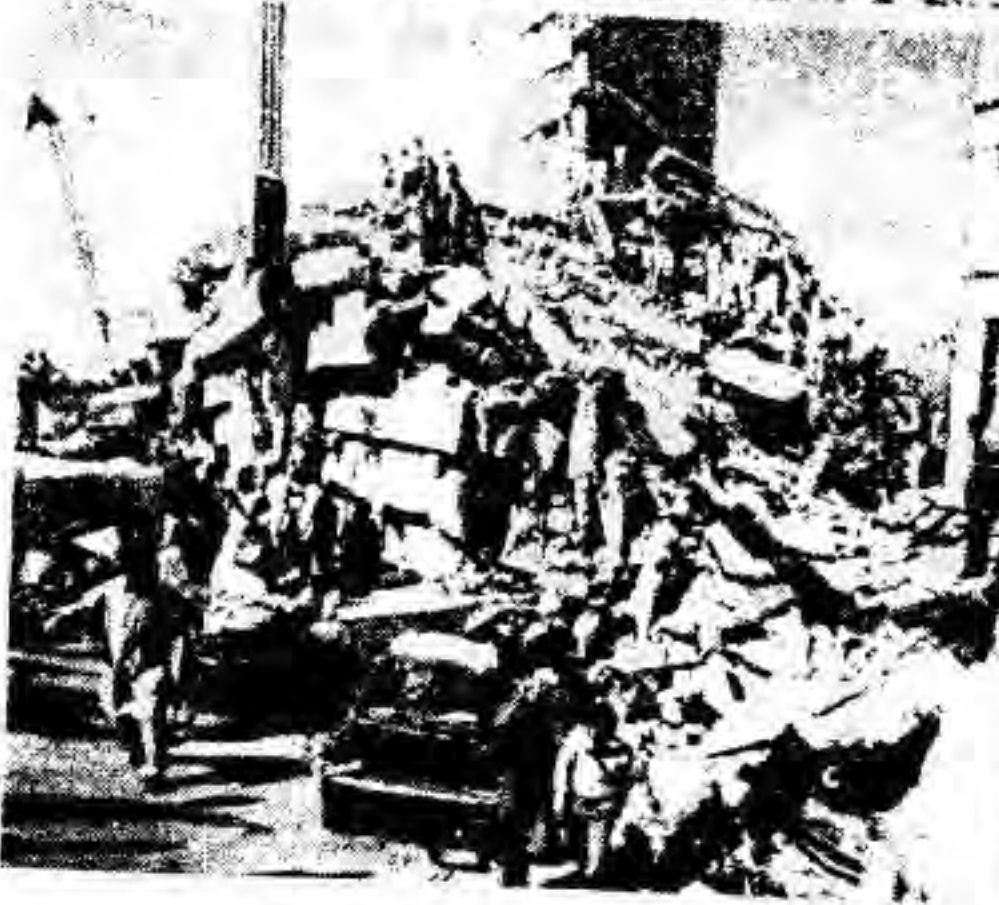
تاریخ کا قدیم ترین زلزلہ کب اور کہاں آیا، یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا، البتہ وہ پہلا زلزلہ جو انسان نے اپنی تحریر میں ریکارڈ کیا تقریباً تین ہزار برس قبل 1177 قبل مسیح میں چین میں آیا تھا۔ اس کے بعد قدیم ترین ریکارڈ 580 قبل مسیح میں یورپ اور 464 قبل مسیح میں یونان کے شہر اسپارٹا کے زلزلے کا ملتا ہے۔ مورخین کا خیال ہے۔ یہ زلزلہ اسپارٹا اور ایتھنز کے درمیان لڑی جانے والی پولینیشن جنگ

کے دور میں آیا تھا۔ پورے شہر کو ملیا میٹ کر دینے والا زلزلہ 226 قبل مسیح یونان کے جزیرے رہوڈس میں آیا تھا، جس نے یہاں کے شہر کیمریوس کو نیست و نابود کر دیا اور ساتھ ہی اس شہر کے ساحل پر نصب عظیم الشان مجسمہ ہیلوس بھی تباہ ہوگیا جس کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ 63 عیسوی میں اٹلی کے شہر پومپائی میں زبردست زلزلہ آیا جس سے اس کی تمام عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ پھر اس شہر کی از سرِ نو تعمیر میں 16 سال لگ گئے مگر 24 اگست 79ء کو یہاں زلزلہ آیا اور اس شہر کے پہاڑ کوہ سیوس کا آتش فشاں پھٹ پڑا چنانچہ پومپائی اور ہرکولینم شہر مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ تاریخی حوالوں کے مطابق تقریباً 25 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔

365ء میں یونان کے جزیرہ کریٹ میں زلزلہ آیا جس سے اس کا شہر کنوس کل 50 ہزار نفوس کے ساتھ برباد ہوگیا۔ اس زلزلے کی شدت کا اندازہ 8.1 میگنیٹیوڈ لگایا گیا۔ تاریخ میں اسی سال لیبیا کے شہر سیرین Cyrene میں بھی ایک زلزلہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ 20 مئی 526ء کو شام کے شہر انطاکیہ Antochia میں خوفناک زلزلے سے ڈھائی لاکھ افراد جاں بحق ہو گئے۔ 844ء میں دمشق شہر میں شدید زلزلہ آیا جس سے تقریباً 50 ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ریکٹر اسکیل کے مطابق اس کی شدت 6.5 رہی ہوگی۔ 847ء میں دمشق میں دوبارہ زلزلہ آیا۔ 70 ہزار افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً نصف شہر تباہ ہوگیا۔ سائنسدان اس زلزلہ کی شدت 7.3 میگنیٹیوڈ سے زیادہ بتاتے ہیں۔ اسی سال عراق کے شہر موصل میں بھی زلزلہ آیا جس سے 50 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 22 دسمبر 856ء کو ایران میں زلزلے سے تباہی ہوئی جس سے دمغان اور قومیس شہر کو نقصان پہنچا اور کل دو لاکھ افراد جاں بحق ہوئے۔ اسی سال یونان کے شہر کورنتھ میں بھی زلزلے سے 45 ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔

893ء میں تاریخ کے تین بڑے زلزلے آئے۔ ایک کاؤکاس Caucasus شہر میں جس سے 84 ہزار نفوس ہلاک ہوئے۔ دوسرا ایران کے شہر اردبل میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ جانیں ضائع ہوئیں اور تیسرا زلزلہ ہندوستان میں وادی سندھ کے قدیم شہر دے پور Daipur یعنی دیبل میں آیا اور تقریباً ایک لاکھ اسی ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ تاریخ ابن کثیر میں تحریر ہے کہ اُس وقت سندھ پر عبدای بن عمر ہباری کی حکومت تھی جو خلیفہ بغداد کی جانب سے مقرر کردہ تھے یہ زلزلہ 14 شوال 280 ہجری میں برپا ہوا اور اس دوران چاند گرہن اور تیز آندھی کے آثار بھی روایتوں میں بیان ہوئے ہیں، ابن کثیر کے مطابق نصف شب یکے بعد دیگرے پانچ زلزلے آئے اور بمشکل سو مکان ہی سلامت رہ سکے۔ طبری اور ابن کثیر مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار بتاتی ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی کے دوران 1036 میں چین کے شہر شانکسی میں زلزلے سے 23 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1042ء میں شام میں تبریز، پالر اور بعلبک کے مقام پر زلزلے سے 50 ہزار افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور تبریز شہر کی نصف آبادی ختم ہو گئی۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق یہ زلزلہ 7.3 میگنیٹیوڈ کی شدت کا رہا ہوگا۔ 1057ء میں چین کے شہر چیہلی Chihli میں 25 ہزار افراد زلزلے کی زد میں آکر ہلاک ہوئے۔

بارہویں صدی عیسوی کے سال 1138 میں شام میں گنزہ Ganzah اور الیپو Aleppo کے مقام پر خوفناک زلزلہ آیا اور تقریباً 2 لاکھ تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے، اس کی شدت کا اندازہ ریکٹر

اسکیل پر 8.1 میگنیٹیو ڈ کے برابر لگایا گیا ہے۔ 1156ء اور 1157ء کے دوران بھی شام میں زبردست زلزلے سے تیرہ شہر برباد ہوگئے 1169ء میں شام میں شدید زلزلہ آیا اور کل 80ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ 1170ء میں سسلی میں زلزلے سے 15ہزار افراد موت کا شکار ہوئے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں 5جولائی 1201ء کے دوران بالائی مصر اور شام میں تاریخ کا بدترین زلزلہ برپا ہوا۔ جس میں کل گیارہ لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ 1268ء میں ترکی کے شہر اناطولیہ اور سلیسیہ Cilcia میں زلزلے سے 60ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ 27 ستمبر 1290 چیہلی (چین) میں 6.7 میگنیٹیو ڈ کا زلزلہ آیا۔ جس سے ایک لاکھ انسانوں کی اموات ہوئیں۔ اس کے تین سال بعد 20 مئی 1293ء میں جاپان کے شہر کاما کورا میں آنے والے زلزلے سے تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ چودہویں اور سترہویں صدی کے دوران 6 بڑے زلزلے آئے۔ 18اکتوبر 1356ء میں سوئٹزر لینڈ کے علاقے باسل میں زلزلے سے ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ امریکی تاریخ کا سب سے بڑا زلزلہ 1471ء میں پیرو میں آیا تھا۔ مگر اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ 26 جنوری 1531ء میں پرتگال کے علاقے لسبن میں زلزلے سے تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ تاریخ کا دوسرا بڑا زلزلہ 23 جنوری 1556ء کو شانکسی (چین) میں آیا، جس سے 8لاکھ تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ نومبر 1667 میں شاکھا (آذربائجان) 80 ہزار افراد زلزلے سے جاں بحق ہوئے 17 اگست 1668ء میں اناطولیہ (ترکی) میں زلزلے سے 8ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔

اٹھارہویں صدی میں تقریباً 13 بڑے زلزلے آئے۔ 26 جنوری 1700 میں امریکہ کی پلیٹ کا سکاڈیا میں حرکت کی وجہ سے زلزلہ آیا جس کا اثر نارتھ کیلیفورنیا سے وان کوور آئی لینڈ تک پہنچا۔ یہ زلزلہ 9 میگنیٹیو ڈ شدت کا تھا۔ 1703ء میں جاپان کے شہر جے ڈو Jeddo میں زلزلہ سے ایک لاکھ 90 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1707ء میں جاپان میں زیر سمندر زلزلہ آیا جس سے تیس ہزار افراد کی اموات ہوئیں۔ 30 ستمبر 1730 کو جاپان کے ہوکائیڈو آئی لینڈ کے ایک لاکھ 37ہزار افراد زلزلہ کی زد میں آئے اور اگلے سال چین کے شہر بیجنگ میں زلزلے سے ایک لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ 11اکتوبر 1737ء میں کلکتہ شہر میں خوفناک زلزلہ سے 3 لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ اس کے پانچ دن بعد ہی کچا ٹکا (روس) میں 9.3 میگنیٹیو ڈ کا زلزلہ آیا۔ 7جون 1755ء کو شمالی ایران میں زلزلے سے 40ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اس کے ایک ہفتے بعد 18نومبر کو بوسٹن میسا چوسٹس میں بھی زلزلہ آیا تھا مگر خوش قسمتی سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ 28فروری 1780ء میں ایران میں زلزلہ سے دو لاکھ افراد جاں بحق ہوئے۔ فروری 1783ء میں اٹلی کے شہر کلبریا Calabria میں زلزلے سے 35 ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 4فروری 1797ء میں ایکواڈور اور پیرو میں زلزلے سے 41ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ ایک ہفتہ بعد 10 فروری کو ایسٹ انڈیز (موجودہ انڈونیشیا) کے صوبہ سماٹرا میں زلزلہ آیا جس سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد 300 تھی اس زلزلے کی شدت 8.4 میگنیٹیو ڈ تھی۔

انیسویں صدی میں دسمبر 1812ء کے دوران کیلیفورنیا میں ریکٹر اسکیل پر 7.0 کی شدت کے زلزلے سے 40 افراد کی اموات ہوئی۔ 23جنوری 1855ء میں نیوزی لینڈ میں زلزلے سے 4 افراد

اور 4 جنوری 1867ء میں کیلیفورنیا میں ایک فرد ہلاک ہوا۔ اسی سال اٹلی میں زلزلہ سے 11ہزار افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ 1868ء میں ہوائی (امریکہ) میں زلزلے سے 77اور کیلیفورنیا میں30ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1872ء کیلیفورنیا (امریکہ) میں 27، 1888 کیلیفورنیا (امریکہ) میں 60 اور 1892 کیلیفورنیا میں ایک فرد ہلاک ہوا۔ اس کے علاوہ جاپان کے علاقے مینو۔ اوواری Owari-Mino میں 1891ء کے دوران زلزلے سے 7273 افراد ہلاک ہوئے اور آسام (انڈیا) میں 1897ء میں زلزلہ سے ڈیڑھ ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ اسی صدی میں امریکہ میں 17مزید زلزلے بھی آئے جن کی شدت کا اندازہ ماہرین نے 6 سے 8 میگنیٹیوڈ کے درمیان لگایا ہے اور ایسٹ انڈیز (انڈونیشیا) میں 2 زلزلے آئے مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ برصغیر میں بھی اس صدی کے دوران 5بڑے زلزلے آئے ۔ 1819 میں پنجاب، اور کچھ Kutch کے مقام پر 32ہزار افراد زلزلے کا شکار ہوئے۔ 1838 میں نیپال میں زلزلہ آیا جس سے 2ہزار اموات ہوئیں۔ کشمیر میں 1885ء میں تین ہزار افراد ہلاک ہوئے اور آسام میں ڈھائی ہزار افراد 1897ء میں لقمہ اجل بنے۔ 1827 میں لاہور میں زلزلے سے ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1827ء سے 1931ء تک بلوچستان میں 9زلزلے آئے لیکن ان کی تفصیل نہیں ملتی۔

بیسوی صدی کا پہلا بڑا زلزلہ ہمالیہ پٹی پر کانگڑہ کے مقام پر آیا جس میں 20 ہزار افراد لقمہ اجل بنے 1906ء میں 3زلزلے آئے جس میں کولمبیا اور ایکواڈور کے ایک ہزار، سان فرانسسکو کے تین ہزار چلی میں 20ہزار افراد کی جانیں گئیں۔

1908ء میں تاریخ کے بدترین زلزلوں میں سے ایک زلزلہ اٹلی میں آیا تھا جس میں ایک لاکھ 60ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں 1918ء میں پورٹوریکو (براعظم امریکہ) میں 116 افراد کی ہلاکت ہوئی۔ 1920ء میں تاریخ کا نواں بڑا زلزلہ آیا جس میں چین کے علاقہ ننکشیر اور گنسو کے 2لاکھ افراد لقمہ اجل بنے۔ اس زلزلے کی شدت 8.6 میگنیٹیوڈ تھی۔ 1923 میں جاپان میں زلزلے سے ایک لاکھ 43 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1927 میں کیلیفورنیا میں زلزلے سے 13 اموات ہوئیں۔ مگر 1927 میں دو بڑے زلزلے بھی آئے جس سے جاپان کے 3ہزار اور چین کے دو لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔

1931ء میں نیوزی لینڈ سے 258 افراد کی جانیں ضائع ہوئیں۔ 1932ء اور 1933 کا سال دوبارہ چین اور جاپان کے لئے بُرا ثابت ہوا جس میں وہ زلزلوں سے چین کے 70ہزار اور جاپان کے تقریباً 3ہزار افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے 1933 میں ہی کیلیفورنیا میں معمولی شدت کے زلزلے سے 115 افراد موت کا شکار ہوئے۔ 1934میں ہندوستان کے صوبہ بہار میں زلزلے سے 13ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 1935 میں تائیوان مین زلزلے سے 3279 افراد ہلاک ہوئے ۔ 1935 میں پاکستان کے شہر کوئٹہ میں تباہ کن زلزلہ آیا جس سے کوئٹہ شہر بُری طرح تباہ ہوگیا۔ یہ زلزلہ 7.8 میگنیٹیوڈ کی شدت کا تھا جس سے مستونگ ، لورالائی قلات کے پشین اور چمن کے علاقے بھی متاثر ہوئے تھے۔ زلزلہ کا مرکز چمن فالٹ کا مقام تھا۔ اس زلزلے نے 30 سیکنڈ میں پورے شہر کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا اس زلزلے سے

ہونے والی اموات کی تعداد اندازاً 60ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ 1939 میں ترکی میں زلزلے سے 32ہزار 7سوافراد کی جانیں گئیں۔
1940 میں کیلیفورنیا میں غیر معمولی یعنی 7.1 شدت کے زلزلے سے صرف 9افراد ہلاک ہوئے۔ 1944ء میں جاپان میں زلزلہ آیا جس سے 1223 افراد کی ہلاکتیں نوٹ ہوئیں اس زلزلے کا اندازہ ریکٹر اسکیل پر 8.1 لگایا گیا ہے۔ 1945 میں مکران کے ساحلی علاقوں میں سمندری زلزلہ سونامی آیا جس کے باعث اُٹھنے والی سمندری لہریں کراچی ممبئی اور کچھ تک گئیں۔ مغربی محقق سینج رے کی کتاب "ورلڈ میپ آف نیچرل ہیزرڈ" کے مطابق اس سونامی سے کل 4 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1946 میں تین زلزلے الاسکا ڈومینن اور جاپان میں آئے۔ جس سے تقریباً1600 افراد ہلاک ہوئے۔ 1949ء میں واشنگٹن میں زلزلے سے صرف 8افراد موت کا شکار بنے۔ 1950 میں امریکہ، یونان اور منگولیہ میں معمولی شدت کے 6 زلزلے آئے۔ جس میں یونان کے 476 امریکہ کے 48 اور منگولیہ کے 30افراد ہلاک ہوئے۔
1960ء کے دوران مراکش میں زلزلے سے 10ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ اسی سال چلی میں زلزلے سے 5700 افراد کی جانیں ضائع ہوئیں۔ 1964 میں الاسکا (امریکہ) میں 9.2 شدت کا زلزلہ آیا لیکن صرف 125 افراد ہلاک ہوئے۔ جاپان میں اسی سال زلزلے سے 26 افراد ہلاک ہوئے۔ 1967 مین واشنگٹن میں زلزلے سے 7 افراد کی جانیں گئیں۔ اسی سال ہندوستان کے علاقے کویانا میں زلزلے سے 900 افراد ہلاک ہوئے۔ 1969ء میں کیلیفورنیا میں زلزلے سے ایک فرد کی جان ضائع ہوئی۔ 1970 میں پیرو (امریکہ) میں زلزلے سے 66ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال بھڑوچ (انڈیا) کے مقام پر زلزلے مین 90 افراد جاں بحق ہوئے۔ 1971 میں کیلیفورنیا میں زلزلے سے 65افراد ہلاک ہوئے۔ 1974 میں پاکستان کے علاقے مالاکنڈ اور پٹن میں زلزلے سے کل 6ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ 1975 میں چین کے علاقے ہائی چنگ میں زلزلے سے 10 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال جزیرہ ہوائی میں اس سے زیادہ شدت کے زلزلے نے صرف 2 افراد کی جانیں لی۔ 1976 میں گوئٹے مالا میں زلزلے سے 23ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ اسی سال تانگ شان (چین) میں آنے والے تباہ کن زلزلے سے اندازاً 6 لاکھ 55ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ یہ تاریخ کا تیسرا بڑا زلزلہ تھا۔ 1977 کے دوران رومانیہ میں زلزلے سے پندرہ سو افراد لقمہ اجل بنے۔ 1980 میں نیپال میں زلزلے سے 1500 افراد ہلاک ہوئے۔ 1981 میں گلگت میں زلزلے سے 220 افراد کی جانیں ضائع ہوئیں۔ 1983 میں امریکہ کے علاقہ رہیو میں 2افراد زلزلے سے جاں بحق ہوئے۔ اسی سال پاکستان کے شمالی علاقے میں زلزلے سے 14افراد ہلاک ہوئے۔ 1984 میں بھارت کے علاقے کاچھر میں زلزلے سے 500 افراد ہلاک ہوئے اور 1985 پاکستان میں سوات و چترال میں زلزلے سے 5اموات ہوئیں۔ 1985 میں میکسیکو (امریکہ) میں زلزلے سے 9ہزار 5 سوافراد ہلاک ہوئے۔ 1987 میں کیلیفورنیا میں 8افراد زلزلے سے جاں بحق ہوئے۔ 1988 میں آرمینیا (ترکی) میں 25ہزار افراد زلزلے کے باعث ہلاک ہوئے۔ 1989 کیلیفورنیا میں زلزلے سے 63 افراد کی جانیں گئیں۔

1990 میں ایران میں زبردست زلزلہ آیا جس سے 35 ہزار (بعض اندازوں کے مطابق 50ہزار)افراد ہلاک ہوئے۔ 1991 میں ہندوکش سے افغانستان تک زلزلے میں 500افراد ہلاک ہوئے اسی سال بھارت کے علاقے اتر کاشی (بنارس) میں زلزلے سے 3ہزار جانیں ضائع ہوئیں اور کیلیفورنیا میں آنے والے زلزلے سے 3افراد لقمہ اجل بنے۔ 1993 میں بھارت میں لاٹر کے مقام پر زلزلے سے 9748 افراد ہلاک ہوئے۔ 1994 کیلیفورنیا میں زلزلے سے 60 افراد لقمہ اجل بنے۔ ایک زلزلہ بولویہ میں بھی آیا اور 5 افراد ہلاک ہوئے۔ 1995 میں جاپان کے علاقے کوبے میں آنے والے زلزلہ سے 5582 افراد ہلاک ہوئے۔ 1997 میں بھارت کے علاقے جے پور اور جبل پور میں زلزلہ آیا۔ اسی سال پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں بھی زلزلہ آیا اور ہلاک ہونے والوں کی کل تعداد تقریباً ایک ہزار تھی 1998 میں نیو کینیا میں زلزلہ سے 2183 افراد لقمہ اجل بنے۔ 1999 میں 4 بڑے زلزلے آئے جس میں کولمبیا کے 1185، ترکی کے 17118، تائیوان کے 2400 اور ترکی ہی کے 895 افراد ہلاک ہوئے۔ 1999 ہی میں بھارت کے علاقے چمولی میں زلزلے سے ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

26جنوری 2001 میں بھارت کے علاقے گجرات میں زبردست قسم کا زلزلہ آیا جس کی شدت ریکٹر اسکیل پر 7.7 تھی۔ اس زلزلے کی شدت پاکستان میں بھی محسوس کی گئی۔ اس زلزلے سے بھارت کے 25ہزار اور پاکستان کے کل 20افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال پیرو میں زلزلے سے 75 افراد جاں بحق ہوئے۔ 2002 میں افغانستان میں زلزلے سے ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال الجیریا میں بھی زلزلہ آیا تھا جس سے 2266 اموات ہوئیں۔ 2002 میں پاکستان کے شہر گلگت میں 3زلزلے آئے جس سے کل 41 افراد ہلاک ہوئے۔ 2003 میں کیلیفورنیا میں آنے والے زلزلے سے 2افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال ایران میں زلزلے سے 31ہزار افراد لقمہ اجل بنے۔ 2004 میں جاپان، تیمور (انڈونیشیا) ڈومینکا اور کوسٹاریکا (امریکہ) میں معمولی شدت کے زلزلے آئے جس سے کل 61افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال مراکش میں بھی زلزلے سے 500 افراد ہلاک ہوئے۔ 2004ء میں سب سے بڑی تباہی 26 دسمبر کو انڈونیشیا کی ریاست سماٹرا میں زیر سمندر زلزلے سونامی سے آئی۔ جس سے اٹھنے والی لہریں انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش، بھارت، تھائی لینڈ، سری لنکا، میانمار (برما) مالدیپ، صومالیہ، کینیا، تزالیہ، سیشلو (مڈغاسکر) اور جنوبی افریقہ تک گئیں۔ اس تباہی سے ہونے والی اموات 5 لاکھ سے زائد ہیں۔ جبکہ سرکاری طور پر ہلاکتوں کا اندازہ 2لاکھ 83ہزار ایک سو چھ لگایا گیا ہے۔ 2005 میں انڈونیشیا میں زلزلے سے 1313ء افراد ہلاک ہوئے۔ اسی سال ایران میں زلزلہ آیا جس میں 790 افراد لقمہ اجل بنے جبکہ جاپان میں ایک اور چلی میں گیارہ افراد اسی سال زلزلے سے جاں بحق ہوئے۔ 8اکتوبر2005 کو اب تک کا شدید ترین زلزلہ پاکستان کے شمالی علاقہ میں آیا ریکٹر اسکیل پر اس کی شدت 7,6 تھی۔ اس زلزلے سے کشمیر، اسلام آباد، بالاکوٹ، مانسہرہ، ہزارہ سمیت بہت سے چھوٹے بڑے دیہاتوں اور قصبوں کو شدید نقصان پہنچا ہے۔

گھر تو آخر اپنا ہے

درخشاں انجم

سارے بلب روشن تھے پنکھے دھڑا دھڑ چل رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر خوشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کوئی جرم کر رہے ہوں۔ ضمیر کچوکے لگا رہا تھا کہ قوم کی دولت کا ضیاع ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیا کوئی اپنے گھر کو یوں برباد کرتا ہے؟

بجلی کے بلوں کے ستائے ایک گھرانے کا ماجرا، جو تنگ آ کر انتقام لینے چلے تھے

اتنا لمبا چوڑا بجلی کا بل دیکھ کر تو جیسے شاہ جی کے ہوش ہی اُڑ گئے۔ یقین تو نہیں آ رہا تھا بار بار بل کے کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے دیکھتے تسلی نہ ہوئی تو بیگم کے فرسٹ ایڈ باکس سے میگنی فائر گلاس لے کر بغور دیکھنا شروع کیا۔ بلاشبہ یہ ان کا ہی تھا۔ پر اتنا زیادہ، وہ چلاتے ہی کیا تھے۔ دو انرجی سیور، دو پنکھے، پانی کی موٹر اس پر اس علاقے میں ہفتوں ہفتوں بجلی کا غائب ہونا۔ آج ادھر کی تار ٹوٹ گئی کل ادھر کی اس میں آنے سے پہلے ذرا بھی انہیں اس بات کا علم ہوتا تو یہاں مکان لینے کی غلطی کبھی نہ کرتے۔ جب ہی انہوں نے

بجلی سے چلنے والی بہت ساری اشیاء کو ڈبوں میں بند کر کے الماریوں میں لاک کر دیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد UPS تو ڈالا ہی نہیں گیا تھا۔

عذر سے بل دیکھا تو پتہ چلا کہ کم بجلی استعمال کرنے پر کنڈا استعمال کرنے کے شبے میں ان پر بجلی کا بل ہزاروں کے حساب سے لاد دیا گیا تھا۔ اب تو وہ تھے اور ان کا غصہ۔ گرجتے برستے پہلے تو اپنے جہازی سائز کچن میں داخل ہوئے جہاں بیگم صاحبہ شام کو آنے والے مہمانوں کے لیے کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ وہ زیادہ ادھر ہی پائی جاتی تھیں۔ یہاں آ کر آرام کا ایک لمحہ بھی جو میسر ہوا ہو لیکن بس کلینک یا کچن۔ کلینک بھی کیا عورتوں کی بیٹھک کو بنا چھوڑا تھا جس میں محلے بھر کی عورتیں علاج کروانے کم اور شیخیاں بگھارنے زیادہ آتی تھیں۔ دن میں کم ہی رات کے نو بجے کے بعد سے ان کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا۔ کتنا ہی کہا گیا کہ نو بجے کے بعد کوئی نہ آئے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی بارہ ایک بجے تک کھٹکا ہی ملتا۔ اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ ان کا تعلق تو ایسے شہر سے تھا جہاں ایک منظم زندگی گزاری جاتی تھی ہر چیز کے اصول و ضوابط تھے وہ ہر بات میں شاہ جی کو کوستی رہتیں جنہوں نے ان کی آرام طلب زندگی کو ختم کر کے اس صحرا میں لا پھینکا تھا۔ کیونکہ ان کے خاندان کے زیادہ تر لوگ ادھر ہی رہائش پذیر تھے۔

"کیا ہوا شاہ جی" انہیں اس طرح گرجتے برستے دیکھا تو سب کچھ چھوڑ کر ان کی طرف مڑیں "وہ دیکھو...... دیکھو...... یہ...... یہ کیا ہے؟" مجھے تو بجلی کا بل نظر آ رہا ہے۔ انہوں نے ان کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی بل کی طرف دیکھا "یہ سب کچھ! تمہارے اس نیم پلیٹ لگانے کا نتیجہ ہے، میرے ہزار منع کرنے کے باوجود بھی تم پر کوئی اثر نہیں ہوا"۔ انہوں نے سارا ملبہ ان پر ہی ڈال دیا۔ اب وہ کیا کہیں ایک لمحے کے لیے بل دیکھ کر وہ بھی گنگ سی ہو گئیں۔ "شاید ہو سکتا ہے اتنے دنوں کے بعد بڑی چھان کر کے تو نیم پلیٹ لگانے کی اجازت ملی تھی کیونکہ اس جگہ کو کلینک کا بورڈ لگا کر کمرشل کروانے کا ارادہ نہیں تھا کہ پتہ نہیں حالات کیسے ہوں؟ ہنگامے، فساد، ہڑتالیں تو اس شہر کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے لیے علیحدہ جگہ کی تلاش جاری تھی۔ بڑی منتوں، سماجتوں کے بعد تو ابھی صرف نیم پلیٹ لگائی ہی تھا اور اس پر یہ افتاد۔

یہ حسرتیں دل میں یونہی پنپتی کہ ان کا بھی اپنا ذاتی کلینک ہوتا۔ بچپن ہی سے شوق مسیحائی جو سر پہ سوار تھا۔ دسویں کے بعد باقاعدہ فرسٹ ایڈ میں داخلے کے لیے آخری حربے کے طور پر بھوک ہڑتال بھی کی اور نہ جانے کس کس طرح سے والد والدہ کو منانے کی کوشش کیں۔ مگر اس تمام جدوجہد کا نتیجہ صفر ہی نکلا۔ لڑکیاں اپنے گھروں ہی میں اچھی لگتی ہیں کہتے ہوئے انہوں نے انہیں رخصت کر کے ہی دم لیا۔ خدانخواستہ ان کے گھر والے کوئی ٹوٹے مرے نہیں تھے زمیندار فیملی سے تعلق تھا بلکہ اس وقت کے رسم و رواج بھی ان کے ہی تھے اتنی ہی تعلیم کے لڑکیوں کے لیے کافی تھی۔

خیر وہ بھی اپنی دھن کی پکی تھیں۔ سسرال آ کر اپنے شوق کی تکمیل شروع کر دیں۔ میاں نے صاف کہہ دیا تم جانو اور تمہارا کام۔ بس ہمارے سارے کام مکمل ہونے چاہئیں۔ ہمارے سے مراد سارے کنبے کا کام تھا۔ اور واقعی انہوں نے زندگی کے پندرہ خوبصورت سال گھر سے لے کر اپنے آپ تک کو ایک کامیاب انسان بنانے میں گزار دیے۔ نہ صبح کی خبر رہی نہ شام کی نہ مہینے کی نہ سال کی۔ اپنے دلکش وجود، نازک مزاج، لطیف احساسات کو اپنی شوق پہ قربان کر کے ایک کامیاب مسیحا کی صورت مسز شاہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئیں تو شاہ جی کو ان کا یہ روپ اچھا نہیں لگا۔ بھلا مرد کب عورت کو اپنے

سے بڑھ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ حکم نامہ جاری ہو گیا بس اپنی خواہشوں کے گھوڑے کو لگام دے کر چپ چاپ گھر بیٹھ جاؤ۔" "ایں کیا کہہ رہے ہیں آپ، اپنی ہستی کو فنا کر کے یہ جو میں نے اتنے ڈپلومے مسیحائی کے حاصل کیے ہیں ان کا کیا ہوگا" شدت کرب سے ان کا وجود کپکپا اٹھا۔ "میں نے نہیں کہا تھا یہ سب کچھ کرنے کو" ٹکا سا جواب ملا...... "اگر اتنا ہی شوق ہے مسیحائی کا تو گھر پہ ہی میں سارے انتظامات کروائے دیتا ہوں۔ بس محلے ٹولے کی حد تک، وہ بھی صرف خواتین اور بچوں کے لیے، بورڈ بھی نہیں لگوانا۔ مجھے سارے مکان کو کمرشل بل ادا نہیں کرنا۔ دیکھیں گے پھر کبھی آس پاس کوئی خالی دکان کلینک کے لیے۔" لاپرواہ سے انداز میں کہتے ہوئے کھسک گئے۔ بہت کہہ سن کر صرف نیم پلیٹ لگانے کی اجازت دی۔ اب جس کا غبار وہ نکال رہے تھے۔

بیگم کو جو سناٹا تھا سنا کر باہر جو نکلے تو یہاں جگہ جگہ لوگ اسی طرح کے زائد بلوں سے متعلق باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ شاید سب ہی کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ بیگم کی جان میں جان آئی چلو...... سب ایک ہی کشتی کے مسافر ٹھہرے۔

ادھر شاہ جی کے ہاتھ میں بل دیکھ کر سب ادھر ہی لپکے "آپ کو کیا ہوا شاہ جی؟" دل تو چاہا کہہ دیں کہ "بجلی والوں نے میرا کچومر نکال دیا بغیر کسی جرم کے"۔ "ہم نے کہتے تھے کہ آپ بھی کنڈا استعمال کریں اور دل کھول کر بجلی چلائیں۔" کسی نے ان کے ہاتھ سے بل لے کر تاسف سے کہا۔ پھر تو سب اپنی اپنی چھوڑ کر شاہ جی ہی سے افسوس کرنے لگے "واقعی آپ کو تو کنڈے کے شبے میں اتنا بل بھیج دیا گیا ہے"۔

شاہ جی کے ساتھ ساتھ سب کو افسوس اسی بات کا تھا۔ انہیں تو کنڈا لگانا بھی نہیں آتا تھا نہ ہی ان کے گھر میں کوئی اور ان کی مدد کرنے والا تھا۔

"میں تو کل واپڈا آفس جاؤں گا۔ ہم نے جلایا ہی کیا ہے صرف دو بلب اور موٹر وہ بھی ہر دوسرے دن صرف 10 منٹ کے لیے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے" ان کا غصہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

"کچھ بھی کر لیں شاہ جی یہ کسی کی نہیں سنتے۔ بہتر ہے آپ قسط کروالیں"۔ ہمدردانہ مشورہ دے کر ان کی بات ختم کی۔ "یا پھر آپ بھی کنڈے استعمال کریں"۔

"توبہ......توبہ......" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا، وہ ہمیشہ ایسے کاموں سے دور رہے، پانچوں وقت کے پکے نمازی تہجد گزار۔ بھلا انہیں ایسی باتیں کہاں زیب دیتیں وہ جدی پشتی رزق حلال طلب کرنے والوں میں سے تھے۔

غصہ بھی ان کا بجا تھا اس مہینے تو وہ سب بجلی کی آنکھ مچولی کی وجہ سے باہر ہی صحن میں سوتے رہے تھے وہ تو شکر ہے مکان بلکہ حویلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا ہوا کی رہ گزر تھا سورج ڈھلتے ہی صحن میں چارپائیاں ڈال دی جاتیں صحن کے ایک طرف کچی زمین پر لیموں، چیکو، امرود کے درختوں کے علاوہ لوگن اور دوسرے موسمی پھولوں کے پودے ہر موسم میں اپنی بہار دکھاتے رہتے۔ بڑے درخت ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتے۔ ویسے بھی اس ستمبر کی خاص بات ہی تھی کہ دن بھر سورج خواہ آگ برساتا رہا ہو۔ شام ڈھلتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو جاتیں اور سارے دن کی کوفت ختم ہو جاتی۔

خدا خدا کر کے اگلے دن سورج طلوع ہوا اور شاہ جی اپنے روز مرہ کے کاموں سے جلدی جلدی فراغت پا کر واپڈا آفس کو چلے۔ وہ شاہ جی بھی کیا جو جائز کاموں میں بھی دس لیکچر نہ سنائیں۔ ریٹائرمنٹ کے کاغذات جمع کروا دیئے، گریجویٹی کی رقم اور کچھ پرانے مکان کو بیچ کر اپنے بھائی بہنوں کے قریب ہی اپنا اچھا سا مکان خرید لیا۔ اب سارا دن خلیل خان کی طرح فاختہ تو اڑاتے تھے بلکہ بیگم کے پالتو پرندوں

سے انہیں چڑ ہی رہی۔ ان کا بس چلتا تو یہ پرندے اُڑا ڈالتے اور تمام ہرے بھرے درختوں کو کاٹ چھانٹ کر صحن کا سارا حسن ماند کر ڈالتے۔ انہیں موضوعات پر تو سارا ان لیکچر دیتے رہتے۔ "کٹواؤ ان درختوں کو، اُڑا دو ان بے زبان پرندوں کو" ایک حد تک ان کی بات درست بھی تھی لیکن صرف پرندوں کی حد تک۔ درختوں سے کیا صدمہ تھا۔ بڑے بڑے سایہ دار پھل دار درخت تھے، ٹوکرے بھر بھر کر لیموں چیکو وغیرہ کے، پورے خاندان اور محلے والوں کو بانٹتے جاتے مگر ساتھ ساتھ لیکچر بھی دیتے رہتے۔

اور اب تو خیر سے دونوں مل کر کوچنگ سنٹر بھی چلانے لگے۔ خود سائنس اور ریاضی کے ٹیچر بنے اور باقی بیگم صاحبہ کے حوالے۔ بینک بیلنس بھی اللہ کی رحمت سے کافی تھا۔ ہاں! تو شاہ جی نے آفس میں قدم رکھتے ہی وہ شور شرابہ کیا کہ واپڈا والوں کو ان کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑا۔ بہت سارے کاغذات پر حلفیہ بیان دیتے ہوئے لکھا کہ ان کے گھر سوائے دو بلب دو پنکھے اور دس منٹ موٹر کے سوا کچھ بھی نہیں چلتا۔ وہ بھی اس علاقے میں مہینے میں تین ہفتے بجلی ہوتی ہی نہیں۔ رات میں وہ ساری گرمیاں باہر صحن میں سوتے ہیں۔ واپسی پر محکمہ بجلی کے دو بندے بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے سارے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے بجلی سے چلنے والی، کبھی نہ استعمال ہونے والی اشیاء کے نام بھی نوٹ کیے۔ سب کا اندراج کر کے محکمے کو پہنچا دیا۔

پھر ہر چار پانچ ماہ کے بعد کنڈا استعمال کرنے کے شبے میں لمبا چوڑا بل پہنچنے لگا۔ اس روز بھی تقریباً ہفتوں کے بعد بجلی صاحبہ کی آمد ہوئی تو شاہ جی نے غصے سے سارے بلب پنکھے آن کر دیے۔ واش روم سے لیکر باہر صحن گیلری سب، کچھ بقعہ نور بن گیا۔ مطلوبہ یونٹ تک پہنچنے کے لیے اس کے علاوہ بھی ہر چیز چلانے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ ابھی تو شروعات تھیں۔ 50 یونٹ بھی نہیں ہوا تھا کہاں 200 یونٹ پورے کرنے تھے۔

سارے بلب روشن تھے پنکھے دھڑا دھڑ چل رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر خوشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کوئی جرم کر رہے ہوں۔ ضمیر کچوکے لگا رہا تھا کہ قوم کی دولت کا ضیاع ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیا کوئی اپنے گھر کو یوں برباد کرتا ہے؟ ...... یہ ملک ...... یہ شہر تو اپنا ہے اس کی ایک ایک شئے کی حفاظت اپنا فرض ہے۔ ان کی آنکھوں میں ندامت تھی۔ تب شاہ جی نے اچانک آگے بڑھ کر کمرے کا سوئچ آف کیا۔ یہ کیا ہوا شاہ جی! بیگم جس کا حال بھی تقریباً انہیں جیسا تھا۔ تھوڑا ڈرتے ڈرتے پوچھ بیٹھیں۔

"ہم...... ہم...... اچھا نہیں کر رہے۔ ہم قوم کی امانت کو اتنی بیدردی سے ضائع کر رہے ہیں"۔ شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ سارے سوئچ آف کرنے لگے۔ اب بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں...... صرف دو لائٹیں چھوڑ کر سب کچھ آف کر دیا یہ سوچتے ہوئے "گھر کی خاطر سو دُکھ جھیلیں گھر تو آخر اپنا ہے"۔

لیکن ان بلوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ انہوں نے بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں چھپے سوالوں کو جیسے پڑھ لیا تھا۔ تب ہی کہنے لگے۔ "اللہ مالک ہے وہ ہمیں بیٹھے بٹھائے رزق فراہم کر رہا ہے نا...... آئندہ بھی دیتا رہے گا۔ اس سے ہمیشہ اچھی امیدیں رکھنی چاہئیں"۔ انہوں نے خلاف معمول بڑے تسلی بھرے انداز میں کہا اور ...... پھر کچھ وہاں کے لیے بھی تو ہونا چاہیے، بلوں کی یہ رقوم جن کی جیبوں میں جائے گی کیا ان کی نیکیاں ہمیں نہ ملیں گی؟ یہاں بھی وہ چھوٹا سا لیکچر دینے سے باز نہیں آئے۔ کم از کم ضمیر تو مطمئن ہوگا۔ ہمارے دل میں یہ خلش تو نہیں رہے گی کہ ہم ملک وقوم کی دولت ضائع کر رہے ہیں۔

سوائے صحن کے ساری لائٹیں آف تھیں مگر ان کے ضمیر مطمئن اور دل روشن تھے۔

کاشی چوہان

وہ تو اکثر اندر اسٹور میں جاکر اپنی تسلی کرتی ہی تھی۔ فوراً اٹھی اور اندر چلی گئی۔ قمیص بازوؤں کے پاس سے کچھ ڈھیلی تھی۔ ابھی وہ پہن کر چیک کر ہی رہی تھی اچانک کہیں بجلی گری۔ اس کے ساتھ ہی بارش کی آواز...... بہت تیز آواز اندر آنے لگی۔ ''جوگندر با......'' وہ ابھی اتنا ہی بول پائی تھی کہ......

ایک عورت کی کہانی جس کے دل پر ایک غلطی کا بوجھ تھا

بڑے زور کی برسات لگی ہوئی تھی۔ کوشلیا کے لیے آج کا دن ہی بڑا ''عجیب'' ثابت ہوا تھا۔ کتنے دن سے وہ اپنی مصروفیت میں سے گھڑی بھر بھی نہ نکال سکی تھی۔ وہ ہر روز سلائی فیکٹری جاتے ہوئے سوچتی آج وہ لازمی تھوڑا سا سے نکال کر ''جوگندر بابو'' کی دکان جاکر اپنے کپڑے لے آئے گی۔ کتنے سارے دن تک تو وہ سلائی کے کپڑوں میں سے بچی ''ٹاکیوں'' کو جمع کر کے تھیلے میں بھرتی رہی تھی۔

اُس کا دماغ بڑا آرٹسٹک تھا لیکن سمے نہیں تھا۔ اُس نے ان ٹاکیوں کو جمع کر کے اپنے تخیل سے نئے طرز کی قمیضیں متعارف کرانے کی آرزو کی تھی۔ آج صبح وہ اپنے پتی کو لنچ بنا کر دیتے ہوئے اپنے دیر سے آنے کا سبب بھی بتا چکی تھی۔ لکشمن اُسے صرف مسکراتا ہوا ہی دیکھتا رہا تھا۔ شادی کے پانچ سال بعد بھی وہ دونوں ابھی تک "ماتا پتا" نہیں بن سکے تھے۔ کیوں کہ کوشلیا جب تک اپنا اور لکشمن کا کھونٹا مضبوط نہ کر دیتی "سنتان" کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لکشمن اگر کبھی اس کی کا تذکرہ کرتا بھی تو کوشلیا "موئی والی گیتا" بن جاتی اور اُسے اس طرح قائل کرتی کہ لکشمن کو پرنام کرتے ہی بنتی۔ وہ اپنی روشن ہوتی پیشانی جو آج کل کچھ زیادہ ہی چمکنے لگی تھی سے پانی کے ننھے ننھے پیدا ہوتے قطرے اپنی شرٹ کے کلف سے پونچھتا، کافی بنانے رسوئی میں چلا جاتا اور کوشلیا اپنے سپنوں کے تاج محل کو چمکاتی چمکاتی کسی اور جہان میں پہنچ جاتی۔

اُس کے نزدیک مرد اور عورت۔ گاڑی کے ایسے پہیے تھے جن کے مضبوط ہونے پر ہی 'پریوار' کا تاج اپنے ماتھے پر سجانا زیادہ بہتر تھا۔

روز کی روٹین کے مطابق وہ اٹھی، جلدی جلدی فیکٹری جانے کے لیے تیاری کی۔ خاکی سوتی ساڑی پہنے لمبی گردن کو مزید اونچا کرنے کے لیے بالوں کا جوڑا بنایا۔ تیز سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا کر وہ تیار تھی۔ لکشمن نے چائے کا پانی رکھ دیا تھا۔ اُس نے تیار ہو کر تین سینڈوچز بنائے اور بھاجی کو گرم کر کے اسٹیل کی چھوٹی کٹوری میں ڈالا اور لکشمن کا لنچ باکس تیار کر دیا۔

دونوں نے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اور اپنے اپنے کاموں پر جانے کے لیے نکل گئے۔

☆......☆......☆

آسمان صاف تھا۔ ذرا بھی تو بادل نہ تھے صبح۔ جیسے جیسے سورج ڈوبنے لگا، اپنے ساتھ کالی گھٹائیں بھی لانے لگا۔ چھٹی ہوتے وقت بوندا باندی تھی۔ اور پھر جیسے جیسے وہ جوگندر بابو کی ٹیلر شاپ تک پہنچی بادل اپنا کام دکھا چکے تھے۔

اُس کی سُوتی ساڑی کا سُوت برکھا پانی سے تر بتر ہو چکا تھا۔ اُس نے دکان میں قدم رکھا۔ لائٹ نہیں تھی۔ جوگندر موم بتی استری اسٹینڈ پر سجائے لیٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے آیئے" اُس نے اسٹول اُس کی طرف کھسکایا۔ "پدھاریے دیوی جی۔" وہ بیٹھ گئی۔

"باقی لوگ کدھر گئے۔ آج میلہ نظر نہیں آرہا۔" اُس نے بھائیں بھائیں کرتی دکان دیکھتے پوچھا۔

"موسم ایک دم خراب ہوئی گوا۔ اور پھر لائٹ بھی چلی گئی۔ سمھئی (سبھی) موج مستی کے لیے پاس ہوٹل ما' چائے کے واسطے نکل گئے۔ کبھی کبھی موقع دینا چاہیے" جوگندر نے کہا۔

"ہمارے کپڑے سی دیے یا نہیں۔ آپ کو معلوم ہے ہم کتنی مشکل سے سمے نکال کر یہاں آتے ہیں۔"

"بھگوان کی کرپا ہے۔ بڑی دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔" وہ عاجزی سے ہاتھ جوڑتے بولا۔

"لا کر دکھا دیجئے نا۔ ہم بہت بے چین ہیں۔ جیسے ہم نے آپ کو بتایا تھا، ویسا ہی ڈیزائن بنایا ہے نا۔" وہ بچوں کی طرح اُتاولی ہو کر بولی تھی۔

"ابھی لاتے ہیں۔ بالکل آپ کے بتائے ڈیزائن کے انوسار سیا ہے۔" جوگندر اندر جا کر اسٹور سے ایک کاغذ کا تھیلا اٹھائے چلا آیا۔

"اب آپ دیکھ لو۔ لائٹ تو جانے کب آئے۔ پھر بھی ہم ایک اور موم بتی کا پربندھ کر دیتے ہیں۔" جوگندر دوبارہ اندر جا کر ایک موم بتی اور لے آیا۔

کوشلیا نے کاغذ کے تھیلے سے قمیصیں نکال کر دیکھنا شروع کر دی تھیں۔

''جوگندر بابو'' وہ قمیصوں کو ہاتھ سے ٹٹولتے دیکھ کر بولی۔

''جی جی۔ پسند آئیں۔ ہم نے جی جان سے محنت کی ہے۔'' جوگندر ہاتھ جوڑتے بولا تھا۔

''ہم نے جو ناپ دیا تھا۔ یہ سب آپ نے اُسی انوسار کیا ہے۔ ہم کو کچھ کمی لگ رہی ہے۔'' کوشلیا کا چہرہ جو ابھی کچھ دیر پہلے کھلا ہوا تھا اچانک مرجھا سا گیا۔

''بالکل۔ اُسی ناپ کے انوسار سیا ہے ہم نے۔ آپ کو سک (شک) ہے تو آپ ایسا کرو۔ اندر جا کر چیک کر لو۔''

وہ تو اکثر اندر اسٹور میں جا کر اپنی تسلی کرتی ہی تھی۔ فوراً اٹھی اور اندر چلی گئی۔ قمیص بازوؤں کے پاس سے کچھ ڈھیلی تھی۔ ابھی وہ پہن کر چیک کر رہی تھی اچانک کہیں بجلی گری۔ اس کے ساتھ ہی بارش کی آواز...... بہت تیز آواز اندر آنے لگی۔

''جوگندر با......'' وہ ابھی اتنا ہی بول پائی تھی۔ کہ سامنے والے اندھے سائے کو پہچان کر لفظ حلق میں ہی دم سے گرا بیٹھی۔

''ہم یہاں ہیں۔ کہیے کیا کہہ رہی تھیں۔''

''وہ۔ وہ یہاں سے کچھ ڈھیلی ہے قمیص۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی تھی۔

''ابھی ٹھیک کرے دیتے ہیں۔''

جوگندر کے سوئی دھاگہ پکڑنے والے ہاتھ اور پائیدان پر رکھے پیر۔ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ باہر موسلادھار برسات کا زور اور بڑھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ جب گھر پہنچی تو برسات تھم چکی تھی۔ اُسے لکشمن کی چنتا ہو رہی تھی۔ لکشمن دہلیز پر ہی مل گیا۔

''بہت دیر کی۔ کہاں رہ گئی تھیں؟'' لکشمن نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ اُس کے ہاتھ میں تولیہ تھا۔ جس سے وہ سر کے بال خشک کر رہا تھا۔ 'مطلب لکشمن ابھی گھر پہنچا ہے۔' کوشلیا نے دل میں سوچا۔

''جوگندر جی کی طرف گئی تھی۔ آج وعدہ تھا قمیصیں دینے کا اُن کا۔'' بہت کوشش کے باوجود وہ نظروں کو چوروں کی طرح اِدھر اُدھر گھمانے سے باز نہ رکھ سکی۔ آج لکشمن کی نظریں، اُس کے پتی کی نظریں، وہ نظریں کہ اُس کا انگ انگ جن کا کھیل تھا، محفوظ پناہ گاہ اور محبت بھری میٹھی نظریں اُسے اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ ایک خوف نے کالا ناگ بن کر اُس کے من میں ڈنک مارا، وہ سہم کر سمٹ سی گئی۔

''ارے واہ، چلو پہن کر دکھاؤ پھر قمیص۔ دیکھوں تو کیسی لگیں گی دلاری بیگم چاہ سے نئی قمیص میں!'' لکشمن نے معمول کی طرح، جیسے وہ روز ہی کرتا تھا، اُس کے گالوں پر پیار سے ایک چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

''کھانا پروس دوں پہلے۔ پھر پہن کر دکھاؤں گی قمیص۔'' کوشلیا نے من من بھر کے قدم رسوئی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ سوچنے لگی اُس نے مزاحمت کیوں نہیں کی۔ شور کیوں نہیں مچایا۔ فوراً ہی ہار کیوں مان لی؟ لکشمن بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہی رسوئی میں چلا آیا تھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''آں۔ ہاں ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے'' وہ عقب میں سے لکشمن کی آتی ہوئی آواز سے یکدم چونک پڑی۔

''بس مجھے باہر بھی آپ ہی کی چنتا ہو رہی تھی۔'' لکشمن نے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ لکشمن کی گرفت

اتنی مضبوط نہ تھی، بہت آسانی سے اُس نے کسمسا کر خود کو چھڑا لیا تھا۔

"کھانا بعد میں کھلانا۔ پہلے قمیض تو پہن کر دکھاؤ۔ مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔" لکشمن محبت جتاتے ہوئے بولا۔

"آپ چلیں۔ میں آ رہی ہوں۔" اُس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"آج آپ جلدی آ گئے؟"

"ہاں۔ طبیعت کچھ بوجھل بوجھل تھی۔ سوچا شریمتی جی کے ہاتھ کی چائے پی جائے۔" لکشمن نے رسوئی کے دروازے پر ہی جمے ہوئے کہا۔

اُسے آج کوشلیا کا رویہ عجیب سا لگ رہا تھا۔

"اچھا چائے بھی بنالاؤ اور قمیض بھی پہن آؤ۔ پھر باتیں کریں گے۔" لکشمن نے اُسے مسکراہٹ بھری نظروں سے، دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اُس نے چائے کا پانی چڑھایا۔ پتی کا ڈبہ ریک میں سے نکالا۔ اُس کے ذہن پر بوجھ تھا۔ شدید بوجھ۔ شدید بے دلی، اکتاہٹ۔ اور وہ خود کو اپنے ہی گھر میں اجنبی اجنبی محسوس کر رہی تھی۔

کیا ساری زندگی اس ذہنی بوجھ کا شکار رہے گی؟ اُس نے سوچا۔

یہ ذہنی اذیت جو اُس کے دل و دماغ اُسے پہنچا رہے تھے اب عمر بھر کا مقدر رہے گی؟ اُسے اپنے ہاتھ ناگ لگ رہے تھے۔ پھنپھناتے ہوئے ناگ۔

کیا اب وہ عمر بھر لکشمن کی نظروں کا سامنا نہیں کر پائے گی؟ پانی اُبلنے لگا تھا۔ اُس نے پتی بُرکا دی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری آواز پر وہ رسوئی سے نکلی اور اُس نے فون اُٹھا لیا۔

"ہیلو!" اُس نے کہا۔

"کرم بابو۔ نمستے۔ کیسے ہیں آپ؟"

"اوہ اچھا۔ کہیے کیسے فون کرنا ہوا۔"

"ہاں۔ لکشمن تو ابھی آئے ہیں دفتر سے۔"

"کیا کہا؟ دفتر گئے ہی نہیں؟ مگر وہ تو...... ابھی آئے ہیں گھر۔"

"اچھا......"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کرم بابو!"

"وہ لڑکی دفتر صرف آج ہی نہیں آئی۔"

"اچھا۔ سرویندر باغ میں اُس کے ساتھ لکشمن کو کس نے دیکھا تھا؟"

"آپ کا بہت شکریہ کرم بابو کہ آپ نے بتا دیا۔ کبھی آئیے نا بھابی کو لے کر ہمارے گھر۔"

"جی بالکل۔ گھر گرہستی والا ہی اس نیائے کو سمجھ سکتا ہے۔"

جی اچھا۔ میں اب دیکھ لوں گی۔ نمستے۔"

اُس نے فون رکھ دیا۔ کرم بابو کی معلومات افزا باتیں سُن کر اُس کے رگ و پے میں غم و غصے کی آگ دوڑ گئی تھی۔ وہ طمطناتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھی، جہاں لکشمن اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

جبھی میں کہوں کہ آج پتی پرمیشور اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہیں۔ اُس نے سوچا۔ لیکن پھر ایک دم اُس کے قدم ٹھٹک کر رُک گئے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ بوجھ جو کچھ دیر پہلے اُسے ڈس رہا تھا اب غائب ہو چکا تھا۔ اُس کے ہاتھ اب ناگ نہیں ہاتھ ہی لگ رہے تھے۔ اپنا وجود اُسے مہکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ مسکرائی اور قمیض تبدیل کرنے واش روم میں داخل ہو گئی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"کبھی کبھی موقع دینا چاہیے ورنہ گھٹن بہت بڑھ جاتی ہے۔"

نصوم لڑکی“

نواز خان

نواز خان

''وہ ایک معصوم اور سادہ دل لڑکی کا متلاشی تھا۔ طویل انتظار کے بعد اُسے ایسی لڑکی مل گئی لیکن..........!''

یہ کہانی دلچسپ انداز میں شروع ہوئی میں امرتسر کے ایک دیہاتی علاقے میں کام کررہا تھا۔ گاؤں کا نام جانڈی پورا تھا۔ یہاں کے ماسٹر ریاض صاحب بڑی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ عمر پچاس پچپن کے قریب تھی تاہم صحت اچھی تھی روز صبح ورزش کرتے تھے۔ پکے نمازی اور خدا ترس شخص تھے۔ گاؤں میں ہر کوئی اُن کا نام عزت سے لیتا تھا۔ ماسٹر صاحب میں اگر کوئی خامی تھی تو اتنی کہ انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ جوانی میں انہیں اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ عشق ہوا تھا۔ پھوپھی زاد کی شادی کہیں اور ہوگئی۔ ماسٹر صاحب نے عمر بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ خاندان کی کئی دوسری لڑکیوں نے اُن کی یہ ضد توڑنی چاہی لیکن کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔

بہر طور اب اِن باتوں کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ماسٹر صاحب کی کنپٹیوں پر سفید بال آچکے تھے اور ان کے طور اطوار سے بزرگوں والی سنجیدگی جھلکنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اُن کی زندگی ایک ایسی ڈگر پر چل نکلی ہے جس پر آنے والے دنوں میں کسی عورت کے قدم نہیں پڑیں گے اور وہ ایک کنواری زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ لیکن ایک روز بلال شاہ نے مجھے ان کے بارے میں ایک اہم بات بتائی۔ گرمیوں کے دن تھے وہ چق اٹھا کر میرے کمرے میں چلا آیا۔ میرے کمرے میں پنکھا لگا ہوا تھا اور بلال شاہ اکثر بہانے بہانے سے ہوا لینے چلا آتا تھا۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ وہ پسینہ خشک کرنے کے چکر میں آیا ہے لیکن پھر اُس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کوئی اہم بات بھی اس نے کرنی ہے۔

اُس کے چہرے پر سرخی تھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چغل خوروں کی سی چمک تھی۔ کہنے لگا ''خان صاحب! کچھ دنوں سے میں ایک عجیب بات محسوس کررہا ہوں۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ شاید مجھے غلط فہمی ہورہی ہے لیکن اب شک شبہ یقین میں بدلتا جارہا ہے''۔

میں نے کہا ''کہیں تیری گھر والی کا جی پھر سے خراب تو نہیں ہونے لگا''۔

''نہیں خاں صاحب'' وہ سر جھٹک کر بولا ''آپ کو تو بس ایک بات سوجھتی ہے۔ میں کچھ اور کہہ

رہا ہوں...... ماسٹر ریاض کو تو جانتے ہیں ناں آپ؟
میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ بولا ''پچھلے کچھ دنوں سے ماسٹر صاحب کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ بڑے بن ٹھن کر رہتے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی سرمہ بھی لگانے لگے ہیں۔ میں نے کئی بار انہیں خود ہی خود مسکراتے اور گنگناتے دیکھا ہے۔ میرے پڑوسی ہیں اس لیے اُن کی جتنی خبر مجھے ہے اور کسی کو نہیں ہوسکتی۔ مجھے تو لگتا ہے ماسٹر جی کا کہیں ٹانکا جڑ گیا ہے''۔

میں نے کہا ''اگر جڑ گیا ہے تو اس میں بُرائی کی کون سی بات ہے، بندے کو کسی بھی وقت اپنا جنازہ جائز کرنے کا خیال آسکتا ہے''۔

وہ بولا ''لیکن یہ تو زیادتی ہے ناں جی اس گاؤں میں میرے ہی ساتھ والے گھر میں کوئی چکر چلتا رہے اور مجھے خبر نہ ہو۔ یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات ہوگئی''۔

میں نے کہا ''تم کہنا چاہتے ہو کہ ماسٹر صاحب اپنے گھر میں کوئی چکر چلا رہے ہیں''۔

''بالکل'' بلال شاہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''وہ تو گھر میں اکیلے رہتے ہیں'' میں نے کہا۔

''لیکن اب اکیلے نہیں ہیں...... مجھے شبہ ہے خان صاحب کہ اُن کے گھر میں اُن کے علاوہ بھی کوئی رہ رہا ہے''۔

''اس شبے کی وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وجہ کوئی نہیں جی، بس یہ میرے دل کی آواز ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے سے ماسٹر صاحب کے گھر میں کوئی ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ ہمارے کوٹھے سے ماسٹر صاحب کے صحن کا کچھ حصہ صاف نظر آتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا پانچ چھ روز پہلے رات کو بارش ہوئی تھی۔ اگلے دن صبح ماسٹر صاحب کے کچے صحن میں میری نظر پڑی تو وہاں مٹی پر کسی عورت کے قدموں کے نشان نظر آئے''۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''نشان اُلٹے تو نہیں تھے کیونکہ سنا ہے ہوائی چیزوں کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں''۔ وہ بولا'' خاں صاحب! آپ مذاق مت سمجھیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ اُس گھر میں کوئی نہ کوئی رہ رہا ہے۔ ابھی کل شام میں نے ماسٹر صاحب کے صحن میں دروازے کے پاس بالوں کا ایک گچھا دیکھا ہے۔ آپ کو پتہ ہی ہے عورتیں کنگھی کرنے کے بعد سرے اُترے ہوئے بال اُنگلی پر لپیٹ کر گول کرتی ہیں اور کوڑے میں پھینک دیتی ہیں بعض اوقات یہ بال ہوا کی وجہ سے اِدھر اُدھر چکرانے لگتے ہیں۔ ایسے ہی بال مجھے ماسٹر صاحب کے صحن میں نظر آئے ہیں''۔

میں نے کہا ''یار! مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کوئی وہم ہوگیا ہے اور اگر وہم نہیں ہے تو کسی طرح اس بات کی تصدیق کرلو۔ اپنی بیوی یا کسی دوسری عورت کو ماسٹر کے گھر میں بھیجو۔ وہ اندر کی ساری بات باہر نکال لائے گی۔

بلال بولا ''یہی تو مصیبت ہے ماسٹر صاحب کسی کو گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔ پہلے انہوں نے کھانا وغیرہ پکانے کے لیے بوڑھی ملازمہ حمیدن رکھی ہوئی تھی۔ حمیدن کو بھی انہوں نے اسی لیے چھٹی دے دی تھی کہ اُس کی وجہ سے عورتوں کا گھر میں آنا جانا تھا''۔

میں نے کہا ''تو پھر خود چلے جاؤ تمہیں وہ کھا تو نہیں جائیں گے''۔

وہ بولا ''خان صاحب! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ موڈی بندے ہیں کہیں کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو گھر والی کے سامنے بےعزتی ہو جائے گی۔'' پھر ذرا سوچ کر کہنے لگا، ہاں ایک طریقہ ہے۔ ہمارے صحن میں دھریک کا ایک درخت ہے جو کافی پھیل چکا ہے۔ میں اُس کی چند ایک موٹی موٹی ٹہنیاں کاٹ دیتا ہوں۔ یہ ٹہنیاں ماسٹر صاحب کے صحن میں گریں

گی۔ ظاہر ہے، ماسٹر صاحب خود تو ٹہنیاں اٹھا کر باہر نکالنے سے رہے۔ اس کام کے لیے مجھے ہی اُن کے گھر جانا پڑے گا۔ بات ختم کرکے وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''صرف ماسٹر صاحب کے گھر جانے کے لیے تم ایک سایہ دار درخت کٹوا دوگے''۔

وہ مسکرا کر بولا ''اس میں دہرا فائدہ ہے جی، ایک تو ماسٹر صاحب کے گھر جانے کا موقعہ ملے گا' دوسرے میری گھروالی کی ایک بُری عادت بھی چھوٹ جائے گی''۔

میں نے کہا ''تمہارے علاوہ بھی کوئی بُری عادت لگی ہوئی ہے اُسے''۔

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں جی۔ وہ بھی خوشگوار موڈ میں بولا ''اب یہ دھریک والا معاملہ ہی لیں۔ اللہ کی بندی گیارہ بجے ہی چارپائی ڈال کر وہاں بیٹھ جاتی ہے۔ ساری دوپہر وہاں گزرتی ہے۔ اب مجھے کہیں آنا جانا ہوتا ہے وہ صحن میں ہوتی ہے اس لیے فوراً دیکھ لیتی ہے پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ نہ دھریک رہے گی اور نہ وہ میری چوکیداری کے لیے وہاں بیٹھے گی...... کیسا ہے؟'' اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''بہت دُور کی سوچتے ہو شاہ جی'' میں نے کہا۔

اگلے روز بلال شاہ نے وہی کیا جو اُس نے کہا تھا میں صبح تھانے کی طرف آتے ہوئے اُس کے گھر کے پاس سے گزرا تو وہ مجھے دھریک کی ایک بلند شاخ پر بیٹھا نظر آیا۔ تھانے آکر میں بلال شاہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی دلچسپ خبر لے کر آئے گا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ قریباً بارہ بجے تھانے آیا۔ سخت تھکا ہوا اور مایوس نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا ''کیا بات ہے؟ تدبیر کامیاب ہوئی''۔

وہ بولا ''کامیاب تو ہو گئی ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماسٹر صاحب پہلے سے تاڑ گئے تھے''۔

میں نے کہا ''بات کیا ہوئی ہے ذرا کھل کر بتاؤ''

وہ کہنے لگا ''کم از کم اس وقت تو ماسٹر صاحب کے گھر میں کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے۔ میں نے گھر میں اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ کوئی ایسی نشانی بھی نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہو کہ یہاں کوئی عورت رہ رہی ہے یا رہ رہی تھی''۔

میں نے کہا ''ہوسکتا ہے وہ سچ مچ کوئی ہوائی چیز ہو اگر وہ واقعی کوئی ہوائی شئے ہے تو پھر تمہیں اس معاملے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ماسٹر صاحب کو چھوڑ کر تم پر عاشق ہو جائے......''۔

بلال شاہ ہوائی چیزوں سے بہت ڈرتا تھا۔ ذرا گھبرا کر بولا ''میں نے آپ سے بہت دفعہ کہا ہے کہ مجھ سے ایسا مذاق مت کیا کریں کبھی کبھی مذاق میں منہ سے نکالی ہوئی بات سچ بھی ہو جاتی ہے''۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ بیس پچیس روز اور گزر گئے۔ بلال شاہ سے اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں ہوئی نہ ہی ماسٹر ریاض سے میرا آمنا سامنا ہوا۔ یہ مئی کی آخری تاریخیں تھیں۔ ان دنوں جانڈی پورا کے نواح میں پیر مست کا میلہ لگتا تھا۔ یہ بڑا بارونق میلہ ہوتا تھا۔ دُور دراز سے لوگ یہاں پہنچتے تھے۔ بڑا زبردست بازار لگتا تھا اس کے علاوہ کھیل تماشے' ناچ گانے' سرکس بہت کچھ ہوتا تھا۔ ایسے میلے ٹھیلوں میں اکثر جرائم پیشہ لوگ بھی گھس آتے ہیں۔ مقامی پولیس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسے لوگوں پر نظر رکھے اور امن وامان کو خراب نہ ہونے دے۔

یہ میلے کے آخری دن کا واقعہ ہے۔ میں سادہ لباس میں گشت پر تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ منہ دوسری طرف کیے کھڑا تھا۔ مجھے وہ ماسٹر ریاض کی طرح لگا۔ میں چند قدم چل کر بائیں طرف آیا اور

حقوق العباد نمبر

شائع ہو گیا ہے

تاریخ انسانیت کی شاہکار دستاویز جس میں

- جنگ و جدل اور مذہب کے ہاتھوں استحصال انسانیت کب، کیوں اور کیسے ہوا؟
- انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل کب، کیوں اور کیسے ہوئی؟
- نظام کائنات کے اندر موجود عدل و مساوات کے رنگا رنگ مناظر کو انسان نے کیسے کیسے روپ دیئے؟
- حقوق انسانی اور فرائض انسانی کی تشریح و توضیح مذاہب انسانی میں کیا ہے؟
- اسلام میں حقوق انسانی کی غرض و غایت اور اس کی انقلابی اصلاحات کیا ہیں؟
- دنیائے عالم میں حقوق انسانی کا احترام کیسے، کیوں اور کب پیدا ہوا؟
- پاکستان میں حقوقِ انسانی کی صورتحال کا کیا منظر ہے؟
- ان سب سوالات کا جواب آپ کو اس عظیم نمبر میں ملے گا جو سیارہ ڈائجسٹ کی ایک عظیم روایت کا دلکش اور اچھوتا اقدام ہے۔

قیمت: 160 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 042-37245412

اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ ماسٹر ریاض ہی ہے۔
وہ ایک منیاری والے کی دکان پر کھڑا تھا۔ بڑی جلدی جلدی اُس نے دکاندار سے ایک دو چیزیں خریدیں اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ ماسٹر ریاض کی خریداری دیکھ کر میرا ماتھا بُری طرح ٹھنکا۔ اس نے جو اشیاء خریدیں وہ زنانہ استعمال کی تھیں۔ میں تمام اشیاء تو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا لیکن سرخ رنگ کا ایک پراندہ اور دوپٹے کو لگانے والی ایک لیس مجھے دُور سے ہی نظر آئی تھی۔ نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ ماسٹر ریاض کا پیچھا کروں۔ میں مناسب فاصلہ رکھ کر ماسٹر کے پیچھے چل دیا۔ اُس کی چال ڈھال سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اپنی خریداری مکمل کرچکا ہے اور اب اُسے میلے کی گہما گہمی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میرا ایک حوالدار بھی میرے اردگرد موجود تھا۔ میرا انداز دیکھ کر بھانپ گیا کہ مجھے کوئی مشکوک بندہ نظر آگیا ہے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہم ماسٹر ریاض کے پیچھے چلتے میلے کی گہما گہمی سے باہر نکل آئے۔ سائیکل سٹینڈ سے ماسٹر ریاض نے اپنی سائیکل نکالی اور روانہ ہوگیا۔ قریب ہی ایک تانگہ کھڑا تھا۔ تانگہ بان جانڈی پورا گاؤں ہی کا تھا۔ میں حوالدار کے ساتھ فوراً تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگہ بان سے کہا کہ ماسٹر ریاض کا پیچھا کرے تانگہ بان میرے اس حکم پر حیران ہوا تاہم اس نے اپنی حیرت کا اظہار زبان سے نہیں کیا۔

جیسا ہم میلے سے نکلے شام ہونے والی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج غروب ہوگیا اور کھیت کھلیان تاریکی میں ڈوب گئے۔ میں اور حوالدار تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے لہٰذا اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ ماسٹر ریاض ہمیں دیکھ سکے گا تاریکی پھیلنے کے بعد تو یہ امکان بالکل ختم ہوگیا تھا۔ ماسٹر ریاض کے رُخ سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ نہر پار کے گاؤں ''سلطان کے'' میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اب مجھے بلال شاہ کی بات یاد آئی۔ ایک روز اُس نے کہا تھا کہ اُس نے ماسٹر ریاض کو سائیکل پر سوار ''سلطان کے'' کی طرف آتے دیکھا تھا۔

نجانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا کہ ماسٹر ریاض کے کسی اہم راز سے پردہ اُٹھنے والا ہے۔ تانگہ بان نے میری ہدایات کے مطابق ماسٹر ریاض کا تعاقب کامیابی سے جاری رکھا۔ ہم ایک گھنٹے کے اندر اندر نہر کا پل پار کرکے سلطان کے گاؤں پہنچ گئے۔ سلطان کے کو گاؤں سے زیادہ قصبہ کہنا مناسب رہے گا۔ یہاں کچے مکانوں کی نسبت پختہ اور نیم پختہ مکان زیادہ تھے۔ آبادی دو ڈھائی ہزار نفوس سے کم نہیں تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی فروٹ منڈی بھی تھی۔ اس منڈی کے پاس پہنچ کر ماسٹر ریاض اپنی سائیکل سے اُتر گیا۔ یہاں ایک طرف رہائشی مکانات بھی تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ماسٹر ریاض انہی مکانات میں سے کسی کے اندر جائے گا۔ منڈی کے ناکے پر بہت سے ریڑھے کھڑے تھے۔ سائیکل پر وہ بھاری بھرکم تھیلے لٹک رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ ان میں وہ سامان ہے جو میلے سے خریدا گیا ہے۔ ماسٹر ریاض نے اپنی سائیکل گلی کے پہلے مکان کے سامنے روک کر دو تین مرتبہ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا اور گلی میں جلتے بلب کی روشنی میں مجھے کسی عورت کا ہیولا نظر آیا۔ یقیناً وہ عورت ہی تھی۔ دروازہ کھلنے کا انداز بتارہا تھا کہ وہ عورت پہلے ہی سے منتظر تھی۔ ماسٹر ریاض نے سائیکل کے ہینڈل سے بھاری بھرکم تھیلے اُتار کر عورت کو تھمائے۔ پھر سائیکل بغل میں دبائی اور تین چار سیڑھیاں چڑھ کر خود بھی دروازے میں داخل ہوگیا۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا کہ ماسٹر ریاض کو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ حوالدار اور تانگہ بان میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا

کہ وہ دونوں یہاں میرا انتظار کریں اور میرے واپس آنے تک یہاں سے نہ جائیں۔ اس کے بعد میں اُس مکان کی طرف بڑھا جہاں چند لمحے پہلے ماسٹر ریاض داخل ہوا تھا میں نے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟'' تھوڑی دیر بعد ماسٹر ریاض کی ڈری ڈری آواز آئی۔

''دروازہ کھولو جی، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے'' میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے کی جھری میں سے جھانک کر مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں دروازے کے بالکل ساتھ لگ گیا تاکہ جھانکنے والا میری صورت نہ دیکھ سکے۔ میری دوسری دستک پر ماسٹر ریاض کو دروازہ کھولنا پڑا۔ جونہی ماسٹر ریاض کی شکل نظر آئی میں اُسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟'' ماسٹر ریاض نے سخت گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اُس کے دونوں ہاتھ میرے سینے پر تھے اور وہ مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے پہچان لیا اس کے ساتھ ہی اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈر اور اندیشوں کے گہرے سائے سمٹ آئے، وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے اطمینان سے کہا ''کیا بات ہے میرے جسم سے کرنٹ لگا ہے تمہیں؟'' وہ ہکلایا ''آ...... آپ یہاں انسپکٹر صاحب، لیکن ...... لیکن کس لیے؟''

[illegible] کی آواز [illegible] وہ پردہ [illegible] کی اندر [illegible] تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ لفافے میں کوئی مٹھائی قسم کی شے تھی کیونکہ کاغذ پر چکنائی کے دھبے تھے۔ وہ ایک تصویر کی طرح برآمدے کے در میں کھڑی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ حسین و جمیل ہی نہیں معصوم صورت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا جسم تھا جیسے وہ جیتا جاگتا جسم نہ ہو کسی مصور کا حسین خیال ہو۔ اس کے لمبے سیاہ بال ایک شانے پر آبشار کی طرح گر رہے تھے اور آنکھوں میں کسی بچے کی سی حیرت اور دہشت تھی۔

میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماسٹر ریاض سے کہا ''میرا خیال ہے تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا میں اس لڑکی کے لیے یہاں آیا ہوں''۔

ماسٹر ریاض کا چہرہ ایک دم ہی زرد ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی چکرا کر گر جائے گا۔ لڑکی جلدی سے اندر بھاگ گئی تھی۔ ماسٹر ریاض کچھ دیر خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ اُس کی زبان تک نہیں آ رہے تھے۔ پھر اُس نے بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

''آیئے......انسپکٹر صاحب اندر آجایئے''۔ وہ حیرت انگیز طور پر ٹھہری ہوئی پرسکون آواز میں بولا۔

میں اُس کے عقب میں چلتا مکان کے برآمدے میں پہنچا اور ایک ٹیبل فین کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ویسے میں ماسٹر ریاض کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور گھبراہٹ کی زیادتی میں میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ وہ شریف تھا لیکن جو شریف گھر میں ایک خوبصورت جوان ربیل پال سکتا ہے وہ اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے کوئی بڑا جرم بھی کر سکتا ہے۔

دفعتاً [illegible] دھڑام کی آواز آئی۔ یوں لگا کہ کوئی اپنے پورے وزن کے ساتھ پختہ فرش پر گرا ہے۔ ماسٹر ریاض لپک کے اندر گیا۔ میں نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ کمرے کے عین وسط میں ایک میز تھی میز پر وہ دو تھیلے رکھے تھے جو ماسٹر ریاض میلے سے بھر کر لایا تھا۔ سرخی پاؤڈر، چوڑیاں، چمکیلے گہنے، پراندے، دوپٹے

اور اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں، بہت سا سامان نکلا تھا اُن دو تھیلوں میں سے لیکن جس کے لیے یہ سامان لایا گیا تھا وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی، اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹھائی والا لفافہ گر گیا تھا اور جلیبیاں دُور تک بکھری ہوئی تھیں۔ ماسٹر ریاض نے جیسے تڑپ کر لڑکی کے شانے تھامے اور اُسے جھنجھوڑنے لگا۔ ''تارا......تارا'' وہ اُسے پکارتا جا رہا تھا۔ پھر نہایت بے تابی سے اُس نے لڑکی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ لڑکی کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور سارا جسم لرز رہا تھا۔ ہونٹ عجیب سے انداز میں بھینچ گئے تھے۔

ماسٹر ریاض ہانپتی ہوئی آواز میں بولا ''پھر دورہ پڑ گیا ہے''۔

''کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں دو دفعہ ہو چکا ہے''۔

''کیسے ٹھیک ہوئی تھی؟''

''بس خود بخود ہو گئی تھی'' ماسٹر ریاض نے کہا۔ پھر اُسے شانوں سے تھامتے ہوئے بولا ''آپ اس کی ٹانگیں پکڑیں پنکھے کے سامنے لے چلتے ہیں''۔

ایک طرف سے، میں نے اور دوسری طرف سے ماسٹر ریاض نے اُسے اٹھایا۔ وہ کسی گڑیا ہی کی طرح ہلکی پھلکی اور لچکدار تھی۔ جب میں نے اس کی ٹانگیں پکڑیں میری نگاہ اُس کی جُوتی پر پڑی۔ یہ بالکل نئے فیشن کی جوتی تھی یوں لگتا تھا کہ پہننے والے نے جُوتی کی بجائے کسی مچھلی میں پاؤں گھسیڑا ہوا ہے۔ ہم نے اُسے برآمدے میں لا کر پنکھے کے عین سامنے چارپائی پر ڈال دیا۔ قمیص اُس کے پیٹ سے اوپر ہوئی تھی۔ دودھیا بدن چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔ ماسٹر ریاض نے اس کی ہتھیلیاں ملنی شروع کیں جبکہ میں اپنے رومال سے اُس کے تلووں کی مالش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی پلکوں میں لرزش ہوئی اور اس نے کراہ کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ ماسٹر ریاض صراحی میں سے ٹھنڈا پانی لے کر آیا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ لینے کے بعد لڑکی کے حواس بحال ہوئے اس نے ایک اجنبی مرد کے سامنے اپنے جسم کو سمیٹنا اور ڈھانپنا شروع کر دیا۔

''ک......کون ہیں یہ؟'' وہ اپنی انگلی میری طرف اٹھا کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ اُس کی آواز بھی اُسی کی طرح نازک اور سریلی تھی۔

''چلو تم اندر چلو'' ماسٹر ریاض سنی اَن سنی کر کے بولا۔ اُس نے شانوں سے تھام کر لڑکی کو اٹھایا اور پھر سہارا دے کر اندر لے گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی تھی۔ کسی قسم کی بیماری یا کمزوری کے آثار اُس میں نظر نہیں آتے تھے۔

ماسٹر ریاض کو واپس آنے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں گھر کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ تین چار مرلے کا نیم پختہ مکان تھا۔ دو کمرے ایک برآمدہ اور چھوٹا سا صحن۔ میں اس وقت برآمدے میں بیٹھا تھا۔ یہاں ٹیبل فین کے سامنے ساتھ ساتھ دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان چارپائیوں پر ماسٹر ریاض اور تارا نامی اُس لڑکی کو سونا تھا۔ ساتھ ساتھ بچھی ہوئی یہ چارپائیاں مجھے بہت کچھ سمجھا رہی تھیں۔

ماسٹر ریاض کمرے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا ''انسپکٹر صاحب! مجھے نہیں معلوم کہ آپ میرے پیچھے کیوں لگے اور کیا سوچ رہے ہیں میرے بارے میں لیکن میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گا سچ بتاؤں گا' شاید آپ میرے گھر پر چھاپہ نہ مارتے تو بھی میں چند روز تک خود تھانے پہنچ کر آپ کو سب کچھ بتا دیتا اور میں یونہی خالی خولی بات نہیں کر رہا۔ چانڈی پورا کے رہنے والے جانتے ہیں کہ میں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی سچ بولا ہے''۔ اس

نے جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر گردن اور سینے سے پسینہ پونچھا اور بولا ''اُس لڑکی سے میری پہلی ملاقات کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے ہوئی تھی۔ آپ نے میرا گھر دیکھا ہی ہوا ہے۔ گھر کے پچھواڑے میں کھیت ہیں اور میں نے اس طرف بھی ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا ہوا ہے۔ اُس رات تیز آندھی کے بعد بارش ہوئی تھی اور میں چھت سے نیچے کمرے میں آکر سوگیا تھا۔ کوئی دو ڈھائی بجے کا وقت ہوگا۔ اس چھوٹے دروازے پر دستک ہوئی جو کھیتوں کی طرف کھلتا ہے۔ میں نے اُٹھ کر کنڈی اُتاری، میرے سامنے یہی تارا نامی لڑکی ہانپتی کانپتی کھڑی تھی۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا یہ تیزی سے اندر آگئی اور خود ہی دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی چڑھادی۔ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہنے لگی کہ میرے پیچھے غنڈے لگے ہوئے ہیں مجھے پناہ دو۔ میں نے کہا ''میں کیسے پناہ دے دُوں مجھے کیا معلوم کہ کہاں سے آئی ہو تم اور کون ہو؟'' وہ ہکلا کر بولی ''میں سچ کہتی ہوں کہ سخت مصیبت میں ہوں اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو صبح میری لاش کسی کھیت میں پڑی ملے گی''۔

میں نے کہا ''میں تمہیں مسجد میں لے جاسکتا ہوں یا امام مسجد کے گھر میں چھوڑ آتا ہوں۔ اس گھر میں میں اکیلا رہتا ہوں اس لیے تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا''۔

ایک دم اُس کی حالت غیر ہونے لگی اور اُسے دورہ پڑگیا۔ میں بڑی مشکل اور کوشش سے اُسے ہوش میں لایا۔ وہ شکل و صورت سے گجراتی لگتی تھی لیکن لباس پنجابیوں والا تھا اور ٹوٹی پھوٹی پنجابی بھی بول لیتی تھی۔ وہ جتنی خوبصورت ہے اُس سے زیادہ بھولی اور معصوم ہے۔ اُس کی باتیں سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ اُسے کوئی بھی شخص آسانی سے ورغلا کر اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔ میں نے اُس کا اتہ پتہ پوچھا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچی ہے وہ کچھ بھی بتانے پر تیار نہیں تھی۔ اگر میں زیادہ اصرار کرتا تھا تو رونے لگتی تھی۔ تین چار دن میں ہی وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہوگئی کہ میرے لیے اُسے تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑنا مشکل ہوگیا۔ بس وہ بار بار ایک ہی بات کہتی تھی اور اب بھی کہہ رہی ہے میں آپ کے گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ زبردستی کریں گے تو اُسی وقت جان دے دوں گی۔ اُس کے پاس ایک پڑیا میں سنکھیا ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے لیا ہے اُس نے۔ پڑیا کو اپنے لباس کے اندرونی حصے میں چھپا کر رکھتی ہے کہتی ہے کہ فوراً یہ سنکھیا کھالوں گی۔

ماسٹر ریاض کے لب و لہجے میں سچائی جھلک رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ لیکن تم تو نادان نہیں تھے۔ تمہیں پتہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ کتنا بڑا اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔ بجائے اس کے کہ تم پولیس کو اطلاع کرکے اپنا قانونی فرض پورا کرتے تم نے اسے دس بارہ روز گھر میں چھپائے رکھا اور جب تمہیں خطرہ محسوس ہوا کہ بھید کھل جائے گا تو اسے لے کر یہاں ''سلطان کے'' آگئے اور کرائے کا مکان لے لیا''۔

ماسٹر ریاض نے بے بسی سے سر ہلایا ''انسپکٹر نواز! تم سمجھ نہیں رہے ہو کہ میرے لیے کتنی مشکل بنی ہوئی تھی۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ لڑکی وہی کرتی جو کہہ رہی ہے میں نے بتایا ہے ناں کہ یہ جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی نادان اور جذباتی بھی ہے۔ تم خود اُس سے بات چیت کرکے دیکھ لو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کیا چیز ہے وہ''۔

میں نے کہا ''بات چیت تو میں کروں گا لیکن تم بھی بتاؤ ناں کہ اُس کے ساتھ کس حیثیت سے رہ رہے ہو؟''

میں نے پہلی بار ماسٹر ریاض کے چہرے پر رنگ سا لہراتے دیکھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا ''ابھی

تک تو کوئی حیثیت نہیں"۔

میں نے کہا" یہ کیسے ہوسکتا ہے آخر تم نے یہ مکان کرائے پر لیا ہے۔ مالک مکان یا محلے والوں کو کچھ تو بتایا ہوگا کہ یہ لڑکی تمہاری کون ہے"۔

ماسٹر ریاض نے کہا کہ" لوگوں کی نظر میں تو ......ہم میاں بیوی ہیں"۔

ماسٹر ریاض کے اعتراف کے بعد میں نے لڑکی سے گفتگو کی۔ اُسے دیکھ کر ایک چھوٹی سی ڈری سہمی ہوئی چڑیا کا خیال آتا تھا یا پھر کانچ کی ایک نازک گڑیا جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتی تھی۔ اُس نے اپنی ساری ڈوریں ماسٹر ریاض کے ہاتھ میں تھما رکھی تھیں اور اُس کی ہر بات پر" جی جی" کہنا اُس کی عادت ہوگئی تھی۔ ماسٹر ریاض نے کہا کہ" برآمدے میں آؤ" وہ آگئی۔ ماسٹر ریاض نے کہا" بیٹھ جاؤ" وہ بیٹھ گئی۔ ماسٹر ریاض نے کہا" سیدھی ہوکر آرام سے بیٹھو" وہ سیدھی ہوکر آرام سے بیٹھ گئی۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے میرے مختلف سوالوں کے جواب دیتی رہی لیکن جونہی میں نے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور اس کے وارث کون ہیں؟ وہ چپ ہوگئی۔ ماسٹر ریاض نے بتایا تھا کہ کوشش کے باوجود اس چپ کو نہیں توڑ سکا اور جب وہ نہیں توڑ سکا تو میں کس گنتی میں تھا۔ ہم اُس پر زیادہ دباؤ بھی نہیں ڈال سکتے تھے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے بڑی مشکل سے [illegible] آئے تھے۔

[illegible] تھی وہ اور [illegible] سے [illegible] لگتا تھا کہ یہ شخص [illegible] سے اس کی سفارش کر رہا ہے اور اس سفارش کی وجہ سے سنگدل شخص بھی اس لڑکی پر سختی نہیں کر سکتا۔ کسی حد تک ماسٹر ریاض کی مجبوری بھی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ فطرتاً ایک رحمدل شخص تھا۔ اس کے لیے بے حد مشکل تھا کہ وہ ایک بے سہارا کمزور لڑکی کو گلی کوچوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ ماسٹر ریاض کی پناہ سے محروم ہوکر وہ خودکشی ہی کرلیتی۔

میں نے وقتی طور پر لڑکی کو اُس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ماسٹر ریاض سے کہا کہ وہ اگلے روز تھانے آکر مجھ سے ملے ......اگلے روز ماسٹر ریاض آیا تو میں نے اسے سمجھایا کہ وہ پیار محبت اور نرمی کے ساتھ تارا سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرے اور اس دوران اُن لوگوں سے بھی باخبر رہے جو بقول تارا اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔

بلال شاہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اُس کا اندازہ درست ثابت ہوا ہے اور ماسٹر ریاض کے گھر سے پھڈا، نکل آیا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ اپنی اس ذہانت کا ڈھنڈورا ہر کس و ناکس کے سامنے پیٹ ڈالے گا۔ میں نے اُسے تنہائی میں بٹھا کر اچھی طرح یہ بات سمجھادی کہ فی الحال ماسٹر ریاض اور لڑکی کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ یہی بات میں نے اپنے ساتھ جانے والے تانگہ بان اور حوالدار سے بھی کردی۔

قریباً ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ ماسٹر ریاض اکثر [illegible] پورا گاؤں سے غائب رہتا تھا۔ اس نے دوست احباب کو بتا رکھا تھا کہ وہ امرتسر میں اپنی بہن کے گھر رہتا ہے اور اس کی بچیوں کو ایف اے کی تیاری [illegible] ہے۔ سکولوں میں چونکہ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں لہٰذا اس کا بہانہ کہ [illegible] رہتا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ ماسٹر ریاض اکثر مجھ سے ملنے آتا رہتا تھا۔ میں نے اُس پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ماسٹر ریاض ایک زبردست امتحان سے گزر رہا ہے۔ ایک کشمکش سی تھی جس میں وہ دن رات مبتلا رہتا تھا۔ وہ ایک پچاس سالہ کنوارا تھا۔ اب تک زندگی کی رنگینیوں سے بہت دور رہا تھا۔ اُس نے

دھیرے دھیرے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا اور خودکو ایک ایسی ڈگر پر لے گیا تھا جہاں شاید اُسے عورت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن اب ایک عورت اُس کی اجاڑ سنسان زندگی میں آئی تھی اور عورت بھی ایسی جسے دیکھ کر سوسالہ زاہد خشک بھی توبہ توڑنے پر مجبور ہو جائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ لڑکی ایک دھیمی دھیمی آگ کی طرح اُس برف کو پگھلا رہی ہے جو تیس سال سے ماسٹر ریاض کے سینے میں جمی ہوئی تھی۔ ماسٹر ریاض ایک بہت بڑے برفانی تودے کی طرح سخت اور اٹل تھا۔ بہت سی جوان اور نوجوان لڑکیوں نے اس تودے کو اپنے شباب کی کرنوں سے پگھلانا چاہا تھا۔ لیکن ناکام رہی تھیں لیکن اب اس تودے کے ”قدم“ اُکھڑ چکے تھے اور وہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ پانی بنتا جا رہا تھا۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ماسٹر ریاض کی سخت جانی تھی کہ وہ بھاپ بن کر اڑ نہیں گیا تھا ورنہ تارا جیسی حسین لڑکی کے ساتھ ایک تنہا مکان میں رات گزارنا اُس کی چارپائی کے ساتھ چارپائی بچھا کر سونا اور صبح اپنا ایمان سلامت لے کر اُٹھ جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ آخر ساون کی ایک بڑی سہانی شام کو ماسٹر ریاض نے ہتھیار ڈال دیئے۔ رات سے بارش ہو رہی تھی۔ کھیتوں، کھلیانوں، گلیوں، مکانوں میں ہر طرف جل تھل نظر آ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ماسٹر ریاض چھتری لیے تھانے میں داخل ہوا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی نفیس داڑھی بڑی خوبصورتی سے ترشی ہوئی تھی۔ بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اُس نے کیچڑ سے بچنے کے لیے لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔

میں نے اس کے لیے گرما گرم چائے اور بسکٹ وغیرہ منگوائے۔ وہ بہت کھویا کھویا نظر آتا تھا، آنکھوں میں رتجگے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک طویل سانس لے کر بولا ”انسپکٹر نواز! اس تارا سے شادی کرنا چاہتا ہوں“۔

یہ فقرہ اُس کی شکست کا اعتراف تھا جس سے ماسٹر ریاض پچھلے تیس برس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ فقرہ جلد یا بدیر ماسٹر ریاض کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا ہے لہٰذا مجھے یہ فقرہ سن کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ”لیکن ماسٹر ریاض! وہ تو تم سے تیں پینتیس برس چھوٹی ہے“۔

”وہ بولا“ یہ بات میں اُس سے سینکڑوں مرتبہ کہہ چکا ہوں اور وہ باتیں بھی کہہ دی ہیں جو اس وقت تمہارے ذہن میں سر اٹھا رہی ہوں گی، یعنی یہ کہ اُس کا اتہ پتہ کیا ہے، اُس کا ماضی کیا ہے، اس کے والدین کہاں ہیں لیکن وہ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں بتا رہی کہ وہ مسلمان ہے، اُس کا نام طاہرہ عرف تارا ہے وہ غیر شادی شدہ ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے......“ ماسٹر ریاض نے حسب عادت جیب سے سفید رومال نکال کر اپنے چہرے سے پانی پوچھا اور بولا ”انسپکٹر صاحب! آخر میں بھی انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ مجھے خوف آ رہا ہے کہ مجھ سے بھی کوئی ایسی خطا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے مجھے ساری عمر آنسو بہانے پڑیں۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ اُس لڑکی سے جان چھڑا لوں یا اُس سے شادی کر لوں“۔

میں نے کہا ”ماسٹر ریاض، لڑکی بالغ اور خود مختار ہے اگر وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے اور تم بھی اس سے شادی کرنا چاہتے ہوں تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ ایک بار اچھی طرح سوچ سمجھ لو“۔

وہ بولا ”سوچ سمجھ کر ہی بات کی ہے“۔

میں نے اپنی مسکراہٹ کو بمشکل ہونٹوں تک آنے سے روکا۔ ماسٹر ریاض جیسا پتھر دل مرد پچاس سال کی عمر میں ایک نازک سی لڑکی کے ہاتھوں چاروں

شانے چت، ہوگیا تھا۔ میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "ماسٹر ریاض ایک بات تو بتاؤ؟"۔

"پوچھو" ماسٹر ریاض نے بھی جوابی طور پر سگریٹ سلگالیا۔

میں نے کہا "تم نے اپنی ساری جوانی عورت سے دُور رہ کر گزار دی۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی"

وہ بولا "کہانیاں تو لوگوں نے بہت سی گھڑ رکھی ہیں...... لیکن سچی اور مختصر بات یہی ہے کہ میں اپنی پھوپھی زاد سے شادی کرنا چاہتا تھا یہ شادی نہ ہوسکی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ شادی نہیں کروں گا"۔

"پھر اب کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لڑکی میں مجھے وہ بات نظر آگئی ہے جسے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس گئی تھیں"۔

"میں کچھ سمجھا نہیں"۔

ماسٹر ریاض نے ایک گہرا کش لے کر کہا "نجمہ بے حد چالاک، ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی تھی اُس کی ماں یعنی میری پھوپھی میں بھی یہ ساری صفات موجود تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نجمہ سے میری شادی نہ ہونے میں صرف زمانے کا قصور نہیں اُس میں نجمہ بھی بڑی حد تک شریک تھی۔ وہ اپنی ماں کے کہے کو حکم کا درجہ دیتی تھی اور اُس کی ماں نے کہہ دیا تھا کہ ریاض جائیداد کا مقدمہ ہار جائے گا اور اُسے اپنے باپ کے ترکے میں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ اُس کی ماں بڑی جہاندیدہ عورت تھی۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا مجھے جائیداد میں سے پھوٹی کوڑی نہیں ملی لیکن جہاں بہت سوچ سمجھ کر اُس نے بیٹی کی شادی کی وہاں کون سی دودھ کی نہریں بہہ نکلیں۔ نجمہ کا شوہر امرتسر میں کاروبار کرتا تھا۔ اُس کے کارخانے میں آگ بجھانے والے آلات اور سلنڈر وغیرہ بنتے تھے۔ ایک روز اُسی کارخانے میں آگ لگ گئی۔ لاکھوں کا کاروبار جل کر خاک ہوگیا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے وہ لوگ۔ میں نے جائیداد کھو کر بھی اپنا حوصلہ نہ کھویا اور اپنی محنت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔ سکول کی زمین میں نے اپنی محنت کی کمائی سے خریدی اور اسی کمائی سے عمارت کھڑی کی۔ اب تک ہزاروں بچے اس سکول سے علم کی روشنی حاصل کر چکے ہیں اور انشاء اللہ ہزاروں آئندہ کریں گے......" سگریٹ کو پاؤں تلے مسل کر ماسٹر ریاض نے کہا "درحقیقت مجھے نجمہ اور خاص طور پر اُس کی ماں سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ نفرت میرے اندر جڑ پکڑ گئی مجھے عورت کی چالاکی، ہوشیاری اور دوغلے پن سے گھن آنے لگی۔ اگر مجھے کوئی سیدھی سادی عام عورت بھی ملتی تو میں اُس میں عقلمندی اور چالاکی کے جراثیم ڈھونڈ لیتا اور اُس سے نفرت کرنے لگتا اور میں سچ کہتا ہوں میں نے سیدھی سادی معصوم عورتیں دیکھی بھی بہت کم ہیں۔ جو نظر آتی ہیں وہ اکثر ایسی نہیں ہوتیں۔ عورت فطرتاً خرانٹ اور دُور اندیش ہے، مرد عام طور پر جذباتی اور نادان ہوتے ہیں......میرے من کے مندر میں ایک معصوم اور حد سے زیادہ بھولی بھالی لڑکی کی مورت سجی تھی اور میں اُس کا پجاری ہوں"۔

ماسٹر ریاض بڑے جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔ اُس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے۔ وہ کہنے لگا "میں نے بہت غور کیا ہے انسپکٹر نواز اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے قدرت کی طرف سے ہو رہا ہے اور اُسی کی دین ہے، ورنہ میں اس قابل کہاں تھا کہ تارا جیسی لڑکی مجھ جیسے بڈھے کو پسند کرتی، شادی پر اصرار کرتی، اور شادی نہ ہونے کی صورت میں خودکشی پر کمربستہ ہو جاتی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ قدرت نے اب میرے دل میں اُس لڑکی کی محبت ڈال دی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں انسپکٹر! کہ پچھلے تین ماہ میں میں نے اپنے

خدا نے دینِ اسلام میں تنگی نہیں بلکہ آسانیاں پیدا کی ہیں
سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور دینی پیشکش
فہم دین نمبر
شائع ہو گیا ہے
قیمت: 160 روپے
سماجی زندگی کو درپیش چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر عبادات کے بنیادی مسائل تک ـــــ
ہر مسئلے کا قرآن و حدیث کی روشنی میں انتہائی آسان الفاظ میں حل
اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں
سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ
ریواز گارڈن لاہور۔ فون 7245412

ساتھ ایک زبردست جنگ لڑی ہے۔ بہت زور مارا ہے لیکن تارا کی محبت کے جال سے نکل نہیں سکا''۔

....

ایک ہفتے بعد ماسٹر ریاض اور تارا کی شادی نہایت خاموشی اور سادگی سے ہوگئی۔ ماسٹر ریاض کے چند قریبی دوستوں اور عزیزوں نے ہی اس شادی میں شرکت کی۔ اگلے روز ماسٹر ریاض نے چھوٹا سا ولیمہ کردیا۔ یوں ایک نیا گھر آباد ہوگیا اور ماسٹر ریاض کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آگئی۔

میں نے اس شادی کے سلسلے میں ماسٹر ریاض سے ہر طرح کا تعاون کیا تھا۔ دیکھا دیکھی گاؤں کے چند معتبر لوگ بھی اس تقریب میں پیش پیش نظر آنے لگے تھے لیکن گاؤں کی اکثریت ماسٹر ریاض کو تمسخر اور طنز کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں۔ کسی نے کہا ''بوڑھا گھوڑا لال لگام'' کوئی بولا ''بیٹی سے چھوٹی عمر کی لڑکی سے شادی رچالی ہے'' کسی نے طعنہ دیا کہ شادی سے پہلے ہی ماسٹر صاحب دل پشاوری کررہے تھے۔ بہرحال سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ ماسٹر ریاض نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ تارا سے شادی کے لیے اُس نے تمام اخلاقی اور قانونی تقاضے پورے کیے تھے۔ اب ''میاں بیوی'' راضی تھے۔ اس لیے ''قاضی'' نے اور لوگوں نے کیا کرنا تھا۔ دھیرے دھیرے خود ہی لوگوں کے منہ بند ہو گئے۔ جو چند ایک رہ گئے اُن کے منہ تارا کے حُسن اخلاق اور ماسٹر ریاض کی ملنساری نے بند کردیئے۔

عمروں میں بہت فرق ہونے کے باوجود وہ دونوں ایک مثالی جوڑا نظر آرہے تھے۔ بلال شاہ چونکہ اُن دونوں کا ہمسایہ تھا لہٰذا اس کی زبانی مجھے اکثر ماسٹر ریاض اور تارا کے حالات کا علم ہوتا تھا۔

تارا نے ماسٹر ریاض کا گھر آئینے کی طرح چمکا دیا تھا اور اس جگمگاتے گھر میں وہ کسی رنگین تتلی کی مانند لہراتی پھرتی تھی۔ محلے بھر کی عورتیں اُس گھر کی معصومیت اور سادگی کی گرویدہ تھیں اور ماسٹر ریاض تو جیسے اُس میں کھو کر رہ گیا تھا۔ وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا اور ایسا سمجھ کر وہ کوئی غلطی نہیں کررہا تھا۔ اس عمر میں اتنی خوبصورت خوش اخلاق اور راہوں میں آنکھیں بچھانے والی بیوی کا مل جانا خوش بختی نہیں تو اور کیا تھا۔

بلال شاہ کا جل جل کر اور کُوھ کُوھ کر بُرا حال تھا۔ گھر والی سے اُس کے تعلقات پہلے بھی کچھ اتنے اچھے نہیں تھے اب اور کشیدہ ہوگئے تھے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ خوش باش پڑوسی ہی تھے۔ وہ بیوی کو ہر وقت پڑوسیوں کی مثالیں دیتا تھا جواب میں وہ بھی اُسے پڑوسیوں کی مثالیں دیتی تھی کبھی کبھی یہ لفظی جنگ خطرناک صورت اختیار کر جاتی تھی اور بلال شاہ کو دو تین دن تھانے میں یا مسجد میں سونا پڑتا تھا۔ وہ سنجیدگی سے غور کررہا تھا کہ ایک اور شادی کرلے۔ اگر ماسٹر ریاض کو اس عمر میں تارا جیسی بیوی مل سکتی تھی تو اُسے بھی کوئی ''درمیانی'' سی ہاتھ لگ سکتی تھی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگا ''خان صاحب! آپ کے سر کی قسم میں بہت...... بہت سنجیدگی سے غور کررہا ہوں کہ دوسری شادی کرلوں۔ مجھے ذہنی سکون کی ضرورت ہے اور یقین کریں یہ سکون مجھے اس گھر میں نہیں مل سکتا۔ پتہ نہیں کون سا گناہ آگے آیا ہے کہ یہ عورت میرے پلے پڑی ہے۔ نہ شکل نہ عقل، نہ موت، بات کرو تو کھانے کو دوڑتی ہے۔ ہر وقت سر پر دوپٹہ باندھے مُردار کی طرح پڑی رہتی ہے''۔

میں نے کہا ''تم نے پھر بھی اُس میں سے درجن کے قریب بچے پیدا کرلیے ہیں''۔

وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا ''بچوں کا کیا ہے جی وہ تو

گائے بھینسوں کے بھی ہو جاتے ہیں اصل چیز ہوتی ہے آپس کی محبت، اور...... اور ذہنی سکون اب ماسٹر ریاض کو ہی دیکھیں......"۔

"بس، بس" میں نے اُس کی بات کاٹی "آدھے گھنٹے میں یہ تم دسویں دفعہ ماسٹر ریاض کی مثال دینے لگے ہو۔ بھائی میرے وہ نئی نئی شادی ہے اور پھر دونوں سمجھ دار ہیں تمہارا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں"۔

"دونوں سمجھ دار ہیں کیا مطلب...؟" بلال شاہ نے آنکھیں نکالیں "کیا آپ مجھے بے وقوف سمجھ رہے ہیں"۔
میں نے کہا "نہیں تمہاری نہیں تمہاری گھر والی کی بات کر رہا ہوں"۔

بلال شاہ منہ بنا کر بولا "خان صاحب! آپ جان بوجھ کر ایسی بات کرتے ہیں جس کے دو مطلب نکلیں، بہرحال میں نے اپنے دل کی بات آپ کو بتا دی ہے، میں بہت سنجیدگی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں"۔

....

ڈیڑھ دو ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک کیس کے سلسلے میں میرا امرتسر جانا ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا بڑا خوشگوار موسم تھا۔ امرتسر مرکزی تھانے جانے کے لیے میں پیدل ہی کمپنی باغ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دفعتاً ایک عورت پر میری نگاہ پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ سیاہ ریشمی برقعے میں لپٹی تیزی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی سڑک پار کر رہی تھی۔ وہ کوئی نوجوان لڑکی نظر آتی تھی اسے دیکھ کر میرے چونکنے کی وجہ لڑکی کی باریک اونچی ایڑی والی سینڈل تھی۔ اس مچھلی نما سینڈل کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ چند ماہ پہلے جب "سلطان کے" کے مکان میں تارا بے ہوش ہوگئی تھی اور میں نے ماسٹر ریاض کے ساتھ مل کر اُسے بستر پر لٹایا تھا تو اس عجیب وغریب سینڈلوں پر میری نگاہ پڑی تھی پلک جھپکتے میں یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ برقعے میں لپٹی ہوئی لڑکی طاہرہ ریاض ہے۔ اگلا منظر دیکھ کر مجھے پھر چونکنا پڑا۔ طاہرہ عرف تارا سڑک پار کرکے ایک ریستوران کے سامنے پہنچی۔ یہاں سرخ وسپید رنگ کا ایک اُدھیڑ عمر شخص کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ تارا کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔ اُس کے قریب پہنچ کر تارا نے کوئی بات کی۔ وہ مسکرایا اور تارا کو لے کر ریستوران کے اندر چلا گیا۔ یہ عام ریستوران تھا۔ باہر چولہوں پر بہت سے دیگچے رکھے تھے اور ایک طرف تندور پر گرم گرم روٹیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب میں ریستوران کے سامنے کھڑا رہا پھر محتاط انداز میں آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔ میں چونکہ سادہ لباس میں تھا اس لیے کسی نے میری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ ریستوران کے ہال نما کمرے میں بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے لیکن تارا اور ادھیڑ عمر شخص کہیں دکھائی نہیں دیے۔ پھر میری نگاہ فیملی کیبنوں پر پڑی۔ ایک کیبن کے دروازے پر پردہ جھول رہا تھا۔ پردے کے نیچے سے مجھے کالے برقعے کا کچھ حصہ اور وہی جوتی نظر آئی جس نے مجھے شک میں مبتلا کیا تھا۔ تارا اور ادھیڑ عمر شخص فیملی کیبن میں موجود تھے۔ میں باہر آ کر ایک بس سٹاپ پر کھڑا ہوگیا اور اُن دونوں کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قریباً ایک گھنٹے بعد فارغ ہوئے۔ پہلے ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا اُس نے سڑک کنارے کھڑے ہوکر ایک موٹر رکشا رکوایا۔ بعدازاں وہ اندر جا کر تارا کو لے آیا۔ اُسے رکشے میں سوار کرانے کے بعد وہ خود بس سٹاپ کی طرف چلا آیا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی اگر وہ بس پر سوار ہوتا تو اُس کا تعاقب کیا جاسکتا تھا لیکن اچانک بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اُس میں سوار ہوا ہوگیا۔

اُس روز جانڈی پورا واپس پہنچ کر میں نے تارا کا پتہ کروایا تو وہ گھر میں تھی لیکن یہ بھی پتہ چلا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے کہیں سے آئی ہے۔ یہ معلومات مجھے بلال شاہ نے فراہم کی تھیں۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ مکمل تفصیل معلوم کرے اور پتہ چلائے کہ ماسٹر ریاض آج کہاں تھا اور تارا کہاں سے ہوکر آئی ہے۔ بلال شاہ ایسے کاموں میں بڑی پھرتی دکھایا کرتا تھا۔ اُس نے ایک گھنٹہ کے اندر اندر ساری بات معلوم کرلی۔ اس کی ''تفتیش'' کے مطابق ماسٹر ریاض اپنے سکول میں ایک بڑا جلسہ کررہا تھا۔ اس جلسے میں وہ ایک صوبائی وزیر کو مہمان خصوصی بنانا چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ لاہور گیا ہوا تھا۔ لاہور جاتے جاتے وہ تارا کو امرتسر میں اپنی بہن صادقہ کے پاس چھوڑ گیا تھا اور اپنے بھانجے کو کہہ گیا تھا کہ اگر وہ اگلے دن سہ پہر تک واپس نہ آسکا تو وہ اپنی ممانی یعنی تارا کو جانڈی پورا چھوڑ آئے۔ اب تارا اپنے بھانجے کے ساتھ ہی واپس جانڈی پورا پہنچی تھی۔

اس ساری رُوداد میں کہیں اُس اُدھیڑ عمر شخص کا ذکر نہیں تھا جو آج دوپہر کمپنی باغ کے سامنے تارا سے ایک ریستوران میں ملا تھا اور ایک گھنٹہ تنہائی میں اُس کے ساتھ رہا۔ ایک دم مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے تارا وہ نہیں جو دکھائی دے رہی ہے۔ وہ اپنی بھولی بھالی صورت کا فائدہ اٹھا رہی ہے ورنہ اس کے اندر ایک عورت چھپی ہوئی ہے یہ عورت، نظر آنے والی عورت سے بہت مختلف ہے۔

یہ بات تو میرے علاوہ ماسٹر ریاض بھی جانتا تھا......اور سب لوگ جانتے تھے کہ تارا کا ماضی پردہ راز میں ہے لیکن تارا کی اصلیت اتنی جلدی ظاہر ہو جائے گی کم از کم مجھے اُمید نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تارا پر گہری نگاہ رکھی جائے۔ یہ نہ ہو کہ یہ پُراسرار لڑکی ماسٹر ریاض کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسا کام کر جائے جس کے لیے ہمیں دیر تک پچھتانا پڑے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ماسٹر ریاض کو ابھی کچھ نہ بتاؤں۔ اس مرحلے میں ابھی کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا اور جب تک میں خود حتمی نتیجے پر نہ پہنچ جاتا میں ماسٹر ریاض کے آنگن میں آئی ہوئی بہار کو خزاں میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔

تارا پر نگاہ رکھنے کے لیے بلال شاہ سے موزوں شخص اور کون ہوسکتا تھا۔ میں نے بلال شاہ کو بلا کر حقیقت حال سے آگاہ کیا اور اُسے کہا کہ وہ تارا کے روزہ مرہ معمولات پر گہری نظر رکھے۔ حالات کی اس تبدیلی سے بلال شاہ کے ارادے بھی کچھ ڈانواں ڈول ہوگئے تھے اور وہ جو دوسری شادی کے سلسلے میں بڑا پُرجوش نظر آتا تھا کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ غالباً سوچنے لگا تھا کہ گھر والی جیسی بھی ہے بھلی مانس اور عزت کی رکھوالی تو ہے۔ یا پھر کوئی اور بات اُس کے ذہن میں آگئی تھی۔

ایک دن بلال شاہ تھانے میں آیا تو جوش سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی اُس نے بڑے دھڑلے سے سنتری کو دو گلاس ٹھنڈا دودھ لانے کا آرڈر دے دیا۔ اس دیدہ دلیری کا ایک ہی مطلب تھا اُس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ وہ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر جب اُس نے دودھ پی لیا اور دودھ میں ڈوبی ہوئی مونچھوں کو اچھی طرح چوس لیا تو اصل موضوع پر آگیا۔ اُس نے اُٹھ کر دفتر کا دروازہ اندر سے بند کیا اور بولا'' خان صاحب! مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ یہ جو اتنی خوبصورت جوان لڑکی پکے ہوئے پھل کی طرح ماسٹر کی جھولی میں آن گری ہے ضرور اس میں کوئی چکر ہے۔ توبہ......توبہ۔ آج اپنی اِن گناہ گار آنکھوں سے میں نے جو کچھ دیکھا ہے آپ دیکھتے تو چکرا کر رہ جاتے۔ استغفار......کوئی حد ہوتی ہے بے حیائی اور بے غیرتی کی'' وہ بار بار

اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

میں نے کہا ''کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی سسپنس پیدا کرتے جاؤ گے''۔

وہ بولا'' آج پھر ماسٹر ریاض گھر میں نہیں تھا اور آج پھر وہ کنجری ایک یار سے ملنے نکلی تھی...... آج تو شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی ہے جی تو پورا یقین ہوگیا ہے کہ ماسٹر کے گھر کا صفایا کرنے کے ارادے سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ جس روز اسے موقعہ ملا اور لمبا مال اس کے ہاتھ لگ گیا وہ ماسٹر کا صفایا کرکے یہاں سے بھاگ جائے گی''۔

''لیکن تم نے دیکھا کیا ہے؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''اُس بے حیا کے چھن دیکھے ہیں اور کیا'' بلال شاہ نے کہا ''میں نے بتایا ہے ناں کہ ماسٹر ریاض آج گھر میں نہیں تھا وہ کسی دفتری کام سے لاہور گیا ہوا ہے۔اس کے جانے کے دو گھنٹے بعد تارا ایک سہیلی کے ساتھ گھر سے نکلی ۔ اُس کی سہیلی اُسے بس پر چڑھا کر واپس آ گئی۔ یہ امرتسر جانے والی بس تھی ۔ میں بھی نظر بچا کر بس پر سوار ہوگیا اور منہ سر لپیٹ کر ایک پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تارا امرتسر کے لاری اڈے پر اُتری ۔ اڈے کے باہر ایک ہیرو ٹائپ نوجوان چم چم کرتی سرخ گاڑی میں اُس کا انتظار کررہا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ خوش قسمتی سے پاس ہی ایک ٹیکسی کار کھڑی تھی۔ میں اللہ کا نام لے کے، اس میں گھس گیا۔ میں نے ٹیکسی والے پر پولیس کا رُعب ڈالا اور اُس سے کہا کہ وہ کار کا پیچھا کرے۔ ٹیکسی کو زیادہ دیر کار کے پیچھے نہیں بھاگنا پڑا۔ کار والے، نہر کے بڑے پل کے پاس پہنچ کر رُک گئے۔ تارا نے اپنا برقعہ کار کے اندر ہی اُتار کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بھڑکیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور بڑی بنی سنوری نظر آتی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا نہر کے بڑے پل کے پاس ہی ایک باغیچہ ہے۔ اُس میں بچوں کے لیے جھولے وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ تارا اور وہ نوجوان باغیچے میں چلے گئے اور بڑی بے تکلفی سے بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومنے لگے۔ میں زیادہ دیر وہاں نہیں رُک سکا مجھے ڈر تھا کہ تارا کی نظر مجھ پر پڑ جائے گی۔ وہ بڑے معشوقانہ انداز میں نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی۔ اگر رات کا وقت ہوتا تو وہ اُس باغیچے میں نجانے کیا کچھ کر گزرتے ۔ میں واپس آ کر ٹیکسی کار میں بیٹھ گیا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ وہاں سے برآمد ہوئے اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک مارکیٹ سے انہوں نے کچھ خریداری کی۔ ایک شاپ سے سوڈا واٹر پیا اور بڑی آزادی سے کھڑے باتیں کرتے رہے۔ تارا بالکل بدلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا دہلی یا بمبئی کی کوئی فیشن ایبل کالجیٹ لڑکی ہے...... ہاں ایک بات میں بتانا بھول ہی گیا نوجوان جس گاڑی پر گھوم رہا تھا اُس پر دہلی کا نمبر تھا...... تھوڑی دیر مارکیٹ میں رُکنے کے بعد وہ پھر گاڑی میں سوار ہوئے اور لاری اڈے پہنچ گئے۔ نوجوان نے تارا کو بس میں سوار کرایا۔ جب بس چل پڑی تو وہ بھی گاڑی لے کر روانہ ہوگیا۔ اس کا رُخ شہر کے بارونق حصے کی طرف تھا۔ اس مرتبہ اس کا تعاقب کامیابی سے جاری نہ رکھ سکا۔ بڑے ڈاک خانے کے قریب ٹیکسی کار کو ایک اشارے پر رُکنا پڑا اور نوجوان گاڑی سمیت اوجھل ہوگیا''۔

میں نے پوچھا ''تارا اب کہاں ہے؟''

''وہ گھر واپس پہنچ چکی ہے۔ ابھی جب میں آیا ہوں تو وہ دوپٹہ کمر سے باندھے آستینیں چڑھائے بڑے زور وشور سے دیواروں کی لپائی کررہی تھی۔ میں نے اپنی گھر والی سے کہا کہ پوچھ کر آؤ تارا کہاں گئی ہوئی تھی۔ میری گھر والی نے آکر بتایا کہ اُس کا پاؤں بھاری ہے۔ امرتسر ہسپتال میں ایک لیڈی

ڈاکٹر کو دکھانے گئی تھی۔ اس سفید جھوٹ پر میں استغفار پڑھنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا"۔

بلال شاہ ویسے تو ڈینگیں مارتا رہتا تھا لیکن جب کوئی قانونی معاملہ ہوتا تھا، وہ اپنی رپورٹ پوری ایمانداری سے دیتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جو کچھ بتا رہا ہے سچ بتا رہا ہے اور اس "سچ" کے بعد شک شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ تارا دہرے کردار کی مالک تھی۔ اُس کا اصل روپ اپنے اُس روپ سے بہت مختلف تھا جو وہ ماسٹر ریاض کے سامنے پیش کررہی تھی۔

ابھی ہم اس معاملے پر غور وفکر کرہی رہے تھے کہ ایک اور سنگین واقعہ رونما ہوگیا۔ یہ اگلے روز کی بات ہے، صبح سویرے بلال شاہ ایک اخبار تھامے ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس نے تہہ شدہ اخبار میرے سامنے پھینکا اور ایک خبر پر اُنگلی رکھ دی "یہ دیکھیں خان صاحب!" وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔

یہ قتل کی خبر تھی۔ تین کالمی سرخی میں لکھا تھا "امرتسر کے پیراڈائز ہوٹل میں پراسرار قتل۔ کمرہ نمبر 18 کے غسل خانے میں نامعلوم نوجوان کی لاش پائی گئی۔ لاش کی تصویر بھی ساتھ دی گئی تھی۔ ایسی ایک دو خبریں اخبار میں روزانہ ہوتی تھی۔ مجھے بلال شاہ کی پریشانی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا "جناب یہی وہ نوجوان ہے جس سے کل تارا ملی ہے"۔

چند لمحے کے لیے میں بھی سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ کوئی بہت گہرا چکر چلا ہوا ہے۔ عین ممکن تھا کہ نوجوان کے قتل میں تارا کا ہاتھ ہو۔ اگر ایسا تھا تو وہ کسی بھی وقت ماسٹر ریاض کے گھر سے اُڑن چھو ہوسکتی تھی۔ میں نے فوری طور پر سادہ لباس میں دو پولیس والے ماسٹر ریاض کے گھر کی نگرانی پر لگادیے اور خود ایک ہیڈ کانسٹیبل اور بلال شاہ کے ساتھ امرتسر روانہ ہوگیا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب ہم امرتسر کے پیراڈائز ہوٹل میں پہنچے لاش موقعے سے اٹھائی جا چکی تھی اور مقامی پولیس کے اہلکار جائے واردات کا نقشہ تیار کرنے اور ثبوت اٹھانے میں مصروف تھے۔ مقتول کے کمرے میں اُس کا واحد سوٹ کیس کھلا پڑا تھا۔ اس سوٹ کیس میں روزمرہ کے استعمال کا سامان تھا۔ کپڑے کے چند جوڑے، مومی لفافے میں لپٹی ہوئی چپل، صابن، تولیہ، ٹارچ اور گولڈن رنگ کی ایک ولائتی تھرماس۔ تفتیش کرنے والے سب انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا اور بڑی مروت سے پیش آیا۔ اس نے مجھے تمام ضروری تفصیلات سے آگاہ کیا......

واردات کا پتہ سب سے پہلے ہوٹل کے بیرے بھوشن کمار کو چلا تھا۔ وہ شام سے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سن رہا تھا۔ اُس نے دروازے پر کئی بار دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر یوں ہوا کہ پانی کمرے میں پھیل گیا اور دروازے کی نچلی درز سے باہر بہنے لگا۔ اب بھوشن کمار کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ڈپلی کیٹ چابی استعمال کرکے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اُس نے غسل خانے میں امیت مکرجی نامی نوجوان کی برہنہ لاش دیکھی۔ اُس کے منہ اور ناک سے بہنے والا خون دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کی موت زہر خورانی کے سبب ہوئی ہے۔ لاش اس ڈھنگ سے گری تھی کہ غسل خانے سے پانی کی نکاسی کا راستہ جزوی طور پر بند ہوگیا۔ چونکہ شاور کھلا تھا اس لیے پانی پہلے غسل خانے میں جمع ہوتا رہا پھر کمرے کے قالین پر پھیلا اور آخر باہر بہہ نکلا۔

سب انسپکٹر نے بتایا کہ مقتول کی گاڑی نیچے ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اُس میں سے مقتول کا لائسنس بھی ملا ہے۔ لائسنس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق صوبہ گجرات سے ہے۔ یہ گاڑی اُس کی اپنی

نہیں ہے بلکہ اُس نے دہلی میں اپنے کسی جاننے والے سے حاصل کی ہے۔ لائسنس پر مقتول کا مکمل ایڈریس بھی موجود تھا اور پولیس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا کہ وہ اگلے چند گھنٹوں میں مقتول کے وارثوں سے رابطہ قائم کرسکتی۔ اس کیس میں میری دلچسپی اب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے مقامی ڈی ایس پی سے مشورہ کیا اور مشورے میں فیصلہ ہوا کہ اس معاملے کی تحقیق کے لیے میں خود گجرات کے شہر بڑودہ جاؤں گا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ٹیلی فون پر مقتول کے وارثوں کو اطلاع بھی دے دی گئی تھی۔ ایک پولیس پارٹی دہلی روانہ ہوگئی تاکہ اُس شخص سے پوچھ گچھ کی جائے جس کی گاڑی پر مقتول امیت امرتسر پہنچا۔ دوسری پارٹی کے میں ساتھ بڑودہ روانہ ہوگیا۔

....

امرتسر سے گجرات کے شہر بڑودہ تک ریل کا ایک طویل اور کٹھن سفر کرنا پڑتا ہے۔ ہم قریباً 48 گھنٹے بعد بڑودہ پہنچ سکے۔ بڑودہ کی ایک جانب بھڑوچ اور دوسری طرف احمد آباد کے مشہور شہر ہیں۔ بڑودہ خود بھی ایک بارونق اور اہم شہر ہے۔ ہم سب سے پہلے مقامی تھانے کے ایس ایچ او سے ملے اور اُس سے اپنا تعارف کرایا۔ اُسے ٹیلی فون پر ہماری آمد کی اطلاع ہوچکی تھی۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی مقتول کے بارے میں ضروری معلومات بھی حاصل کر چکا تھا۔ مقتول کا اصل نام امیت نہیں وجے آنند تھا۔ وہ بڑودہ کے ایک مشہور سینما کا مالک تھا اور فلمیں وغیرہ خریدنے کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ قریباً دو ہفتے سے بڑودہ میں موجود تھا۔ اُس کے دوست احباب کی زبانی پتہ چلا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں دہلی گیا ہوا ہے۔ وجے آنند کے والدین روتے پیٹتے امرتسر کے لیے روانہ ہوچکے تھے اور یہاں بھی وجے آنند کی

اچانک موت پر سخت حیرت کا اظہار کیا جارہا تھا۔

ایس ایچ او رزاق خاں نے کہا ”کچھ لوگ وجے آنند کے قتل کے ڈانڈے گجراتی فلموں کی ایک خوبصورت ایکٹرس شیلا ٹنڈن کی گمشدگی سے ملا رہے ہیں۔ شیلا ٹنڈن پانچ چھ ماہ پہلے اچانک غائب ہوگئی تھی اور ابھی تک اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

یہ ذکر سُن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے رزاق خاں سے اس بارے میں تفصیلات پوچھیں۔ رزاق خاں نے بتایا۔ پچھلے دنوں یہاں کے مقامی اخباروں میں شیلا کی گمشدگی کا بہت چرچا رہا ہے۔ یہ نوخیز اداکارہ گجراتی فلموں کے مشہور ہدایت کار مہیش رامپوری کی پوتی تھی۔ اُس نے ایک دو گجراتی فلموں میں بڑے یادگار کردار ادا کیے ہیں اور بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ بہت جلد ممبئی کی ہندی فلموں تک پہنچ جائے گی لیکن ایک روز اچانک لاپتہ ہوگئی۔ اُس کے والدین تو فوت ہوچکے ہیں دادا ہی سرپرست ہے۔ اس نے پوتی کو بہت تلاش کرایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں میں نے ایک اخبار میں اُس کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ ملک سے باہر جاچکی ہے“۔

نجانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ یہی شیلا ٹنڈن وہ لڑکی ہے جو تارا بن کر ماسٹر ریاض کے گھر میں رہ رہی ہے۔ میں نے رزاق خاں سے کہا ”انسپکٹر صاحب! میں شیلا ٹنڈن کے دادا سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا نام بتایا ہے آپ نے اُس کے دادا کا؟“

”مہیش رامپوری“ انسپکٹر رزاق نے جواب دیا‘ لیکن آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں اُس سے؟“

میں نے کہا ”میرا خیال ہے انسپکٹر ریاض کہ وجے آنند کے قتل اور شیلا ٹنڈن کی گمشدگی میں واقعی گہرا ربط ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ اس وقت وہ شخص کہاں

مل سکتا ہے؟"

انسپکٹر رزاق نے دو تین جگہ ٹیلی فون کیا۔ سادے کاغذ پر ایک دو پتے لکھے پھر گہری سانس لے کر بولا "مہیش صاحب اس وقت بڑودہ میں ہی ہیں۔ انہوں نے نہر کنارے ایک محل نما مکان بنا رکھا ہے۔ بعض اوقات فلموں کی شوٹنگ بھی وہاں کرتے ہیں۔ وہ محل دیکھنے کی چیز ہے۔ اس وقت وہ وہیں پر ہیں، میرا خیال ہے آپ چلے جائیں ملاقات ہو جائے گی اُن سے"۔

میں نے اُسی وقت انسپکٹر رزاق سے مکمل ایڈریس حاصل کیا اور اُس کے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لے کر مہیش رامپوری کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبدالرزاق نے اپنی گاڑی بھی خوش دلی سے میرے استعمال میں دے دی تھی۔ بڑودہ کی چند ایک بھری پری سڑکوں سے گزر کر ہم شفاف پانی والی ایک نہر پر پہنچے۔ یہاں باغات اور سبزے کی کثرت تھی (حالانکہ بڑودہ میں بہت کم سبزہ دیکھنے میں آیا تھا) درختوں کے درمیان ایک بلند وبالا عمارت دیکھ کر ہم ٹھٹھک گئے۔ وہ واقعی کسی محل سے کم نہیں تھی۔ بلند برجیاں محرابی دروازے، خوبصورت فوارے اور بیلوں سے ڈھکی ہوئی دیواریں، بہت بڑے گیٹ کے سامنے باوردی دربان موجود تھے ایک دربان میرا شناختی کارڈ لے کر اندر گیا اور پانچ منٹ بعد واپس آیا۔ باریابی کی اجازت مل گئی تھی۔ ایک طویل اور خوشنما راستہ طے کر کے ہم عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ یہاں بھی آرائش و زیبائش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ ایک وسیع کمرے میں بہت بڑے فانوس کے نیچے منقش کرسی پر ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر اُس نے اپنا رُخ پھیرا۔ میں سکتے میں رہ گیا یہ وہی شخص تھا جو تین چار ہفتے پہلے یہاں سے سینکڑوں میل دُور امرتسر کے کمپنی باغ کے سامنے ایک معمولی ریستوران میں تارا سے ملا تھا اور اُس کے ساتھ ایک گھنٹہ تک ایک کیبن فیملی میں بیٹھا رہا تھا۔ میں اُسے پہچانتا تھا لیکن اُس کے لیے میں اجنبی تھا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ تارا ہی شیلا ٹنڈن ہے۔

"آؤ انسپکٹر" اُس نے مجھے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا "وجے آنند کے قتل کی اطلاع مجھے ہو چکی ہے۔ مجھے توقع تھی کہ جلد ہی کسی پولیس اہلکار سے ملاقات ہو گی"۔

اس نے اپنا چشمہ اُتار کر میز پر رکھ دیا اور بولا "جس بات کا علم تم کو ایک آدھ روز میں ہو جانا ہے بہتر ہے کہ وہ میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہو گا کہ وجے آنند ایک سینما کا مالک تھا اور فلم لائن سے اُس کا تھوڑا بہت تعلق موجود تھا۔ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے میری پوتی شیلا ٹنڈن میں دلچسپی لے رہا تھا اور اُس سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ میری طرف سے اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وجے آنند سمارٹ اور نوجوان تھا، صاحب جائیداد بھی تھا لیکن شیلا اُس کے بارے میں تذبذب کا شکار تھی...... وہ دُور خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "وہ عجیب لڑکی تھی انسپکٹر انسانوں کی بھیڑ میں سب سے جدا اور انوکھی۔ اُس کے اپنے نظریات اور زندگی گزارنے کا اپنا اسلوب تھا۔ نجانے کیوں کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اپنے والد کی طرح وہ بھی مجھ سے چھن جائے گی۔ کسی اور دنیا میں جا بسے گی اُسے زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں سے نفرت تھی۔ بہت مشکل ڈھنگ سے جینا چاہتی تھی وہ"۔

مہیش رام پوری کے چہرے پر دنیا جہان کی اُداسی سمٹ آئی تھی اور آنکھیں جیسے دھندلا سی گئی تھیں۔ اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ وہ صرف چند ہفتے پہلے اپنی پوتی سے مل چکا ہے اور کافی وقت اُس کے ساتھ گزار چکا

ہے تو میں واقعی اسے ایک ''دُکھی دادا'' سمجھتا جس کی پوتی چھ ماہ سے لاپتہ ہے اور وہ اُس کی پریشانی کو دل کا روگ بنائے ہوئے ہے۔ وہ اداکاری کر رہا تھا اور اچھی اداکاری کر رہا تھا......اور کیوں نہ کرتا وہ ایک کہنہ مشق فلم ڈائریکٹر تھا۔

میں نے کہا ''کہیں آپ کی پوتی اس وجہ سے غائب تو نہیں ہوئی کہ آپ اُس کی شادی وجے آنند سے کرنا چاہتے تھے اور وہ اس شادی کے حق میں نہیں تھی''۔

مہیش رام پوری نے انکار میں سر ہلایا ''ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو بَر چننے کی آزادی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں شیلا کے لاپتہ ہونے میں وجے آنند والے معاملے کا کوئی تعلق نہیں تھا''۔

میں نے کہا ''پھر آپ نے یہ کیوں سوچا کہ وجے کی موت کے بعد پولیس آپ سے رابطہ کرے گی''۔

مہیش بولا ''فلم لائن میں یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم تھی کہ وجے آنند، شیلا کو چاہتا ہے اور اُس کو اپنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے اس حوالے سے پولیس سوچ سکتی ہے کہ شیلا کی گمشدگی اور وجے کے قتل میں کوئی تعلق نہ ہو''۔

میں نے اچانک پینترا بدلتے ہوئے کہا ''لیکن میرا خیال ہے کہ شیلا گم نہیں ہوئی''۔

''کیا مطلب؟'' مہیش نے حیران ہو کر کہا۔

''یہی مطلب ہے کہ وہ گم نہیں ہوئی۔ وہ امرتسر میں ہے اور وہاں طاہرہ ریاض کے نام سے رہ رہی ہے''۔

مہیش رامپوری کے سر پر جیسے کسی نے دستی بم پھینک دیا تھا۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر قدرے سنبھل کر بولا ''لل......لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''جیسے آپ کو پتہ چلا اور آپ اُس سے ملنے امرتسر پہنچے''۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ مہیش کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ابھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ ایک دربان ابھی تک دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ دربان خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اب میں اور مہیش ہال نما کمرے میں اکیلے تھے۔ مہیش نے مجھے پہلی بار غور سے دیکھا اور سرتاپا اچھی طرح گھورا ''تم کو کس نے بھیجا ہے یہاں؟''

''میں خود آیا ہوں'' میں نے اعتماد سے کہا ''مجھے کسی سے ہدایات لینے کی ضرورت نہیں''۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں امرتسر گیا ہوں یا شیلا سے ملا ہوں''۔

''میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور اس بارے میں ٹھوس ثبوت فراہم کر سکتا ہوں''۔

ایک دم مہیش رامپوری ڈھیلا پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے عینک اتھا کر اُس کے شیشے صاف کیے اور اُسے دوبارہ آنکھوں پر جمالیا ''میں تمہارا مکمل تعارف حاصل کر سکتا ہوں'' اُس نے پوچھا مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے مکمل تعارف کرادیا۔ جواب میں اُس نے بھی تفصیل سے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ گجراتی فلموں کا سب سے پرانا ہدایت کار تھا اور کئی ایک شہرت یافتہ فلمیں بنا چکا تھا۔ اُس کی عمر ستر سال سے اوپر تھی لیکن اچھی صحت کی وجہ سے پچپن ساٹھ کا نظر آتا تھا۔ شیلا کا والد اور والدہ ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے اور مہیش نے شیلا کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔

مہیش نے میرے لیے چائے اور اپنے لیے بلیک کافی منگوائی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ بولا انسپکٹر نواز! آج میں تمہیں ایک ایسی بات بتانے جا رہا ہوں جو اب تک صرف میرے اور بھگوان کے درمیان تھی۔ اس بات کا تعلق شیلا اور اس کی زندگی سے ہے۔ سب سے پہلے تو میں تمہاری ان معلومات کو درست قرار دیتا ہوں کہ میں بیس پچیس روز پہلے

امرتسر گیا تھا اور وہاں شیلا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دوسری تمہاری یہ اطلاع بھی بالکل درست ہے کہ شیلا امرتسر میں طاہرہ بن کر رہ رہی ہے اور اس نے وہاں ماسٹر ریاض نامی شخص سے شادی کرلی ہے لیکن اس شادی کے پس پردہ کیا حالات ہیں ان کا علم میرے اور شیلا کے سوا اب تک کسی کو نہیں تھا۔ شاید تمہیں میری یہ باتیں کچھ عجیب سی لگیں کیونکہ ان کا تعلق فلم لائن سے ہے۔ بہرحال میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں وہ سو فیصد درست ہے۔ شیلا نہ تو گھر سے بھاگی تھی نہ اُسے کسی نے اسے اغوا کیا تھا اور نہ وہ لاپتہ ہوئی تھی۔ اسے میں اور میرا اسسٹنٹ انوارعلی خود امرتسر چھوڑ کر آئے تھے۔ اب تم پوچھو گے کہ ایک نوجوان لڑکی کو امرتسر میں چھوڑ کر آنے کی کیا وجہ تھی؟ اس کی وجہ بہت اہم تھی لیکن شاید تمہیں زیادہ اہم نہ لگے۔ دراصل میں ایک فلم بنا رہا تھا۔ یہ میری ذاتی فلم تھی۔ اسکی کہانی میں نے مشہور گجراتی کہانی کار من موہن جی سے لکھوائی تھی ۔ یہ فلم ایک لڑکی کے گرد گھومتی ہے اور اس میں مرکزی کردار خود شیلا ادا کررہی تھی۔ شیلا ایک زبردست فن کارہ ہے اور اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہر قسم کے لوگ کررہے ہیں اور کسی کی تعریف بے وجہ نہیں کی جاتی۔ شیلا نے واقعی اب تک اپنے ادا کیے ہوئے کرداروں میں جان ڈالی ہے اور فن کے پرستاروں کو اپنی تعریف پر مجبور کیا ہے۔ وہ فلم کے کردار میں ڈھل جاتی ہے۔ کہانی میں ڈوب کر کہانی کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک فلم میں مچھیرے کی بیٹی اور دوسری میں کلب ڈانسر بنی ہے۔ یہ دونوں کردار ٹھیک سے نبھانے کے لیے اُس نے بے حد محنت کی تھی۔ مچھیرن کا کردار ادا کرنے کے لیے وہ پورے دو ہفتے مچھیروں کی بستی میں رہی اور اُن کے رنگ ڈھنگ وطور اطوار دیکھے۔ کلب ڈانسر کا کردار ادا کرنے کے لیے وہ خاموشی سے بمبئی چلی گئی اور کسی کو بتائے بغیر وہاں کے ایک معروف کلب میں ایک مہینہ ملازمت کر آئی۔ جس ذاتی فلم کا میں تم سے ذکر کررہا ہوں اس میں شیلا کا کردار ایک ایسی لڑکی کا تھا جو حیدرآباد سے لاہور جارہی ہے۔ وہ ٹرین میں اپنے وارثوں سے بچھڑ جاتی ہے اور بھٹک کر ایک پنجابی سکول ماسٹر کے گھر میں پہنچ جاتی ہے یہ سکول ماسٹر اسے بیٹی بنالیتا ہے اور اُس کے وارثوں کی تلاش شروع کرتا ہے۔ لڑکی چونکہ بہت نوعمر اور سادہ لوح ہے، اُسے اپنا پتہ تو درکنار اس شہر یا گاؤں کا نام بھی معلوم نہیں جہاں سے وہ آئی ہے۔ وہ ماسٹر کے اپاہج بیٹے سے محبت کرنے لگتی ہے لیکن ماسٹر اس کی شادی بیٹے سے نہیں کرتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے اس طرح دنیا والے اس پر انگلیاں اٹھائیں گے اور اُسے خودغرض گردانیں گے۔ آخر میں لڑکی خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے اور یوں ماسٹر کے بیٹے سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہی کردار تھا جسے بہت اچھے طریقے سے ادا کرنے کے لیے اور اپنی اداکاری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے شیلا نے گجرات سے پنجاب کا رُخ کیا اور امرتسر کے ایک سکول ماسٹر کے گھر میں عین اُسی طرح وارد ہوئی جس طرح وہ فلم میں وارد ہوئی۔ اس مقصد کے لیے اُس نے ایک ایسا سکول ماسٹر منتخب کیا تھا جو عمر میں اس کا بزرگ لگتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں خبطی سی ہو جاتی تھی اور اس کا یہی خبط تھا جو اُس کے کرداروں کو زندگی بخش دیتا تھا۔ جب اُس نے امرتسر آنے کا ارادہ کیا تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ وہ اپنے فیصلے پر مضبوطی سے قائم ہے اور اگر میں نے اُس کا فیصلہ بدلنے کی کوشش جاری رکھی تو وہ فلم میں کام کرنے سے ہی انکار کردے گی تو اُس کی یہ "فن کارانہ" ضد قبول کرلی۔ شیلا تارا کے روپ میں ماسٹر

ریاض کے گھر چلی گئی۔ فلم میں بھی اُس کا نام تارا ہی تھا اور وہ اسی طرح غنڈوں سے بچتی ہوئی ماسٹر کے گھر میں پہنچتی ہے، لیکن اس سے آگے کی کہانی فلم کی کہانی سے بالکل مختلف ہوگئی۔ میرے اور میرے اسسٹنٹ کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس گھر میں جانے کے بعد شیلا جیسی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ لڑکی اس تیزی اور اس انداز سے بدل جائے گی۔ میں تو کہوں گا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے کسی بھی سنسنی خیز فلم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور ڈرامائی ہے۔ پروگرام کے مطابق شیلا کو قریباً ایک ماہ ماسٹر ریاض کے گھر میں رہنا تھا اس کے بعد اُسے بتدریج ماسٹر صاحب کو سب کچھ بتا دینا تھا اور اُن کو دی جانے والی زحمت پر بہت بہت معذرت کرکے واپس آجانا تھا یہ بھی توقع تھی کہ وہ ہفتے دو ہفتے میں ہی لوٹ آئے۔ ہم اس بات کی پوری طرح تسلی کر چکے تھے کہ ماسٹر ریاض بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی شریف اور بے ضرر شخص بھی ہے لہٰذا اُسے چھوڑ کر میں بڑودہ واپس آگیا۔ صرف میرا اسسٹنٹ انوار علی کسی ہنگامی ضرورت کے لیے امرتسر میں موجود رہا۔

پورا ایک ماہ گزر گیا لیکن شیلا واپس نہیں آئی۔ پھر دو مہینے بھی گزر گئے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ پھر ایک روز مجھے شیلا کی طرف سے ایک خط ملا وہ امرتسر بلا رہی تھی۔ ماسٹر ریاض کے گھر میں بلانے کی بجائے اُس نے مجھے کمپنی باغ کے سامنے ایک ریستوران کا ایڈریس دیا تھا اور ملاقات کا وقت بھی بتایا تھا۔ لاڈلی پوتی کی کال پر میں بھاگم بھاگ امرتسر پہنچا اور مقررہ مقام پر اس سے ملاقات کی مجھے معلوم نہیں تھا کہ جیسے ڈرامائی اور سنسنی خیز موڑ میں فلموں میں دیتا ہوں ایسا ہی ایک ناقابل گمان موڑ میری اپنی زندگی میں بھی آئے گا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ شیلا میرے سامنے زار وقطار رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "دادو! تم نے ہی تو مجھے محبت کرنا سکھایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ محبت دنیا کا سب سے انمول جذبہ ہے اور جب محبت ہو جائے تو سر جھکانا نہیں چاہیے۔ سر اٹھانا چاہیے کہ ہاں ہمیں محبت ہے...... مجھے بھی محبت ہوگئی ہے دادو! میں ماسٹر صاحب سے محبت کرنے لگی ہوں اور دل کی گہرائیوں سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اُس سے شادی کرلی ہے"۔ میں سکتے کی حالت میں شیلا کے ساتھ رہا تھا۔ شیلا نے بتایا کہ ماسٹر ریاض اُسے ایک بھولی بھالی لاوارث اور غریب لڑکی کے روپ میں جانتے ہیں اور وہ چاہتی ہے کہ ماسٹر صاحب کے سامنے ہمیشہ اُس کا یہی روپ رہے۔ اُس نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر کبھی ماسٹر صاحب کو بھنک بھی پڑ گئی کہ شیلا وہ نہیں جو نظر آرہی تھی تو وہ ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی زندگی سے نکال دیں گے۔ انہیں دنیا میں جس چیز سے سب سے زیادہ نفرت ہے وہ عورت کی چالاکی اور ہوشیاری ہے اور سب سے پیاری چیز عورت کی سادگی اور معصومیت ہے۔ شیلا نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے درخواست کی میں اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر چلا جاؤں اور کم از کم دو تین برس کے لیے اُسے بالکل بھول جاؤں۔ میں نے مختصر سے وقت میں ساری بات سمجھ لی تھی اور یہ بھی جان گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے صبر کرنا تھا اور خاموشی سے واپس لوٹ آنا تھا......اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دل پر ایک بہت بھاری پتھر رکھا۔ میں نے شیلا کی جدائی قبول کرلی اور وہ ساری باتیں بھی سن لیں جو لوگوں نے اُس کے حوالے سے کیں۔ فلم لائن کے لوگوں میں ایسی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی لیکن شیلا چونکہ ایک سپر سٹار بننے والی تھی اور لوگ اُس سے بہت امیدیں رکھتے تھے۔ اس لیے

اُس کا اچانک فلمی دنیا چھوڑ کر منظر سے غائب ہو جانا انہیں شاک گزرا۔ کئی اخباری نمائندوں نے جستجو کی کہ وہ اچانک کہاں چلی گئی ہے۔ وہ اُسے بڑودہ اور احمد آباد وغیرہ میں ڈھونڈتے رہے لیکن وہ تو سینکڑوں میل دُور امرتسر کے اُس چھوٹے سے گاؤں میں ماسٹر ریاض کے گھر میں تھی۔ دھیرے دھیرے لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ شیلا گمشدگی کو بھی لوگ بھولنے لگے۔ میرے علاوہ اگر کوئی شخص اُس کی حیران کن گمشدگی کو نہیں بھولا تو وہ وجے آنند تھا۔ وہ امیر زادہ شیلا کو جنون کی حد تک چاہتا تھا اور اس کو اپنانا اس کی ضد بن چکا تھا......'' ایک لمحے کے توقف کے بعد مہیش رامپوری نے کہا ''لیکن ایک بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں اگر تمہارے دماغ کے کسی بھی کونے کھدرے میں یہ خیال موجود ہے کہ وجے آنند کے قتل میں شیلا کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں اپنی پوتی کو اتنا جانتا ہوں کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتی ہوگی۔ وہ...... کسی کا خون نہیں کر سکتی''۔ شیلا کے دادا نے آخری فقرے کے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

اگلے دس بارہ گھنٹوں میں ہم نے اس سلسلے میں کئی لوگوں سے بیانات قلمبند کیے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وجے آنند کے قتل کا تعلق شیلا کی گمشدگی سے ہو سکتا ہے تاہم فلم لائن کے ہی بعض لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ قتل کسی دشمنی وغیرہ کا شاخسانہ ہے۔ شیلا کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اگر بیان دینے والوں کو پتہ چل جاتا کہ شیلا، طاہرہ کے روپ میں امرتسر میں ہی ہے اور اپنے قتل سے صرف چند گھنٹے پہلے وجے آنند نے شیلا سے ملاقات کی تھی تو یقیناً وہ آنکھیں بند کر کے اس قتل میں شیلا کو ملوث کر دیتے۔ میرا اور ایس ایچ او رزاق خاں کا بھی یہی خیال تھا کہ شیلا اس قتل میں ملوث نہیں ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ وجے آنند نے شیلا کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کی ہو یا کسی طریقے سے اُسے بلیک میل کیا ہو اور شیلا نے اُسے زندگی کی سرحد پار کرا دی ہو۔ لیکن یہ کوئی چھوٹا اقدام نہیں تھا کسی کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور وہ بھی کسی عورت کے لیے اور عورت بھی ایسی کہ جو محبت کر رہی تھی اور کسی کی زندگی میں بہار بن کر ٹھہرنا چاہتی تھی۔

....

ضروری بیانات حاصل کرنے کے بعد میں ایک روز بعد بڑودہ سے روانہ ہوا اور ٹرین کا طویل سفر کرنے کے بعد امرتسر واپس پہنچ گیا۔ وجے آنند کے قتل کی تفتیش شروع ہوئی۔ میں نے شیلا کے دادا سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک مجھے شیلا کے خلاف کوئی بہت ٹھوس ثبوت نہیں مل جائے گا میں اسے اس معاملے سے الگ تھلگ رکھوں گا اور اس کی نجی جماعی زندگی میں کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کروں گا۔

وجے آنند کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آ چکی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق اس کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ یہ زہر اُسے کسی مشروب غالباً گنے کے رس میں ملا کر دیا گیا تھا۔ رپورٹ میں اس زہر کا مشکل سا نام اور کیمیکل فارمولا لکھا تھا۔ یہ زہر دو تین گھنٹے کے بعد اثر کرنا شروع کرتا ہے اور تین چار گھنٹے کے دوران اپنے شکار کو راہی عدم کر دیتا ہے۔ میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ شیلا نے باغ کی سیر کے دوران یا اُس کے بعد وجے آنند کو زہر پلا دیا۔ بعد ازاں وہ اطمینان سے گھر آ گئی اور وجے اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اُس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔ تلخی اور حرارت حد سے بڑھی تو وہ کپڑے اتار کر غسل خانے میں گھس گیا اور نہانے لگا۔ نہانے کے دوران ہی اُس نے خون کی قے کی

اور فرش پر گر کر دم توڑ گیا۔

شیلا عرف تارا کے خیال میں اس بات کا کوئی گواہ موجود نہیں تھا کہ وہ امرتسر میں وجے آنند سے ملی ہے بلکہ یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی لہٰذا وہ بالکل مطمئن ہو کر گھر آ گئی تھی۔ بہرحال اس سارے معاملے میں ایک بات توجہ طلب بھی تھی۔ جو کچھ بلال شاہ نے دیکھا تھا اُس کے مطابق شیلا عرف تارا قریباً گیارہ بجے تک وجے آنند کے ساتھ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر اُس نے زہر پلایا ہے تو اُس کا اثر دو ڈھائی بجے تک ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن زہر کا اثر پانچ بجے کے قریب ہوا تھا اور وجے کی موت اندازاً سات بجے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پولیس سرجن سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا ہو اور زہر خورانی کے بعد وہ زیادہ مشقت کا کام بھی نہ کرے تو زہریلے اثرات کے شروع ہونے میں دو سے تین گھنٹے کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

جو پارٹی دہلی بھیجی گئی وہ اُس شخص کو اپنے ساتھ ہی لے آئی جس کی کار میں مقتول امرتسر پہنچا تھا اور جو مقتول کا گہرا دوست بتایا جاتا تھا۔ اس شخص کا نام امر سنگھ تھا۔ امر سنگھ پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ پتہ چلا کہ امر سنگھ سے مقتول کا شدید قسم کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اور مقتول امر سنگھ سے کار مانگ کر نہیں بلکہ ایک طرح سے چھین کر لایا تھا۔ امر سنگھ نے مقتول کے چالیس پینتالیس ہزار روپے دینے تھے اور ادائیگی سے انکار کر رہا تھا۔ مقتول نے بڑودہ میں بھی اپنے ایک ہمراز دوست سے کہا تھا کہ اگر امر سنگھ نے رقم نہیں دی تو وہ اُس کی گاڑی ضرور لے آئے گا۔

ہم نے اس لائن پر تفتیش شروع کی تو چند ایک مزید انکشافات ہوئے لیکن قتل کا سرا پھر بھی ہاتھ نہیں آیا۔ اسی دوران میرے "ہونہار" مخبر بلال شاہ کی

کوششوں سے تفتیش کا ایک اور راستہ کھلا۔ معلوم ہوا کہ اپنے قتل سے ایک روز قبل مقتول کا کچھ مقامی غنڈوں سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ یہ جھگڑا ایک کال گرل یعنی پیشہ ور لڑکی کی وجہ سے ہوا۔ مقتول نے اس لڑکی کو عیاشی کے لیے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ نشے میں دھت ہو کر اس نے کوئی ایسی حرکت کی یا ایسی بات کہی کہ لڑکی بھڑک کر باہر نکل آئی۔ وہ اُسے واپس اندر کھینچنے لگا۔ اسی دوران لڑکی کا ایک "نگران" بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ وجے کی ہاتھا پائی ہو گئی۔ ہوٹل کے مالکوں نے اس معاملے کو فوری طور پر دبا دیا اور "لڑکی والوں" کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے بھیج دیا۔ میرے اے ایس آئی فرزند علی نے اس معاملے کی تفتیش کی اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا مقتول اور لڑکی والوں میں پھر بھی مڈھ بھیڑ ہوئی ہے یا نہیں۔

تین مختلف لائنوں پر دو ڈھائی ماہ اس کیس کی تفتیش جاری رہی لیکن کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں آیا۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ اگر مقتول کو گنے کے رس میں زہر ملا کر دیا گیا تو وہ رس اُس نے کہاں پیا۔ جس باغ میں اُس نے شیلا کے ساتھ چہل قدمی کی تھی وہاں آس پاس کوئی "رس والا" موجود نہیں تھا۔ راستے میں بھی بلال شاہ نے انہیں کہیں رس وغیرہ پیتے نہیں دیکھا۔ ہاں سوڈا واٹر انہوں نے ضرور پیا تھا...... تفتیش کے دوران ہی ایک دو دفعہ شیلا اور ماسٹر ریاض سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ شیلا عرف تارا کا پاؤں اب بھاری تھا۔ پھلدار شجر کی طرح وہ کچھ اور بھی خوشنما ہو گئی تھی۔ وہ پروانے کی طرح ماسٹر ریاض کے گرد گھومتی رہتی تھی۔ اس کی ایک آواز پر "آئی جی" کہتی ہوئی لپکتی تھی۔ آخری مہینوں کے باوجود وہ ماسٹر صاحب کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ میں اُسے دیکھ دیکھ کر سوچتا تھا کہ وہ واقعی ایک زبردست گجراتی فلموں کی ایک

کامیاب ہیروئن ہے اور اُس کی عقل مندی اور فن میں اُس کی سوجھ بوجھ کا ایک زمانہ اعتراف کرتا ہے۔ ایک عجیب، گورکھ دھندہ تھی یہ لڑکی۔

وجے آنند کو قتل ہوئے اب چھ مہینے گزر چکے تھے۔ کوشش کے باوجود میں کوئی اہم سراغ نہیں پا سکا تھا اور اب مجھ پر ایک طرح کی مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ ایک روز میں کیس کی ادھوری فائل سامنے رکھے کمرے میں بیٹھا تھا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دفعتاً ایک ایسی بات میرے ذہن میں آئی جو بہت پہلے آجانا چاہیے تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں اور میرا عملہ اب تک کیوں اس بات کو فراموش کیے ہوئے تھا......

تارا یعنی شیلا ٹنڈن جب مقتول وجے آنند سے ملنے چوری چھپے گاؤں سے روانہ ہوئی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو اُسے بس پر چڑھا کر گاؤں واپس آگئی تھی عین ممکن تھا کہ وہ لڑکی تارا کی ہمراز ہو اور اُس سے کوئی اہم بات معلوم ہو سکے۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں جانڈی پورا گاؤں کے پٹواری کی بیٹی سیتا کا بیان لے رہا تھا یہی لڑکی تارا کو بس پر چڑھانے کے لیے پختہ سڑک تک گئی تھی۔ پٹواری پیارے لال بھی وہاں موجود تھے۔ سیتا کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا اور کچھ یہی حال پٹواری کا بھی تھا۔ صرف دو روز بعد سیتا کی شادی ہو رہی تھی۔ گھر میں مہمان آنا شروع ہو گئے تھے اور دلہن پولیس کے چکر میں پھنس گئی تھی۔ میں نے سیتا کی ''مجبوری'' سے بڑے مناسب طریقے سے فائدہ اٹھایا تھا اور پندرہ منٹ کے اندر اُسے سب کچھ اُگلنے پر راضی کر لیا تھا۔ پٹواری پیارے لال کو باہر بھیجنے کے بعد میں نے تارا کی ہمراز سیتا سے جو کچھ معلوم کیا وہ کچھ اس طرح تھا۔

''وجے آنند نے تارا کا کھوج لگانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ آخر ایک روز وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور اس حد تک کامیاب ہوا کہ ایک رات ماسٹر ریاض کے گھر پہنچ گیا۔ تارا اُسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر بے حد خوفزدہ ہوئی اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر بمشکل اُسے وہاں سے ٹالا۔ اگلی رات وجے پھر آدھمکا۔ اس نے نہ صرف تارا سے دست درازی کی بلکہ گھر سے باہر ملنے پر اصرار کیا۔ وہ دونوں برآمدے میں کھڑے تھے اور اندر کمرے میں تارا کا شوہر سو رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ شوہر کی آنکھ نہ کھل جائے تارا نے سب کچھ برداشت کیا اور وجے سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ کسی روز اُسے گھر سے باہر ملے گی۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ ماسٹر ریاض کو کسی کام سے لاہور جانا پڑا۔ اس کی روانگی سے صرف ایک رات پہلے وجے پھر دیوار پھاند کر ماسٹر ریاض کے گھر آیا۔ تارا نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ کل نو بجے کے لگ بھگ اُسے امرتسر کے بس اڈے پر ملے گی۔ اگلے روز وہ وجے سے ملنے روانہ ہوئی۔ اس ملاقات کے لیے اُس نے خود کو بنایا سنوارا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی ایک تیاری کی تھی۔ زہر کی وہ پڑیا جو وہ اکثر اپنے ''اندرونی لباس'' میں رکھتی تھی اُس روز بھی اس کے لباس میں تھی۔ (ماسٹر ریاض کا اندازہ غلط تھا کہ وہ سنکھیا ہے۔ یہ وہی زہر تھا جس کی نشاندہی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہوئی تھی) یہ زہر تارا نے گنے کے اُس رس میں گھول دیا جو تھرماس میں بند وجے کی گاڑی میں پڑا تھا۔ اس رس کے چند گھونٹ وجے نے واپس ہوٹل میں جا کر لیے اور بعد میں تھرماس دھو کر اپنے سامان میں رکھ دیا۔ یہ تھرماس ہم نے دیکھی بھی تھی لیکن اُس وقت ہمارے ذہن میں نہیں آیا کہ یہ تھرماس اس کیس

میں ایک اہم ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے۔

......دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ یہ لڑکی جو ماسٹر ریاض کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار بن کر آئی ہے قاتلہ ثابت ہو چکی تھی۔ اُسے گرفتار کر کے حوالات میں پہنچانا اور کیے کی سزا دلانا میرا آئینی فرض تھا۔ تھانے آ کر میں تادیر سوچ میں غرق رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ماسٹر ریاض کے گھر جاؤں اور اُس سے کہوں کہ اُس کی بیوی وہ نہیں جو نظر آتی ہے...... اُسے معصومیت اور سادگی کا فریب دینے والی ایک 'قاتل اداکارہ' ہے اور میں اُسے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔

......شام چار بجے تک مجھے اس کی گرفتاری کے لیے پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن چھ بج چکے تھے اور میں الجھنوں میں جکڑا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ہر بار جب میں اٹھنے کا ارادہ کرتا تھا ایک دیواری میرے سامنے آ جاتی تھی۔ آخر میں نے ہمت کی اور دو ہیڈ کانسٹیبلوں اور ایک ہتھکڑی کے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔ ابھی میں گلی میں ہی پہنچا تھا کہ بلال شاہ قریباً بھاگتا ہوا آیا۔ اُس کی پگڑی گلے میں پڑی تھی اور رنگ فق تھا۔ ''خان صاحب! ماسٹر کی گھر والی مر گئی'' اُس نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔ میں سکتے کی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ بلال شاہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا'' اُسے بچہ ہونے والا تھا۔ آج صبح سویرے ماسٹر ریاض اُسے تحصیل ہسپتال لے کر گیا تھا سہ پہر ساڑھے تین بجے اُس نے دم دے دیئے''۔

میں نے کانسٹیبل بھگتو سنگھ کے ہاتھ میں جھولتی ہوئی ہتھکڑی کو دیکھا مجھے یوں لگا کہ یہ ہتھکڑی بے جان ہونے کے باوجود اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔

......تارا مر گئی۔ اُسے مسلمانوں کی طرح نہلا دھلا کر اور کفن میں لپیٹ کر اُس کے مُردہ بچے سمیت منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ اُس کے دادا مہیش رامپوری کو اُس کی موت کی خبر کر دی گئی تھی لیکن اُس نے اپنی لاڈلی پوتی سے کیا ہوا آخری وعدہ نبھایا۔ وہ پوتی کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوا۔ نہ ہی اُس نے اپنے داماد سے کسی طرح کا رابطہ کیا۔ جانڈی پورا میں میرے سوا کسی کو تارا کی کہانی کا علم نہیں تھا اور میں نے اپنے لبوں پر مہر لگا لی۔ بلال شاہ کو میں پہلے ہی رازداری کا پابند کر چکا تھا۔ اب میں نے پٹواری اور اس کی بیٹی سیتا کو بھی پابند کر دیا کہ وہ تارا کے سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھیں۔ وہ زبان کھولتے تو خود بھی پھنستے تھے لہٰذا انہوں نے زبان بند کر لی...... میں نے وجے آنند قتل کیس کی فائل بند کر دی......اور یوں ماسٹر ریاض سمیت کسی کو علم نہ ہو سکا کہ وجے کی موت کی ذمے دار تارا تھی۔ شاید کبھی نہ کبھی یہ بات ماسٹر ریاض کے سامنے کھل ہی جاتی لیکن کچھ عرصے بعد وہ خود ہی جانڈی پورا چھوڑ گیا۔ تارا کی یادیں سینے میں بسائے اُس کے غم آنکھوں میں چھپائے وہ ایک روز یوں سر جھکا کر گاؤں سے نکلا جیسے کہیں سے جنازہ نکلتا ہے۔ پھر جانڈی پورا میں کبھی کسی نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ جاتے جاتے اُس نے اپنا سکول گاؤں کی پنچائیت کے سپرد کر دیا تھا اور سکول کی پیشانی پر ایک سبز رنگ کا بورڈ لگوا دیا تھا۔ اُس پر لکھا تھا ''طاہرہ ہائی سکول''۔

ماسٹر ریاض کو ہوشیار چالاک اور پڑھی لکھی عورتوں سے نفرت تھی لیکن اس کی زندگی میں آنے والی واحد لڑکی ہوشیار بھی تھی، چالاک بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی تھی۔ ماسٹر ریاض پھر بھی اس سے پیار کرنے پر...... اور ساری زندگی اس کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور ہوا۔ شاید یہی قدرت کی کاریگری ہے۔

......❁......❁......

ہیپی نیو ایئر

حنا اصغر

اور اگلے دن وہ اس کے دفتر گیا تھا سوری کرنے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا تھا کہ وہ ایک ہفتے سے آفس ہی نہیں آ رہی تھی اور اسفند کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی حالانکہ کل وہ خود اس کو آفس کے دروازے پر چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ تیزاب کی بوتل اس کے قریب پڑی ہوئی تھی وہ ایکدم سے کھڑا ہو گیا تھا۔

میاں بیوی کا فسانہ، اُن کے درمیان شک کی دیوار حائل ہوگئی تھی

اس کے لیے وہ انتہائی سلگتی ہوئی شام تھی جب ادراک کے سارے پردے یکدم وا ہوئے تھے۔ ان پردوں نے اس کی ساری ہستی کو خاکستر کر دیا تھا۔ وہ دسمبر کی یخ بستہ شام کو ٹیرس پر کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا اور دوسرے ہاتھ میں سُلگتا سگریٹ راکھ ہو گیا تھا۔ اس کا وجود آگ کے بڑے سے الاؤ کی طرح دہک رہا تھا۔ ادھر وہ جل جل کر راکھ ہو رہا تھا جبکہ وہ اس کی ذہنی کیفیت سے قطعی طور پر انجان بن کر سو رہی تھی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے سنا تھا کہ وہ کسی امجد صاحب

سے معافی مانگ رہی تھی۔ اسفند کا جی چاہ رہا تھا اس کو جگا کر مارے، اپنی ساری وحشتیں ساری بھڑاس اس پر نکال دے لیکن وہ اس کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگلے دن اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ اس نے ایک دوبار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ پر "نولفٹ" کا بورڈ چسپاں تھا جس کو دیکھ وہ خاموش ہوگیا۔

وہ ششدر رہ گیا تھا اس کی آنکھیں بے یقین تھیں جبکہ دل میں محشر کا سا شور تھا اس کے ہاتھ میں تھا "بوکے" نیچے جا گرا تھا جس کو اس نے پاؤں کی مدد سے آگے سرکار دیا تھا۔ اضطراب و اشتعال کی ملی جلی کیفیت میں اس نے کسی نہ کسی طرح بائیک سٹارٹ کی تھی وہ جس جگہ سے گزرتا اس کو ایسا لگتا جیسے لوگ اس کا مضحکہ اڑا رہے ہوں۔ ان کی استہزائیہ نظریں اس کے اشتعال کو مزید بڑھا رہی تھیں اس نے ایک سٹور کے سامنے اپنی بائیک روک دی۔ "ایک تیزاب کی بوتل چاہیے"۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ "کیا کریں گے صاحب"...... لڑکے نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ "فلش دھونا ہے بیگم نے"...... اس نے حتیٰ الامکان اپنے آپ کو نارمل رکھا لیکن اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ ماتھے پر نمودار پسینے کے قطرے اس کو مزید حواس باختہ کررہے تھے۔ تیزاب لینے کے بعد وہ سی ویو پر آگیا۔ یہی جگہ تھی جہاں پر وہ اس کو پہلی بار ملی تھی۔ کبھی کبھار اس کو یہ جگہ اپنی محسن لگا کرتی تھی اور اب یہی جگہ اس کو ظالم اور بُری لگ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ آخری بار اس جگہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ خوشحال چہروں کا اژدھام تھا جبکہ اس کی محبت کرلا رہی تھی۔ لوگ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پھر رہے تھے جبکہ اس کی محبت ہاتھ چھڑا کر اس سے کوسوں دُور جا چکی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر خوشحالی تھی جبکہ اس کا چہرہ زرد و بدحال ہوگیا تھا۔ محبت کیا روٹھی تھی زندگی کے ہر رنگ

ہر خوشی نے اپنا دامن چھڑا لیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہی تھی۔ جب وہ اپنے دوستوں امجد اور بیزاد کے ساتھ سی ویو آیا تھا اور دائیں جانب بنے چاٹ کے ٹھیلے کی جانب اس کی نظریں اٹھی تھیں اور پھر واپس پلٹنا ہی بھول گئی تھیں۔ ٹھیلے کے قریب ٹھہری سنہری بالوں والی لڑکی جس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے وہ ٹکٹکی باندھے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی دو لڑکیاں اس کی سرزنش کررہی تھیں لیکن وہ باز نہیں آرہی تھی۔ امجد اور بیزاد آگے بڑھ چکے تھے جبکہ وہ ہونق بنا اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا کہ اسی پل اس نے اس کی جانب دیکھا تھا اور اس کی پیشانی پر ان گنت بل جال کی شکل میں پھیل گئے تھے۔ وہ سبکی کے احساس سے وہاں سے ہٹ گیا تھا "کھاؤ ناں...." بیزاد نے چاٹ کی پلیٹ اس کے سامنے کی تو اس نے بددلی سے پلیٹ لے لی "ارے یہ تو شہزاد ہے" بیزاد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا اور تبھی اسفند نے سامنے دیکھا اور مسمرائز ہوگیا شہزاد کے ساتھ وہ تینوں لڑکیاں بھی تھیں۔ بیزاد ان سے ملنے چلا گیا کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اسفند نے بے تابی سے ان کے بارے میں پوچھا۔ یار وہ میری کزن کا دیور ہے "اور وہ تینوں....؟"۔ امجد نے پوچھا "وہ اس کی کزنز ہیں"۔ اسفند کی نظریں اب بھی بھٹک بھٹک کر اس کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اپنی کزنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کررہی تھی۔

اسفند نے اپنے دوست کو امریکہ پارسل بھیجنا تھا اس لیے وہ سیونگ بینک آیا تھا۔ یہاں پر وہ ایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔ وہ ایک کاؤنٹر پر گیا "ساتھ والے کاؤنٹر پر جائیں"۔ ایک لڑکی نے قدرے روکھے انداز میں کہا۔ وہ زیر لب مسکرا دیا لیکن اگلے کاؤنٹر پر پہنچتے ہی اس کے قدم خود بخود ست پڑ گئے تھے آنکھیں خیراں ہوگئی تھی تو دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا ہوگیا تھا، بلاشبہ وہ وہی تھی۔ اس نے

انتہائی پروفیشنل لہجے میں اس کا پارسل بک کیا اور سیدا اس کو دے دی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہی ٹکٹکی باندھ کر اس کو دیکھتا رہے اور آج واقعی اس کو اپنی منزل مل گئی تھی۔ گھر آ کر اس نے بیزاد کو فون کیا اور پھر اس سے بات کی اور آگے کے معاملات اتنی تیزی سے طے ہوئے کہ وہ خود دم بخود رہ گیا تھا اور یوں درشہوار اس کی زندگی میں شامل ہوگئی تھی۔ تین سال پر لگا کر اڑ گئے تھے وہ دونوں اپنی چھوٹی سی دنیا میں مست و مگن تھے لیکن کچھ دنوں سے شہوار کی سرگرمیاں مشکوک ہوگئی تھی۔ وہ جو ہمہ وقت اسفند اور گھر کی فکر میں گھلتی رہتی تھی اب دونوں سے بے پرواہ ہوگئی تھی۔ وہ خوش باش آفس جاتی اور واپس آ کر گنگناتی رہتی یا پھر ہمہ وقت فون پر چپکی رہتی تھی۔ اسفند کے اندر آنے پر ہڑبڑا کر فون بند کر دیتی تھی اور کبھی کبھار اس نے خود اسے فون کان سے لگائے آنسو بہاتے دیکھا تھا جبکہ اسفند بات کرتا تو وہ پھاڑ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اس کے فلم دیکھنے اور لانگ ڈرائیو پر چلنے کا محض کہہ دینا ایک نئی لڑائی کی شروعات کا باعث بنتا، وہ محض خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ اس نے دو تین بار خود اس کو امجد سے فون پر بات کرتے سنا تھا لیکن اس کے آنے پر وہ فون بند کر دیا کرتی تھی۔ اور وہ ایسی ہی رات تھی جب دونوں کی لڑائی کی شروعات محض چھوٹی سی بات پر ہوئی تھی لیکن لڑائی طول پکڑ گئی تھی۔ غصے میں شہوار نے تین پلیٹیں توڑ دی تھیں اور اسفند کے منہ سے مغلظات کا ایک طوفان تھا جو نکلا تھا اور وہ بکتا جھکتا گھر سے نکل گیا تھا۔ ساری رات سڑکوں پر مارا مارا پھرنے کے بعد جب وہ گھر آیا تو دل میں کہیں نہ کہیں ایک مبہم سی امید تھی کہ وہ بھی جاگ رہی ہوگی لیکن اس کے سارے ارمان بھربھری مٹی کی طرح نیچے بیٹھتے چلے گئے۔ وہ سر تک چادر تانے سو رہی تھی۔

اور اگلے دن وہ اس کے دفتر گیا تھا سوری کرنے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا تھا کہ وہ ایک ہفتے سے آفس ہی نہیں آرہی تھی اور اسفند کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی حالانکہ کل وہ خود اس کو آفس کے دروازے پر چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اس طرح کیسے کر سکتی تھی؟ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ شام ہوگئی تھی، تیزاب کی بوتل اس کے قریب پڑی ہوئی تھی وہ ایکدم سے کھڑا ہو گیا تھا۔ آج اس بے وفا کو اس کی بے وفائی کی سزا ہر صورت دینی ہے۔ اس نے بائیک گھر جانے والے راستے کی جانب ڈال دی۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اندر سے آوازیں آرہی تھیں۔ شاید اس کے ساتھ اور بھی کوئی تھا۔ اس کا غصہ اور سوا ہوگیا۔ اس نے بوتل والا ہاتھ پیچھے کرلیا تھا "اسفند آپ آگئے" شہوار نے جھٹ سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کو اندر لے گئی وہ دنگ رہ گیا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور مرد بیٹھے تھے۔ یہ میرے میاں اسفند، اور اسفند یہ ہیں مسٹر اینڈ مسز امجد میرے گائنا کالوجسٹ...... " اسفند کے اندر کہیں جوار بھاٹا پھٹا تھا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوگیا تھا۔

سامنے میز پر کیک کے اوپر "ہیپی نیو ائیر" کے الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ "اسفند آپ کی اہلیہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے، اس کے کیس میں کچھ کمپلیکیشن تھیں اس لیے وہ آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں جب جب اس کو بلاتی تھی یہ آجایا کرتی تھی۔"

" ہاں جی پورا ایک ہفتہ میں آفس میں نہیں گئی اس لیے...... " شہوار نے چہک کر کہا اور ساتھ ہی کیک کا ٹکڑا اسفند کے منہ میں ڈال دیا۔ اسفند کے ہاتھ میں تھمی تیزاب کی بوتل نیچے جا گری تھی۔ اس نے پشیمانی سے سر جھکا لیا تھا۔ گزشتہ الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ چاروں طرف ایک ہی بازگشت تھی "ہیپی نیو ائیر"

”ناتمام“

مرزا حامد

اب کی بار وہ خود کے آگے بھی بے بس تھا۔ وہ ہڈیوں کا ایک پنجر بن چکا تھا۔ چہرے میں دھنسی کالی سیاہ آنکھیں اور چہرے سے ٹپکتی المناک حسرت اور غمناکی نے اسے ایک زندہ لاش بنا دیا تھا۔ یقیناً اس نے کئی ایک خواب دیکھے تھے لیکن آج وہ زندگی کی راہ میں کس موڑ کھڑا تھا.....؟ وہ خود سے بھی اکثر یہ سوال کیا کرتا۔

ایک مجرم کی کہانی، وہ ہر جرم کے بعد یہ کام چھوڑنے کا پختہ عہد کرتا تھا

رابرٹ، باس ہنری کے لیے برسوں سے کام کر رہا تھا۔ تقریباً دس سال کی عمر میں جبکہ رابرٹ سڑک کنارے پڑے روٹی کے ٹکڑے اُٹھا کر کھایا کرتا تھا، ہنری نے رابرٹ کو اپنے پاس رکھا تھا۔ نہری علاقے کا سرغنہ عادی مجرم تھا لیکن رفتہ رفتہ اس شعبہ کا ایک تجربہ کار، سیاہ کار بن چکا تھا اور اب وہ نہ صرف اپنے علاقے میں ہونے والی بہت ساری کارروائیوں میں حصہ دار تھا بلکہ دوسرے بڑے نیٹ ورکس میں بھی ساجھے دار تھا۔

رابرٹ کو ہنری نے جاسوسی کے لیے ٹرینڈ کیا تھا۔ ایک چھوٹا بچہ آسانی سے پولیس کی نظروں سے بچ کر

اپنا کام کر سکتا تھا نا صرف پولیس کی مخبری کرنا رابرٹ کے کام کا حصہ تھا بلکہ عام علاقے کے مکین بھی رابرٹ کی جاسوسی کی فائلوں کا حصہ تھے جن میں ان کی پرسنل نوعیت کی معلومات بھی رابرٹ حاصل کر کے ریکارڈ میں رکھتا تھا۔

رابرٹ بنیادی طور پر ایک خاموش سنجیدہ انسان تھا۔ بچپن میں والدین کے فوت ہو جانے کے بعد وہ یتیم ہو گیا تھا، کوئی خاص قریبی رشتہ دار بھی نہ تھا جو رابرٹ کی نگہداشت کی ذمہ داری لیتا یا اس کی کفالت کرتا وہ ابتدائی کچھ عرصہ ایک فلاحی ٹرسٹ میں رہا پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور منشیات فروشوں اور جرائم پیشہ افراد کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں یہ لوگ ناسور ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے جرائم کرنا تو ان کا معمول ہوتا ہے۔

باس ہنری کا نیٹ ورک بھی ایسے ہی ایک گروہ کا حصہ تھا۔ رابرٹ صرف جاسوس رسانی کی حد تک ہی کام کرتا تھا۔ یہ کام اس کی فطرت سے ویسے بھی قریب تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک حساس انسان تھا اور اس طرح کی مجرمانہ زندگی سے بیزار بھی، لیکن پیٹ کے ہاتھوں مجبور چار و ناچار وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھا۔ ایک روز اس نے سکول میں پڑھانے والی ایک استانی کا پرس چھیننے کی کوشش بھی کی تھی۔ رابرٹ کو جو اطلاع ملی تھی اس کے مطابق یہ لڑکی ایف۔ بی۔ آئی میں کام کرنے والے ایک آفیسر کی بھتیجی تھی اور اس کے پاس ان کے نیٹ ورک سے متعلق کچھ معلومات تھیں۔

لیکن اس کوشش میں وہ پکڑا گیا۔ لوگوں نے اس کی اچھی خاصی درگت بنائی اور پولیس کے حوالہ کر دیا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ رابرٹ پولیس کے ہتھے چڑھا تھا کم عمری میں بھی وہ حوالات کی ہوا کھا چکا تھا لیکن ایک تو کم عمری اور دوسرا اچھے رویے اور دینی اصلاحی پروگرام میں شرکت کرنے کی بدولت اسے جلد ہی رہائی مل جایا کرتی تھی لیکن جب کبھی بھی وہ ایسی قید سے رہائی پا کر باہر نکلتا تو اپنی گزشتہ طرز زندگی اور عادت سے تنگ دوبارہ گندگی کے ڈھیر میں گر جاتا۔

اکثر وہ اپنی گزشتہ خرافات کو یاد کرتا اور خود کو ملامت کرتا۔ ایسے میں وہ جوش جذبات سے مغلوب ہو کر شراب اور جواء کا سہارا لیا کرتا۔

آخری مرتبہ جب وہ ایسی ہی رہائی سے باہر نکلا تو اس کے دوسرے ساتھی حیران تھے کہ رابرٹ اب ان جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ اکثر نماز بھی پڑھنے لگا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ پھر سے شراب اور دیگر نشوں کا سہارا لے لیتا۔ اب کی بار جیل جانا رابرٹ کو بہت مہنگا پڑا۔ اشتہاری ہونے کی وجہ سے اور نشہ بھی برآمد ہونے پر وہ آٹھ سال کے لیے بند ہوا۔ یہ عرصہ اس کے لیے نہایت اذیت ناک تھا کیونکہ اب کی بار نشہ کی لت بھی اسے جھنجھوڑتی تھی۔ وہ کوئی عادی نشئی نہیں تھا لیکن اس کا ماضی اس کے لیے ایک دردناک بلا کی مانند اسے ڈراتا اور اس کی راتوں کی نیندیں اڑاتا اور اس کا ضمیر تو گویا اسے مار ہی ڈالتا۔

اب کی بار وہ خود کے آگے بھی بے بس تھا۔ وہ ہڈیوں کا ایک پنجر بن چکا تھا۔ چہرے میں دھنسی کالی سیاہ آنکھیں اور چہرے سے ٹپکتی المناک حسرت اور غم نا کی نے اسے ایک زندہ لاش بنا دیا تھا۔ یقیناً اس نے کئی ایک خواب دیکھے تھے لیکن آج وہ زندگی کی راہ میں کس موڑ کھڑا تھا......؟ وہ خود سے بھی اکثر یہ سوال کیا کرتا، کبھی وہ خود کو ملامت کیا کرتا تو کبھی اپنی قسمت کو...... اور کبھی سماج کو......وہ انصاف چاہتا تھا......لیکن کس سے ......؟ وہ رونا چاہتا تھا لیکن کس کے کندھے لگ کر......اسے تو سارا سماج، معاشرہ یہاں تک کہ اپنا وجود بھی ایک دھوکا لگنے لگتا تھا۔

وہ اپنے گزشتہ ماضی کو بھول جانا چاہتا تھا اور ایک

نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ باس ہنری کو تو وہ اپنی زندگی کی کتاب سے سیاہی والے گندے کاغذ کی مثل پھاڑ کر الگ کر دینا چاہتا تھا۔

آج آٹھ برس گزرنے کے بعد جیل سے رہا ہو کر وہ شہر کے ایک پُر ہجوم چوراہے پر کھڑا تھا۔ رات کے تقریباً 12 بجے تھے کہ یکا یک تند و تیز گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی وہ تیزی سے قریب ہی واقع ریسٹورنٹ کی طرف بھاگا۔ بارش نے سر سے پاؤں تک اسے بھگو ڈالا تھا۔ اس نے اپنا کوٹ اور مفلر ٹیبل کے ساتھ پڑی کرسی پر ڈالا اور ویٹر کو آواز دی ”ایک کپ گرم گرم چائے چاہیے“ وہ اپنی تھکی سی آواز میں بولا۔ ویٹر نے آہستہ سے سر ہلایا اور ”جی جناب ابھی لے کر آیا“ کہہ کر رفو چکر ہو گیا۔

ریسٹورنٹ میں لگے TV کی سکرین پر پرانے وقت کی ایک معروف سپر ہٹ فلم چل رہی تھی۔ یہ وہ فلم تھی جسے وہ کئی بار بڑی شان سے سینما میں جا کر دیکھ چکا تھا۔

ریسٹورنٹ میں رات کی اس تاریکی میں ایک جادوئی سکوت تھا اور باہر دھڑا دھڑ ہونے والی زور دار بارش نے ویرانی اور خوف کا منظر بنا ڈالا تھا۔ ”یہ لیجیے جناب گرما گرم چائے“ رابرٹ ویٹر کی آواز سے چونک گیا۔ وہ فلم دیکھنے میں ایسا کھو گیا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اپنی پینٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر اور سامنے میز پر پڑے ماچس کی تیلی سے اسے لگا کر وہ اس کے دھوئیں اُڑا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے...... بہت شکریہ“ وہ ماضی کی یادوں میں کہیں کھویا کھویا سا بولا۔ ویٹر اگلے ہی لمحے وہاں سے رفو چکر ہو چکا تھا جیسے اس نے اس کی بات سنے بغیر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس شخص کو اور کچھ نہیں چاہیے۔

رابرٹ اب کی بار اس وقت چونکا جب اس کے سیل فون پر زور سے گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کو قریب لا کر دیکھا۔ سیل کی سکرین پر باس ہنری کا نمبر تھا۔ وہ فون کاٹ دینا چاہتا تھا لیکن نا چاہتے ہوئے بھی وہ فون کان سے لگا چکا تھا۔

”ہیلو دوست! تم تو شاید ہمیں بھلا ہی بیٹھے ہو“ باس ہنری کے لہجہ میں عجیب سا تاثر تھا۔

رابرٹ خاموش تھا اور سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کیا بات کرے۔ ”دیکھو مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ تم باہر آ چکے ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارا دوست باہر ہو اور ہمارے درمیان میں نہ ہو، مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تم کس کیفیت میں ہو گے لیکن دوست یہ دھندہ ہی ایسا ہے۔ یہ تو بڑے بڑوں کو باندھ دیتا ہے“۔ باس ہنری وضاحت دینے لگا۔

”دیکھو! باس اس وقت میری طبیعت بہت ناساز ہے......“ رابرٹ بڑبڑایا۔ ”تم فکر مت کرو! تم صرف اتنا بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو؟ میں آدمی کو بھیج رہا ہوں“ باس ہنری جلدی سے بولا۔

”نہیں! اس وقت نہیں میں کل خود آؤں گا“ رابرٹ نے اپنی تھکی سی آواز میں کہا۔

”تم فکر مت کرو! میں تمہارے پرانے جگری دوست جارج کو تمہارے بارے میں بتا چکا ہوں وہ پانچ منٹ میں تمہارے پاس پہنچ جائے گا تم صرف اتنا بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو“۔

رابرٹ تو گویا اس وقت نیم بیہوش تھا اس کی نظریں سکرین پر چلنے والی اس فلم پر ٹکی ہوئی تھیں اور اپنے بے جان سے ہاتھ میں سیل فون پکڑے ٹانگیں پھیلائے کرسی پر نیم مُردہ سی حالت میں گرا پڑا تھا۔ ایک سحر انگیز خاموشی کے وقفے کے بعد وہ بڑبڑایا۔

”والٹن روڈ پر واقع پیراڈائیز ریسٹورنٹ میں ہوں“ وہ نیم مُردہ سی آواز میں بڑبڑایا اور فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد بارش تھم چکی تھی اور رات کے اس پہر اس ویران چوراہے میں لگے برقی قمقمے پوری طرح روشن تھے اور ایک سحر زدہ خاموشی اپنا جادو بکھیر رہی تھی۔

ذہانت تیز کرنے والی غذائیں

حکیم راحت نسیم سوہدروی

بلاشک ذہانت قدرتی اور پیدائشی ہوتی ہے اور اسے عطیہ خداوندی قرار دینا چاہیے۔ تاہم اس کا صحت مند جسم اور غذا سے گہرا تعلق ہے۔
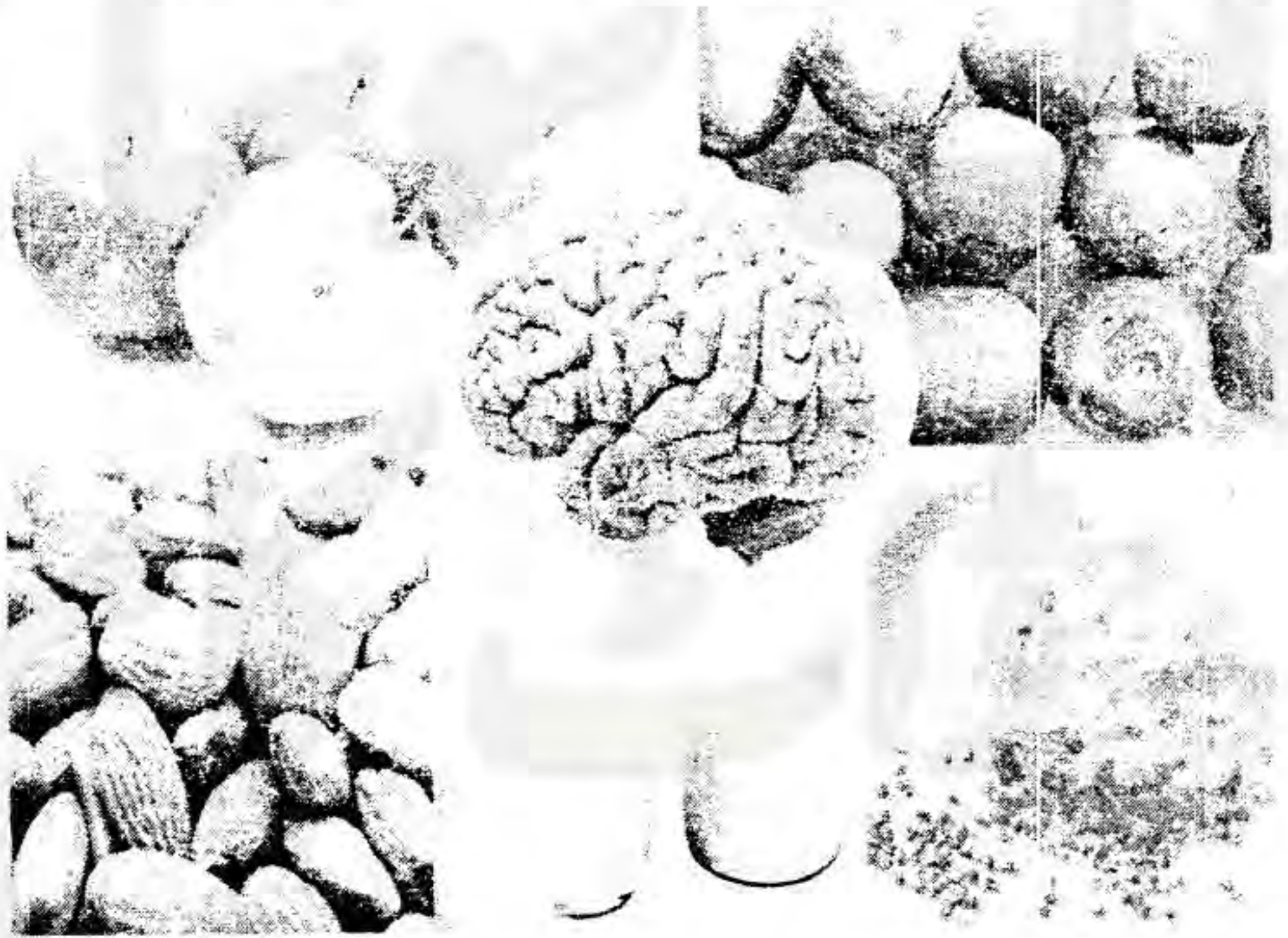
ذہانت قدرتی ہوتی ہے۔ اگر دماغ صحت مند اور کسی قسم کی دماغی پیچیدگی نہ ہو تو دماغ کی کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ البتہ علم و ہنر سے اسے مزید چمکایا جاسکتا ہے۔ بلاشک ذہانت قدرتی اور پیدائشی ہوتی ہے اور اسے عطیہ خداوندی قرار دینا چاہیے۔ تاہم اس کا صحت مند جسم اور غذا سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ صحت سے

عاری شخص صحت مند دماغ کا مالک ہو۔ صحت مند دماغ اور صحت مند جسم کے لیے صحیح غذا کا ہونا ضروری ہے۔ اگر غذا صحیح اور متوازن نہ ہو تو انسان دماغی اور جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ جس کے اثرات ذہانت پر بھی ہوتے ہیں اور سارا جسمانی نظام متاثر ہوتا ہے۔

آج کے دور میں طرز زندگی اور غذائی عادات کی تبدیلیوں نے انسانی صحت اور دماغ کو متاثر کردیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ذہنی استعداد کار یا ذہانت متاثر ہورہی ہے اور نسیان یا یاداشت میں کمی جیسے عوارضات بڑھ رہے ہیں۔ طب وصحت کے ماہرین کہتے ہیں کہ بعض غذائیں دماغی قوتوں کو توانا رکھتی ہیں جس سے ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ مائیں جو اپنے بچوں کو ایسی مفید غذائیں دیتی ہیں اس سے ان کی صحت ہی بہتر نہیں رہتی بلکہ ان کی ذہنی صلاحیتیں اور دماغی استعداد کار اپنے ہم عمر ساتھیوں سے بڑھ جاتی ہے۔ پوری دنیا میں اعلیٰ تعلیمی کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے آئی کیو کو معیار بنایا جارہا ہے۔ یعنی قابلیت اور اہلیت کو ذہانت کی پیائش کے ذریعے تسلیم کیا جارہا ہے۔ اس طرح ذہنی صحت اور جسمانی صحت کی طرف توجہ دینا انتہائی اہم ہے۔

بڑھاپے کے مسائل میں یاداشت کی کمی (الزائمر) عام مسئلہ بن گئی ہے۔ اس طرح وہ تمام لوگ جو ذہانت کو قائم اور یاداشت کو بہتر بنانے کے خواہش مند ہیں انہیں دماغی طاقت کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ ماہرین طب وصحت کا کہنا ہے کہ صحت مند جسم میں جب گردش خون (خون کا دورہ) باقاعدہ ہوتا ہے تو جسم اس کے ذریعے غذائیں دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے جن میں سے دماغ اپنی ضرورت کی غذائیں منتخب کرلیتا ہے مگر جب دوران خون یعنی خون کا دورہ باقاعدہ نہ ہو تو دماغ کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا نہیں ملتی۔ جس کے نتیجے میں دماغ ضعف کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں دماغی کمزوری کے سبب یاداشت میں کمی ہونے لگتی ہے۔

انسانی زندگی میں بچپن سے نوجوانی کی طرف گامزن ہوتے ہوئے مناسب غذا کا استعمال بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ بڑا اہم دور ہوتا ہے جب غذا کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں غذائی کمی کے سبب خون کی کمی ہوسکتی ہے جس سے گردش خون میں فرق آئے گا اور جسم کا اعصابی نظام شکست وریخت کا شکار ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر بچے جو بچپن میں صحت مند وتوانا ہوتے ہیں نوجوانی میں خون کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس سے جسمانی طور پر کمزوری ہو جاتی ہے اور پھر دماغی طور پر صحت مند نہیں رہتے۔ ان کی یاداشت متاثر ہوتی ہے اور آئی کیو لیول کم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دماغی یادداشت بہتر بنانے کے لیے ادویہ کی بجائے غذائی اشیاء پر توجہ دینا چاہیے۔ ماہرین طب وصحت کا کہنا ہے کہ فاسفورس دماغی طاقت کے لیے بہت اہم ہے۔ لہٰذا ایسی غذائیں استعمال کرنی چاہیے جن میں فاسفورس اور لحمیات کی مقدار زیادہ ہو۔ ایسی غذاؤں میں مچھلی کا گوشت سرفہرست ہے کیونکہ مچھلی میں فاسفورس بکثرت ہوتا ہے۔ اسی طرح انڈا' دودھ' مکھن اور بادام بھی مفید ہیں۔ مغزیات' پستہ' اخروٹ' کشمش اور پنیر کے علاوہ چنے' مٹر اور سویابین دماغ کے لیے مفید ہیں۔ فاسفورس کے علاوہ وہ سب اجزاء ہوتے ہیں جو اعصاب اور فضلات کو توانائی دیتے ہیں۔ ہلکی زود ہضم غذائیں دماغ کو تروتازہ اور بیدار رکھتی ہیں۔

سرخ گوشت سے، بچ کر رہیں۔ درج ذیل غذاؤں کا استعمال دماغ کو تقویت دیتا ہے۔ اس طرح ذہانت بھی بڑھتی ہے۔

بادام

بادام مغزیات میں سرفہرست ہے۔ یہ ایک مفید صحت بخش غذا ہے۔ جو دماغ اور اعصاب کو قوت دیتی ہے۔ بینائی میں بھی فائدہ مند ہے۔ روزانہ پانچ سے سات بادام رات پانی میں بھگو کر صبح چھیل کر دودھ کے ساتھ کھانا چاہیے۔ ان کا مسلسل استعمال دماغی کمزوری سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ بادام کی پانچ چھ عدد مغز گرائنڈ کر کے پیس لیں اور دودھ میں حسب ضرورت میٹھا کر کے اس میں ملا کر روزانہ صبح پی لیا کریں۔

دودھ

دودھ ایک مکمل غذا ہے۔ ہر عمر کے افراد کے لیے یکساں مفید ہے۔ انسان صدیوں سے گائے، بھینس، بکری، اونٹنی اور بھیڑ کا دودھ بطور غذا استعمال کرتا چلا آرہا ہے۔ دودھ میں تمام صحت بخش اجزاء پائے جاتے ہیں۔ دودھ جسمانی طاقت اور دماغی کمزوری کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ دودھ روزانہ صبح یا سرپہر شہد خالص ملا کر پینا چاہیے اور ہمیشہ باقاعدگی سے پینا چاہئے۔

سیب

سیب دنیا بھر میں ملنے والا اور پھلوں میں سب سے زیادہ توانائی بخش ہے۔ تمام عمر کے لوگ کھا سکتے ہیں۔ سیب میں فاسفورس تمام پھلوں سے زیادہ پایا جاتا ہے اور چھلکوں میں حیاتین ج کی بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ سیب خون صالح پیدا کرتا ہے۔ دماغ کے لیے ایک موثر غذائی ٹانک ہے۔ قوت حافظہ بڑھاتا ہے۔ سیب میں پائے جانے والا ایک ایسڈ جگر، دماغ اور آنتوں کے لیے بہت مفید ہے۔ کمزور دماغ، اعصاب اور قلب لوگوں کے لیے بہت مفید ہے۔

آملہ

آملہ غذائی اور دوائی افادیت رکھتا ہے۔ دماغ کو تقویت دیتا ہے اور یادداشت بڑھاتا ہے۔ اطباء صدیوں سے اپنی ادویہ میں استعمال کرتے آرہے ہیں۔ حیاتین ج آملہ میں بکثرت موجود ہوتی ہے۔ خشک آملوں کا سفوف بنالیں اور برابر وزن شکر ملالیں روزانہ ایک سے دو چمچ تازہ پانی سے کھانا مفید ہے۔ آملہ کا مربہ بھی بنایا جاتا ہے۔ جو دماغی طاقت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اس طرح بصارت پر بھی خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ تازہ آملہ کا ایک چمچ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بیر

بظاہر یہ ایک چھوٹا سا پھل ہے مگر ضروری غذائی اجزا سے بھرپور ہے۔ ایک سوگرام بیروں میں 74 کیلوریز (حرارے) ہوتے ہیں۔ بیر جسم میں گلوٹا لک ایسڈ کا اخراج بڑھا دیتا ہے۔ اس طرح دوران خون تیز ہوکر دماغ کی کارکردگی بڑھا دیتا ہے۔ بیر استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مٹھی بھر بیر خشک آدھے لیٹر پانی میں اس وقت تک اُبالیں کہ پانی نصف رہ جائے پھر ضرورت کے مطابق شہد ملا کر رات ہونے سے قبل پی لیا جائے۔

کالی مرچ

کالی مرچ کو مصالحوں کی ملکہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اعصاب کی طاقت کے لیے ٹانک کا درجہ رکھتی ہے۔ یادداشت کو بہتر بنانے میں بہت مفید ہے۔ چٹکی بھر کالی مرچ کا سفوف شہد خالص ایک چمچ میں ملا کر روزانہ چاٹ لینا کمزور دماغ والوں کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔

سونی مندر کا آدم خور

سعید احمد صدیقی

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آنِ واحد میں اُلٹی ہوئی پالکی کے پاس پہنچ گیا۔
پالکی میں دلہن بے ہوش پڑی تھی اور دولہا غائب............!

ایک درندے کا قصہ جس نے کئی انسانی بستیاں ویران کردی تھیں

مغل بادشاہ دارالشکوہ کا بسایا ہوا شکوہ آباد ہندوستان کے صوبہ یوپی میں اس لیے معروف ہے کہ یہاں ہندوستان کی ایک بڑی طب فیکٹری ہے۔ یہ کارخانہ اردگرد کے دیہاتوں کو بڑے پیمانے پے روزگار فراہم کرتا ہے۔ شکوہ آباد سے بارہ میل دور ہندوستان کا سب سے گہرا اور تند رو دریائے چمبل بہتا ہے۔ دریائے چمبل کے پانی کو اگر آب مقطر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اگر کوئی سکہ پانی

میں ڈال دیا جائے تو وہ تہ میں بالکل صاف نظر آتا ہے۔ دریا کے دونوں طرف گھنے جنگل ہیں جن سے شیشم و ساگوان، کیکر، پیلو اور دیگر عمارتی لکڑی بکثرت دستیاب ہوتی ہے۔ دریائے چمبل کے بائیں کنارے تقریباً بیس میل کے طویل علاقے پر مونج (سرکنڈے) کا جنگل پھیلا ہوا ہے۔ اب سے بارہ سال پہلے جب اسفنج اور نائلون کا رواج نہ تھا تو یہ جنگل شکوہ آباد کی طب فیکٹری کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ بلب کی پیکنگ کے لیے لکڑی کی پیٹیوں میں مونج کے ریشے کام میں لائے جاتے تھے۔ مونج کی کٹائی کرنے والے افراد نے سرکاڈوں کے اس جنگل کے کنارے ایک بستی بسائی تھی۔ دریا کے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے جنگل میں ہرن، چیتل، بارہ سنگھے، نیل گائے، سُور اور شیروں کی کثرت تھی۔

چمبل کے گھاٹ سے تین میل دُور دریا اُلٹا بہتا ہے یعنی بہاؤ بجائے مغرب مشرق کے مشرق سے مغرب کی سمت ہو جاتا ہے۔ شاید دریا کے اسی غیر معمولی بہاؤ کی بنا پر دریا کے کنارے سے ایک سومندر ایک قطار میں بنے ہوئے ہیں۔ ان مندروں کے قریب جو بستی ہے اُسے بھی سومندر کے نام سے پکارا جاتا تھا جو اب بگڑتے بگڑتے سونی مندر ہو گیا تھا۔ بہت مدت سے سونی مندر کے اطراف میں ایک آدم خور شیر نے تباہی مچا رکھی تھی۔ مونج کے جنگل کے مزدوروں کی بستی اُجڑ چکی تھی جس کی وجہ سے شہر کی بلب فیکٹری کے لیے پریشانی کا سامنا تھا۔ سونی مندر میں ہر سال مویشیوں کا ایک بڑا میلہ لگا کرتا تھا۔ لاکھوں کی خرید و فروخت ہوتی۔ حکومت کو اس میلے سے بڑی آمدنی تھی۔ اُس سال آدم خور کے خوف سے میلہ بُری طرح متاثر ہونے والا تھا لہٰذا حکومت بھی آدم خور کی ہلاکت میں دلچسپی لے رہی تھی۔ کئی شکاری پارٹیاں ناکام ہو چکی تھیں اور دو شکاری بھی آدم خور کا لقمہ تر بن چکے تھے۔

1954ء کا ذکر ہے مجھے اپنے ایک ہندو دوست گجا دھر کی شادی میں سونی مندر جانا پڑا۔ ہم لوگ دلہن کو رخصت کرا کے دربٹ پور سے سونی مندر واپس آ رہے تھے۔ بارات کے قافلے میں اونٹ، گھوڑے، ڈبے اور لہرو بھی شامل تھے۔ زیادہ تر باراتیوں کے پاس اپنی اپنی بندوقیں تھیں جو خوشی کے ایسے موقعوں پر ہوائی فائر کے لیے ساتھ لے لی جاتی ہیں۔ دولہا منہ پر ٹکٹ و سہرا، ڈالے اپنی دلہن کے ساتھ ایک پالکی میں بیٹھا تھا، جسے چار کہار اُٹھائے بارات کے آگے آگے چل رہے تھے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ اب بارات ایک ڈھلوان سے اُتر رہی تھی کہ میں انتہائی بلندی پر اور پالکی انتہائی نشیب میں اور ہم دونوں کے بیچ میں باقی باراتی چل رہے تھے۔ ہم لوگ دربٹ پور سے دو میل دُور آ چکے تھے۔ یکایک میں نے دیکھا باراتی بدحواس ہو کر اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ پالکی اُلٹی پڑی ہے اور چیخ پکار سے جنگل گونج رہا ہے۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آن واحد میں اُلٹی ہوئی پالکی کے پاس پہنچ گیا۔ پالکی میں دلہن بے ہوش پڑی تھی اور دولہا غائب ...... پالکی کے بائیں طرف خون کا ایک بڑا سا دھبا پھیلا ہوا تھا اور چھوٹے چھوٹے دھبے بائیں سمت کی جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ماحول کو سانپ سونگھ گیا ہو جب مجھے پالکی کے قریب کھڑے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تو آس پاس کی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے باراتی فائر فائر کا شور کرتے ہوئے پالکی کی طرف دوڑے ان میں سے

بعض بندوقوں سے ہوائی فائر بھی کرتے جاتے تھے۔ پالکی کے ایک، کمار کو میں نے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔
''کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا؟ گجادھر کہاں ہے؟''۔
کمار کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس نے بمشکل ہکلاتے ہوئے بتایا کہ جب وہ پالکی اٹھائے ڈھلان کے آخر میں پہنچے تو یکا یک سڑک کے کنارے سے جھاڑی میں چھپا ہوا شیر اُن کی طرف لپکا۔ شیر کو دیکھتے ہی انہوں نے پالکی کو کھڑے سے چھوڑ دیا اور جان بچا کر ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ دولہا اور دلہن سڑک پر گر پڑے اور ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ شیر دولہا کو منہ میں دبا کر سڑک کی بائیں طرف جھاڑیوں میں روپوش ہوگیا۔
میں نے جلدی سے ایک باراتی کی توڑے دار بندوق چھینی اور جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ سڑک سے تقریباً سو گز دُور گجادھر کی لاش ایک سوکھی جھاڑی میں پھنسی ہوئی مل گئی۔ شیر نے اس کا نرخرہ چبا ڈالا تھا اور چہرہ مسخ کردیا تھا۔ قریب ہی مکٹ پڑا تھا تھوڑی ہی دیر میں بہت سے باراتی شور کرتے ہوئے میرے، پاس پہنچ گئے۔
میں نے بہت کوشش کی کہ گجادھر کی لاش ایک رات کے لیے، وہیں پڑی رہنے دی جائے تاکہ آدم خور کا شکار کیا جاسکے۔ لیکن باراتی کسی قیمت پر رضا مند نہ ہوئے۔ میں بھی لوگوں کے جذبات اور موقع کی نزاکت کے پیش نظر خاموش ہوگیا۔ باراتی جب حسرت زدہ دلہن اور گجادھر کی مسخ شدہ خون میں نہائی ہوئی لاش لے کر سونی مندر میں داخل ہوئے تو گجادھر کے گھر کی عورتوں کے بین اور آہ و زاری کی حالت بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں

ہیں۔ گاؤں کی عورتیں بیوہ لڑکی کو منحوس اور اس حادثے کا موجب قرار دے رہی تھیں۔ میں اس حادثے سے اس قدر متاثر ہوا کہ جی چاہتا تھا کہ ابھی بندوق لے کر جنگل میں گھس جاؤں اور اُس خوفناک بلا کے چیتھڑے اُڑا کے رکھ دُوں جس نے دو کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل ڈالا تھا۔ وہ رات میں نے جاگ کر گزاری۔ صبح ہوتے ہی بدنصیب دلہن کو دولہا کی موت کی منحوس خبر کے ساتھ ہی دربٹ روانہ کردیا گیا اور میں نے بھی اپنا رخت سفر باندھا لیکن سونی مندر سے روانہ ہوتے وقت میں نے عزم مصمم کیا کہ میں جلد ہی آدم خور درندے سے دو دو ہاتھ کرنے سونی مندر پھر واپس آؤں گا اور اپنے دوست کا بدلہ لیے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا...... یا تو میں درندے کو موت کے گھاٹ اُتار دُوں گا یا خود گجادھر کی طرح اس کا لقمہ بن جاؤں گا۔
شہر آکر کاروباری مصروفیات اور دیگر ہنگاموں نے کچھ اس طرح گھیرا کہ سر اٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔ دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصے میں آدم خور کی خون آشامی کی خبریں اخبار کی سرخیاں بنتی رہیں۔ اس کی ہیبت سے سونی مندر کے آس پاس کی بستیاں ویران ہوگئی تھیں۔ کھیتوں میں ریت اُڑنے لگی تھی کیوں کہ کسان کھیتوں پر کاشت کرنے سے گھبراتے تھے۔ درندہ اس قدر نڈر ہوچکا تھا کہ دن دیہاڑے گھروں میں گھس کر اپنا حصہ اٹھا لے جاتا۔
ذہنی سکون میسر آیا تو ایک روز میں نے ایک شکاری دوست انوار خاں پر اپنے ارادے کا اظہار کیا اور اُن کی رفاقت کی خواہش کی۔ پہلے تو انہوں نے پس و پیش کی لیکن جب میں نے انہیں انسانیت اور غریبوں کی زندگی کا واسطہ دیا تو موم ہوگئے۔ آخرکار دو ماہ کے بعد میں انوار خاں کو اپنے ساتھ لے کر آدم

خور سے نپٹنے کے لیے پھر سونی مندر کی طرف روانہ ہوگیا۔

جس وقت بس نے ہمیں چمبل گھاٹ اُتارا شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ کشتی میں بیٹھ کر ہم نے چمبل پار کیا اور سونی مندر کے لیے روانہ ہوگئے۔ ابھی ہم گھاٹ سے بمشکل ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ سامنے سے چند دیہاتی چارپائی پر ایک مُردے کو لیے آتے نظر آئے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ چمبل گھاٹ ہندوؤں کا شمشان بھی تھا جہاں وہ مُردے جلا کر اُن کی راکھ چمبل کی لہروں کی نذر کر دیتے تھے۔ لاش قریب آئی تو میں چونک پڑا کیوں کہ اس پر پڑے ہوئے سفید کپڑے پر جگہ جگہ خون کے دھبے بکھرے ہوئے تھے میں نے ایک دیہاتی کو روک کر معلوم کیا کہ کیا قصہ ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ سونی مندر کے ایک پجاری کی لاش ہے جسے درندے نے اُس وقت نشانا بنایا جب کہ وہ رفع حاجت کے لیے مندر سے تھوڑے فاصلے پر جھاڑیوں کے قریب بیٹھا تھا۔ آدم خور نہ جانے کب سے وہاں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ درندہ پجاری پر پیچھے سے حملہ آور ہوا اور اس سے پہلے کہ پجاری سنبھلتا اس کی گردن مور درندے کے آہنی جبڑوں میں تھی۔ یہ سارا منظر مندر کی چھت پر کھڑا ہوا دوسرا پجاری دیکھ رہا تھا۔ اُس نے وہیں سے باگھ باگھ کی کا شور بلند کیا۔ غل غپاڑہ سن کر دوسرے مندروں سے پجاری نکلے اور چیختے چلاتے اس طرف دوڑے جدھر آدم خور پجاری کو لے کر غائب ہوا تھا شور اور ہنگامے سے گھبرا کر شیر نے پجاری کی ایک ہی ٹانگ کھانے پر اکتفا کیا اور لاش چھوڑ کر فرار ہوگیا۔

میں نے اُن دیہاتیوں کو بتایا کہ ہم لوگ آدم خور کو مارنے کے لیے آئے ہیں اگر وہ آج رات پجاری کی لاش وہیں رہنے دیں جہاں سے یہ اٹھائی گئی ہے تو ممکن ہے کہ آدم خور کو ٹھکانے لگایا جاسکے لیکن وہ اپنے مذہبی پیشوا کی مزید بے حرمتی کے لیے تیار نہ ہوئے اور میرے ہزار سمجھانے کے باوجود لاش لے کر مرگھٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مجبور تھا کیا کرسکتا تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ جب ان کمبختوں کو خود اپنی اچھائی برائی کا احساس نہیں تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتے پھریں لیکن مہا گجادھر کی موت نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ پھر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے سونی مندر کی طرف روانہ ہوئے۔

میں نے راستے میں انوارخاں سے مشورہ کیا کہ اگر آج رات ہی ہم لوگ اُس جگہ آدم خور کے انتظار میں بیٹھیں جہاں سے پجاری کی لاش اٹھائی گئی ہے تو ممکن ہے کچھ کام بن جائے۔ انوارخاں نے کہا:۔

"لاش اٹھائی جاچکی ہے، اس لیے درندے کی واپسی کا امکان کچھ کم ہی ہے بہرحال اہتمام حجت کے لیے اگر آج رات گھات میں بیٹھا جائے تو کوئی حرج بھی نہیں"۔

سونی مندر پہنچ کر ہم نے لوگوں سے مختلف معلومات حاصل کیں۔ اس بستی کے باشندے اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ درندے کو مافوق الفطرت ہستی سمجھتے تھے۔ بعض کمزور عقیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ آدم خور گنیش دیوتا کا دوسرا روپ ہے۔ دو سال پہلے انہی مندروں میں سے ایک مندر کے پجاری نے گاؤں کی ایک دوشیزہ کو خراب کیا تھا اور رات ہی رات کہیں فرار ہوگیا تھا۔ شدت غم اور احساس ذلت سے گھبرا کر لڑکی نے دوسری صبح چمبل کی لہروں میں چھلانگ لگا دی اور چند روز میں گنیش دیوتا نے شیر کا روپ دھار کر اس بستی کے پاپی

لوگوں سے بدلہ لینا شروع کردیا تھا۔ بے جان پتھروں کی پرستش کرتے کرتے ہندو عقل کا ایسا دشمن ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بھی ایسی بات پر آسانی سے یقین کرلیتا ہے کہ جس کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ان سادہ لوح لوگوں سے بحث فضول تھی۔ میں نے اُن سے وہ جگہ دکھانے کو کہا جہاں سے پجاری کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ دو دیہاتی اس شرط پر ہمارے ساتھ جانے کے لیے رضا مند ہوئے کہ انہیں واپس بستی میں چھوڑ دیا جائے گا۔

شام ڈھل چکی تھی، رات کے سیاہ گیسو پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ اتنے مختصر عرصے میں مچان باندھنا ممکن نہ تھا۔ پجاری کی لاش کے اطراف میں رات گزارنے کے لیے جب نظر دوڑائی تو خوبی قسمت سے اُس جگہ سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر مہوے' کا ایک گھنا درخت نظر آیا۔ جگہ کا انتخاب کرکے ہم لوگ دیہاتیوں کو سونی مندر چھوڑنے گئے اور جلد ہی پھر واپس آگئے۔ لاش کے مقام سے سوگز کے نواحی علاقے کا ایک بار جائزہ لیا اور پھر میں خان صاحب کو لے کر مہوے کے درخت پر چڑھ گیا۔ زمین سے تقریباً دس فٹ بلندی پر درخت کا تنا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ نچلے دو شاخے میں، میں اور اوپر کے دوشاخے میں انوار خاں بیٹھ گئے۔ دن بھر کے سفر کی تھکان تھی لہٰذا ہم نے تھرماس میں ایک ایک کپ چائے نکال کر پی اور پھر آنے والے ہیجان خیز لمحات کے لیے تیار ہو گئے۔

جنگل کی چاندنی رات سے وہی لوگ واقف ہیں جنہیں سحر انگیز راتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ان راتوں میں فطرت محو گفتگو ہوتی ہے یہ بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ اگرچہ ابھی موسم سرما شروع ہوا تھا۔ تاہم گلابی جاڑوں کی کیفیت پائی جاتی تھی ہم جس درخت پر درندے کی گھات میں بیٹھے تھے اس کے سامنے ہی بیس گز قطر کا ٹکڑا تھا جو سخت زمین ہونے کی وجہ سے نباتات سے محروم تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے پجاری کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ چاندنی رات میں خون کے بڑے بڑے سیاہ دھبے درخت سے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ ٹکڑا سرکنڈوں اور گھنی جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہم لوگ درخت پر شام سات بجے بیٹھے تھے۔ اب اس وقت میری ریڈیم ڈائل گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی۔ سات گھنٹے کی اس بے حس وحرکت نشست نے اعضاء شل کردیئے تھے۔ درخت کا غلاف اُتار کر نیچے رکھ لیا۔ پتا کھڑکتا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی۔ آنکھیں بدستور چٹیل قطعے پر مرکوز تھیں۔

اچانک سامنے سرکنڈوں میں دو انگارے دہکتے نظر آئے اور رائفل پر میری گرفت سخت ہوگئی۔ انوار خاں نے پرندے کی آواز نکالی جو خطرے کی علامت تھی اور اس بات کا اشارہ کہ جھاڑیوں میں چھپی ہوئی آنکھیں انہوں نے بھی دیکھ لی ہیں۔ انوار خاں کو اپنے حلق سے پرندوں اور درندوں کی آوازیں نکالنے کی بڑی قدرت حاصل تھی اور اُن کے اس فن نے اکثر اوقات شکار میں ہماری بڑی معاونت کی تھی۔ جھاڑیوں میں حرکت ہوئی وہ دونوں آنکھیں باہر آگئیں۔ رائفل پر میری گرفت ڈھیلی پڑگئی کیونکہ ہمارے سامنے ایک قدآور جنگلی بلا کھڑا تھا۔ اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دوسری طرف جھاڑیوں میں چھلانگ لگادی۔

''غفور بھائی آج کی رات تو خوار ہوئے، اب مشکل ہے'' انوار خاں کی سرگوشی سنائی دی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے'' میں نے بھی آہستہ

سے جواب دیا۔

جھاڑیوں میں پھر زور سے حرکت ہوئی اور اب ہمارے سامنے ایک سیاہ ریچھ کھڑا تھا۔ اسی اثناء میں دوسری طرف سے ایک موٹا تازہ جنگلی سور نمودار ہوا۔ سور کے اوپر جبڑے کے دونوں طرف لمبی سفید اور تیز کانپیں نکلی ہوئی تھیں۔ ریچھ نے صاف میدان کا ایک چکر لگایا، پنجوں سے زمین کھرچی اور حلق سے گھٹی گھٹی سی سیٹی نما تیز آوازیں نکالنے لگا۔ سور چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر سر نیچا کر کے تیر کی طرح ریچھ کی طرف لپکا۔ ریچھ ایک طرف ہٹ گیا اور سور اپنے زور میں جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا لیکن فوراً ہی پھر میدان میں آ ڈٹا۔ اس بار ریچھ کی باری تھی وہ اپنے پچھلے دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر خوفناک انداز میں چیخا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ان کی بھیانک چیخوں سے جنگل گونجنے لگا۔ سور ایک بار پھر پیچھے ہٹا۔ چند لمحے کھڑا ہانپتا رہا اور پھر چیخ مار کر ریچھ پر چڑھ دوڑا۔ دوسرے ہی لمحے ریچھ بُری طرح ڈکرایا اور اُس کی آنتیں باہر نکل پڑیں۔ سور نے اپنی خنجر نما کانپیں ریچھ کے پیٹ میں اُتار دی تھیں۔ اب ریچھ زمین پر پڑا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ریچھ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس اثناء میں سور تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہانپتا رہا۔ وہ شاید ریچھ کے دوبارہ حملہ آور ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب اُسے یقین ہو گیا کہ اس کا حریف ٹھنڈا ہو چکا ہے، تو اُس نے ایک کرخت آواز نکالی گویا یہ اعلان فتح تھا اور پھر دوسری طرف جھاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔

”بھیا انوار...... رہی سہی کسر ان کمبختوں نے پوری کر دی“ میں نے کہا۔

اچانک قریب سے شیر کی دھاڑ سنائی دی اور میں نے سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں انوار خاں کی طرف دیکھا۔ میرے سارے حواس جاگ اُٹھے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میری آنکھیں ریچھ کی لاش پر جمی تھیں اور کان کسی غیر معمولی آہٹ پر لگے تھے۔ تقریباً نصف گھنٹہ اس کربناک کیفیت میں گزر گیا لیکن پھر شیر کی آواز سنائی نہ دی، مگر میری شکاری حس کہہ رہی تھی کہ جنگل کا بادشاہ ہم سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ تجربہ کار شکاری جانتے ہیں کہ جب شیر طویل آواز میں دھاڑتا ہے تو یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ علاقہ ممنوعہ ہے جس میں مداخلت بیجا برداشت نہیں کی جائے گی۔ ہر شیر کا ایک معینہ علاقہ ہوتا ہے اور اس قسم کی مخصوص دھاڑ دوسرے علاقے کے شیروں کو ایک قسم کی تنبیہ ہوتی ہے میرے اعصاب اکھڑنے لگے تھے کہ میں نے سامنے والی جھاڑیوں میں شورش محسوس کی اور دوسرے ہی لمحے ایک تھامسن گیزل (ہرن کی ایک نسل) گھبرایا ہوا کھلے قطعہ زمین پر ریچھ کی لاش کے قریب آ کر رُکا۔ وہ جس سمت سے آیا تھا اُسی سمت بار بار دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُس کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ ہرن فوراً ہی قلانچیں بھرتا دوسری طرف جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی درندہ اس کے تعاقب میں ہے اور اسی خیال کے ساتھ رائفل کاندھے اور انگلی ٹریگر پر جم گئی۔ دل کی غیر معمولی دھڑکنوں پر قابو پایا اور آنے والے لمحات کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ شاید یہی کیفیت انوار خاں کی بھی تھی۔

جھینگروں کی جھائیں جھائیں رُک گئی اور جنگل کی خاموشی نے اسرار کا لبادہ اوڑھ لیا۔ سامنے جھاڑیوں میں پھر ایک بھونچال سا آیا اور سرکنڈوں کے پیچھے دو انگارے دہکنے لگے۔ انوار خاں نے اُلو کی آواز نکالی اور مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ دوسرے

ہی لمحے آدم خور کھلے میدان میں نکل آیا۔ اس نے بڑی شان بے نیازی سے گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں سندرابن اور پیلی بھیت کے جنگلوں میں آزاد شیروں کا نظارہ کر چکا تھا لیکن زندگی میں اتنا خوبصورت شیر پہلی بار نظر سے گزرا تھا۔ چاندنی رات میں اُس کے جسم کا ایک ایک عضو چمک رہا تھا۔ بازوؤں کی اُبھری ہوئی ترشیدہ مچھلیاں اُس کی بے پناہ قوت کی نقیب تھیں۔ ستی ہوئی کمر کمان کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ وہ ریچھ کی لاش کی طرف بڑھا۔ میں شیر کی صورت میں قدرت کی صناعی میں اس قدر محو ہوگیا کہ گولی چلانے کا خیال نہ رہا۔ حُسن بہرحال حُسن ہے اور حُسن کے ساتھ ظلم کوئی سنگ دل ہی کرسکتا ہے۔ اچانک دھماکے نے مجھے چونکا دیا۔ انوار خاں نے فائر کردیا تھا۔ فائر کے ساتھ ہی شیر فضا میں اچھلا اور پھر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرا فائر ہوا اور درندہ خاموش ہوگیا۔

''خس کم جہاں پاک'' انوار نے کہا۔

ابھی درخت سے اُترنا خطرے سے خالی نہیں تھا لہٰذا پو پھٹنے تک ہم دونوں درخت ہی پر بیٹھے رہے۔ مرغانِ سحر کی چہچہاہٹ کے ساتھ ہی ہم لوگ درخت سے اُترے اور چند ڈھیلے اُٹھا کر درندے پر پھینکے اور جب اُس کی موت کا یقین ہوگیا تو ہم اُس کی لاش کے قریب پہنچے۔ انوار خاں کی پہلی گولی درندے کی آنکھوں کے عین بیچ میں پیشانی پر اور دوسری بائیں کولہے میں لگی تھی۔ شیر کی لمبائی کم وبیش نو فٹ تھی۔ ابھی ہم درندے اور ریچھ کی لاشوں کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ بہت سے لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ رات کو ہونے والی فائرنگ کی آوازیں شاید دیہاتیوں نے بھی سن لی تھی اور اب وہ ہماری تلاش میں آرہے تھے۔ تھوڑی دیر میں دس بارہ دیہاتی بھاگتے ہوئے ہمارے پاس پہنچے۔ انہوں نے شیر کی لاش کو دیکھا اور مجھے اور انوار خاں کو اُٹھا کر ناچنے لگے۔

دن چڑھتے چڑھتے آدم خور کی ہلاکت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح آس پاس کے دیہاتوں میں پھیل گئی اور لوگ جوق درجوق سونی مندر کی اُس بلا کو دیکھنے آنے لگے جس نے گاؤں کے گاؤں ویران کردیئے تھے۔ یہ لمحہ بلاشبہ مسرت انگیز تھا لیکن میرے دل میں ایک کسک رہ گئی تھی کہ آدم خور کو میں نے نہیں انوار خاں نے ہلاک کیا تھا۔ سونی مندر کے مکھیا ہر چند اس نے خود ہمیں ہار پہنائے اور شام کو ہماری دعوت کا ایک شاندار پروگرام بنایا گیا۔

شام ہوتے ہی سونی مندر کی گڑھی میں ایک جشن منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی میں اور انوار خاں تھے۔ مکھیا نے قریب کے دیہات سے رقص کے لیے دو ''پترلوں'' کو بھی بلالیا تھا۔ دیسی شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ ناچ ورنگ کی یہ محفل شباب پر تھی کہ ایک بڑھیا چیختی چلاتی چوپال میں داخل ہوئی۔ اُس نے بین کرتے ہوئے مکھیا کو بتایا کہ آنگن میں کھانا کھاتے ہوئے اُس کے بیٹے کو شیر اٹھا کر لے گیا۔ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا اور سب کی نگاہیں ہمیں گھورنے لگیں گویا سوال کر رہی ہوں ''تم لوگوں نے کس آدم خور کو مارا تھا؟''

اب میری سمجھ میں آیا کہ آدم خور کے دھوکے میں کوئی دوسرا شیر مارا گیا۔ آدم خور ابھی زندہ تھا۔ میں نے بڑھیا کو تسلی دینی چاہی، لیکن اس کا غم کچھ وہی سمجھ سکتی تھی۔ فرطِ غم سے تھوڑی دیر بعد وہ بے ہوش ہوگئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ رات کے وقت آدم خور کا تعاقب کس طرح کیا جائے۔ رات کے وقت ایسے درندے کا تعاقب جس کے قبضے میں شکار ہو اپنی

موت کو جان بوجھ کر دعوت دینا تھا۔لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح ہوتے دونوں درندے کی تلاش میں نکلیں گے۔ میں نے اور انوار خاں نے ساری رات چائے اور سگریٹ پی پی کر گزاری۔

صبح ہوتے ہی بڑھیا کے کچے مکان کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے خون کے دھبوں کے سہارے ہم آدم خور کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔تھوڑی دُور جا کر ایک جگہ بہت سا خون اور بدنصیب نوجوان کے پیٹ کی آلائش پڑی ہوئی ملی۔ یہاں بیٹھ کر درندے نے اپنا دوزخ بھرا تھا۔

''لیکن لاش کہاں گئی؟'' میں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''قریب ہی کہیں ہوگی'' انوار نے کہا اور لاش گھسیٹے جانے کی لکیروں کے تعاقب میں جنوب کی طرف چل پڑے،تقریباً سو قدم آگے جا کر ہم نے ایک جھاڑی کی شاخ میں پھٹا ہوا خون آلود کپڑا الجھا ہوا دیکھا ۔ جھاڑی کے اوپر بڑی بڑی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے انوار خاں کا شانہ دبایا اور رائفلوں پر ہماری گرفت سخت ہوگئی۔ میں نے چند ڈھیلے اٹھا کر جھاڑی میں پھینکے ۔لیکن کوئی ردعمل نہ ہوا۔ اپنے پورے حواس جمع کرکے میں اور انوار خاں جھاڑی کی طرف اس طرح بڑھے کہ میرا منہ جھاڑی کی طرف اور انوار خاں کا مخالف سمت میں تھا۔ ہماری پشتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ نوجوان کی نصف سے زیادہ کھائی ہوئی لاش جھاڑی کے اندر پڑی تھی۔ درندے نے اسے خشک پتوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آدم خور لاش پر پھر آئے گا۔ میں نے گردونواح کا جائزہ لیا بدقسمتی سے قریب نہ تو کوئی درخت تھا جس پر مچان باندھا جاسکے اور نہ چھپ کر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ......۔

''کیا خیال ہے انوار خاں؟''

''بھائی غفور...... کھلے میدان میں شیر اور وہ بھی آدم خور شیر کا مقابلہ...... میں تو مشورہ نہ دوں گا''۔

''لیکن اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ہم درندے کی گرد بھی نہ پاسکیں گے''۔

''پھر کیا کیا جائے؟''انوار خاں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھیے......!'' میں نے سامنے کی عمودی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا جو جھاڑی سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایستادہ تھی۔ پہاڑی کے دامن میں ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ چوٹی سے کوئی بیس گز نیچے ایک قدرتی طاق نما غار تھا......''کیوں نہ اُس غار میں بیٹھا جائے''۔

''لیکن...... اس میں تو ایک آدمی بھی مشکل سے بیٹھ سکے گا''۔

''آیئے! گاؤں میں چلیں اس کا بھی کوئی انتظام ہو جائے گا''۔میں نے کہا اور ہم دونوں تیزی سے گاؤں کی طرف پلٹے۔

سونی مندر آکر ہم نے چند بانس ، کدالیں، پھاوڑے اور دو دیہاتیوں کو ساتھ لیا اور پھر نالے کی طرف روانہ ہوگئے۔ سہ پہر ہونے تک مخدوش جھاڑی سے دس گز دور میں نے ایک قد آدم گڑھا کھدوالیا۔ انوار خاں کو غار کی طرف بھیج دیا اور میں خود اللہ کا نام لے کر گڑھے میں اُتر گیا۔ دیہاتیوں نے گڑھے کے منہ پر بانس رکھ کر اوپر سے جھاڑیاں کاٹ کر ڈال دیں اور پھر وہ ہمیں جنگل کے حوالے کرکے سونی مندر واپس چلے گئے۔

سورج چھپا جنگل انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے

لگا۔ نالے میں بہتے ہوئے پانی کی کل کل سنائی دے رہی تھی۔ مجھے گڑھے میں بیٹھے نصف گھنٹہ ہو چکا تھا۔ آدم خور کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن اپنے تجسس کو تسلی دینے کے لیے میں نے رائفل کی بیرل سے گڑھے کے منہ پر پڑی ہوئی بریدہ جھاڑیوں کو ہٹا کر پہاڑی کی طرف دیکھا۔ انوارخاں غار میں چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ یکا یک شیر کی دھاڑ سنائی دی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ شیر کہیں دُور پہاڑی کے پیچھے دھاڑا تھا۔ انوارخاں نے بھی پہلو بدلا۔ خاصی دیر ہوگئی لیکن پھر کوئی آواز سنائی نہ دی لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ درندہ ہمارے آس پاس ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے اور ہماری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ میں کبھی نوجوان کی لاش کی طرف دیکھتا اور کبھی انوارخاں کی طرف......

اچانک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا محسوس ہوا۔ پہاڑی کی چوٹی پر عین طاق نما غار کے اوپر درندہ اپنے دونوں اگلے پیروں کو نیچے کی طرف پھیلا کر انوارخاں کے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پہاڑی کے سیدھا ہونے کی وجہ سے اُسے دقت پیش آرہی تھی۔ درندہ شاید کہیں چھپ کر ہم لوگوں کی نقل وحرکت دیکھ رہا تھا اور خاموشی سے انوارخاں کے سر پر جا پہنچا تھا۔

''انوارخاں...... ہوشیار...... اوپر شیر ہے'' میں پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے چیخا گھبراہٹ میں انوارخاں کے ہاتھ سے رائفل چھوٹی اور پتھروں سے ٹکراتی ہوئی بہتے ہوئے نالے میں جا پڑی۔ صورت حال بڑی نازک ہوگئی تھی۔ ایک بار تو درندہ اپنا جسم پھیلا کر گڑھے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

''فائر کرو غفور......!'' انوارخاں کی گھگھیائی آواز بلند ہوئی۔ میں گڑھے کے اوپر پڑی ہوئی جھاڑیوں کو ہٹا کر تیزی سے باہر آگیا۔ اللہ کا نام لے کر نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ جنگل ایک ہولناک دھاڑ سے گونج اٹھا۔ آدم خور پکے آم کی طرح پہاڑی کی چوٹی سے لڑھکتا ہوا نالے میں انوار خاں کی رائفل کے قریب آپڑا اور اُس کے سر سے اُبلتے ہوئے خون نے نالے کا پانی رنگین کر دیا۔

انوارخاں کو میں نے فوری طور پر اُترنے سے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس نازک صورت حال نے اُن کے حواس کو ضرور متاثر کیا ہوگا ممکن ہے کہ اُترنے میں بدحواس ہو کر کہیں گر نہ پڑیں تھوڑی دیر بعد انوارخاں بھی نیچے اُتر آئے۔ اُن کا جسم پسینے سے شرابور اور چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نے مل کر درندے کی لاش پانی سے باہر نکال کر ڈال دی۔

درندے کی آدم خوری کا سبب بعد میں معلوم ہوا۔ مُردہ درندے کا دایاں پنجہ پھول کر کپا ہوگیا تھا اور پنجے کی گدی نما ہتھیلی میں سیہہ کا کانٹا ٹوٹا ہوا چمک رہا تھا۔ کسی وجہ سے درندے نے سیہہ پر حملہ کر دیا تھا اور اس حملے کے بدلے اُسے سیہہ کا زہریلا اور کبھی نہ سڑنے والا کانٹا انعام کے طور پر ملا تھا۔ ایک پیر بیکار ہونے کی وجہ سے وہ ہرن اور دوسرے جانوروں کا نہ تو تعاقب کر سکتا تھا اور نہ شکار۔ لہٰذا پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اس نے انسان جیسے کمزور اور آسان شکار پر اکتفا کر لیا تھا۔

بہرحال ہم لوگ اب سونی مندر کے باشندوں کے سامنے سرخرو تھے۔ ہماری کئی روز کی تگ و دو ثمر آور ثابت ہوئی اور اس طرح میرے دوست کے قاتل اور سونی مندر کی آدم خور بلا کا قصہ تمام ہوا۔

نایافت

نسیم سحر

ایک شخص کا فسانہ جس کی بیوی روز اُٹھتے ہی اسے لازوال مسکراہٹ کیساتھ دیکھتی تھی

ڈاک خانے کی بڑی عمارت میں قسم قسم کے لوگ آتے ہیں اوراس طرح وہاں ایک مخصوص ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاک خانے کی عمارت جس قدر بوسیدہ ویران اور خاموش لگتی ہے وہاں جمع ہونے والے لوگوں کی افتادِ طبع اتنی ہی مختلف ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے خطوط، منی آرڈر یا پنشن وغیرہ وصول کرنے کے لیے وہاں پہنچتے ہیں اور انتظار کے طویل لمحات عجیب سی بیزاری، بے صبری اور بے چینی کے عالم میں گزارتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ روزانہ اُن خطوط یا منی آرڈروں کے حصول کے لیے وہاں صبح سے شام کر دیتے

ہیں جو کبھی آنہیں چکتے۔

جس روز میں وہاں گیا اُس روز ایک شخص کا اضطراب قابل دید تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چند لمحات میں کوئی پانچ مرتبہ کھڑکی کی طرف بڑھا اور کلرک سے کوئی جواب سن کر مایوسی کے عالم میں پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کی عمر چالیس سال کے قریب ہوگی لیکن تفکرات نے اُس کے چہرے پر بے شمار جھریاں ڈال دی تھیں۔ اُس کی آنکھوں نے میں ایک وحشیانہ چمک تھی اور کسی گہری سوچ میں غرق نظر آتا تھا۔

اس طرح کے عجیب وغریب شخص کو نیم پاگل کہہ کر اُس پر ہنسنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور اگر کوئی آدمی اپنی اس خواہش پر قابو پانے کی کوشش کرے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ خود بھی نیم پاگل ہو جائے گا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے ہنسی روکنی چاہی تو مجھ پر بھی وحشت چھا گئی اور میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے خوانخواہ کہا ”اُف یہاں تو انتظار کرنا بھی عذاب بن جاتا ہے“۔

میرا خیال تھا کہ وہ میری جانب سے گفتگو کی اس کوشش پر اس طرح اچھل پڑے گا جیسے کسی نے اُس پر بم پھینک دیا ہو۔ اس قسم کے لوگ عموماً یہی رویہ اختیار کرتے ہیں لیکن نہیں حیرت انگیز طور پر اُس کی وحشت میں کمی آگئی اور وہ پرسکون سا نظر آنے لگا۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ”جی ہاں پھر بھی یہاں کا ماحول زیادہ تکلیف دہ تو نہیں ہے“۔

”ہاں۔ لیکن انتظار......!“

”کیا آپ کو کسی خط کا انتظار ہے؟“۔ ”جی ہاں“۔

”تو وہ ضرور آپ کی بیوی کی طرف سے آنے والا ہوگا۔ اسی قسم کے خطوں کا بے تابی سے انتظار کیا جاتا ہے“۔

”جی؟ جی نہیں“ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

وہ حیران رہ گیا ”کیا آپ کی بیوی کا خط نہیں ہے جس کا آپ اتنی شدت سے انتظار کررہے ہیں؟“

”جی نہیں......وہ تو......“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن آپ شادی شدہ تو ضرور ہوں گے؟“

”جی نہیں......ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے“۔

اُس نے غور سے میرا جائزہ لیا ”ہوں شادی بڑی اچھی چیز ہے ہر انسان کو یہ تجربہ ضرور کرنا چاہیے“۔

میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس شخص پر اس وقت شادی کا موضوع سوار ہے ضروری سمجھا کہ اُس سے وہ سوال کروں جس کی اُسے مجھ سے توقع ہوگی ”آپ نے تو یہ تجربہ ضرور کیا ہوگا جناب؟ آپ شادی شدہ ہیں نا؟“

”جی؟ جی ہاں، میرا مطلب ہے کہ مجھے شادی شدہ بھی کہا جاسکتا ہے لیکن......“ وہ پریشان کن انداز میں مناسب الفاظ تلاش کررہا تھا۔ اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے ہم دونوں بڑے پرانے دوست ہوں اور بے تکلفی سے اپنے ذاتی موضوعات کھنگال رہے ہوں۔ ”دراصل میں نے شادی تو ضرور کی تھی لیکن اب ہم دونوں علیحدہ علیحدہ زندگی بسر کررہے ہیں۔ وہ روآن میں ہے اور میں پیرس میں کھڑا ہوں۔ ویسے بھی میں زیادہ تر دورے پر رہتا ہوں لیکن ہم دونوں محض فاصلے کے سبب جدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہم نے باہمی سمجھوتے سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ گئی ہے کیونکہ میں اُس کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن نہیں سمجھتا تھا۔ میرا مطلب ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی اس لیے میں اُس سے الگ ہوگیا۔ بیوی تو وہ ہوتی ہے جس کا دل مرد کی محبت کی آماجگاہ ہو۔ میں اُس کے دل میں نہیں تھا۔ اُس نے مجھے دھوکا دیا تھا لیکن ہوسکتا ہے نہ بھی دیا ہو اور یہ محض میرا خیال ہو۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئی“۔

وہ شخص اب میرے وجود سے بے خبر اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا تھا اس لیے میں نے دخل دینے کے بجائے خاموش رہ کر وہ سب کچھ سننا پسند کیا جو اُس

کے ذہن اور لبوں پر مچل رہا تھا۔
"ہاں تو میں آپ کو یہ بتادوں کہ ہم آپس میں شیر وشکر تھے ۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ہمارا اپنا ایک چھوٹا سا خوبصورت فلیٹ تھا اور میری بیوی بڑی نفاست سے اُسے صاف ستھرا رکھتی تھی۔ کام سے واپس گھر پہنچنا میرے لیے ایک کشش کا باعث ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ہم اپنے دوستوں سے ملنے یا فلم دیکھنے گھر سے باہر بھی چلے جاتے تھے۔ پھر بھی ہمارا گھر ہی ہم دونوں کی مختصر سی جنت تھا۔ لیکن میرا کاروبار ایسا تھا کہ مجھے اکثر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ مہینے کے بیشتر دن باہر بسر ہوتے تھے اسی لیے میں بیوی کی قربت میں صرف چند دن گزار سکتا تھا۔
"میں اپنے فلیٹ کے ایک ایک گوشے سے واقف تھا۔ ہر کونے اور ہر اینٹ سے واقف لیکن سب سے زیادہ قربت مجھے خواب گاہ سے تھی۔ ہم دونوں نے اپنی خواب گاہ کی آرائش خصوصی طور پر کی تھی۔ دیواروں پر گلابی اور بھورے رنگ کا کاغذ لگایا گیا تھا اور ایک بہت خوبصورت ڈیزائن کا آئینہ آویزاں تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ پردے تھے۔ ایک کھڑکی کے قریب ہی بستر تھا۔ ہمارا چوڑا بستر بڑا آرام دہ اور گدے دار تھا۔ آپ سوچیں تو سہی کہ بستر آپ کی زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے؟ یہ ازدواجی زندگی کا رازداں ہوتا ہے۔ محبت اور جذبات کی دھڑکنیں سنتا ہے میں تو کہتا ہوں کہ بستر کی سفید چادر سینما کے پردے کی طرح ہوتی ہے۔ جس پر ایک رنگا رنگ رومانی فلم چلتی رہتی ہے۔ ہم دونوں باقی دنیا کے تفکرات سے دُور اور بے خبر اپنی ہی چھوٹی سی دنیا میں مست رہتے تھے۔ ہماری باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں اور ہمیں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔
"اور اب میں آپ کو اُس مسکراہٹ کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ ویسے تو ہر حسین عورت کی مسکراہٹ غضب کی ہوتی ہے۔ میری بیوی جب مسکراتی تھی تو بہار آجاتی تھی لیکن خصوصاً اُس کی صبح کی پہلی مسکراہٹ کوئی اور ہی شئے تھی۔ ذرا آپ اُس وقت کا تصور کیجئے کہ رات ختم ہونے پر ہم دونوں اپنے بستر میں پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے ہیں۔ روزانہ پہلے میری آنکھ کھلتی تھی۔ میری بیوی ہمیشہ گہری نیند سوتی تھیں۔ میں آنکھیں کھولتے ہی اُس کے خوبصورت چہرے پر گہری نظر ڈالتا تھا کتنا معصوم چہرہ تھا۔ وہ نیند میں کتنی حسین اور دلکش نظر آتی تھی۔ پھر میں ہلکی سی حرکت کرتا اور اُس کے جاگنے کا عمل شروع ہو جاتا۔ وہ ہمیشہ چت سویا کرتی تھی اس لیے جب اُس کے حسین پپوٹے جُدا ہوتے تو سب سے پہلے اُس کی گہری گہری آنکھیں چھت پر نگاہ ڈالتی تھیں۔ ایک ثانیے کے لیے اُس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک پیدا ہوتی جیسے وہ یہ سوچ رہی ہو کہ میں کس مقام پر سوئی ہوئی ہوں اور یہ کون سے مکان کی چھت ہے؟ پھر اسی کیفیت میں جیسے اُسے یہ بھی احساس ہو جاتا کہ وہ بستر میں اکیلی نہیں ہے بلکہ کوئی اور بھی اُس کے پہلو میں ہے۔ وہ آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری موجودگی کا احساس یقین میں بدلتی۔ اس کے بعد بڑی آہستگی اور نرمی سے اُس کی آنکھیں میری طرف مائل ہوتیں لیکن اُس ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں اُس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر ہوتا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر کرب و اندوہ کی کیفیت ہوتی تھی۔ وہ ایک ایسا چہرہ ہوتا تھا جو یہ سوچتا تھا۔ آہ۔ یہ میں نے کیا کردیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کہاں؟ میں نے یہ ایک مذموم کام کیا ہے۔ اب بہر حال اُس کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ چہرہ کسی ایسے گناہگار کا چہرہ ہوتا تھا جسے اپنے گناہ کا علم ہو جیسے میں اُس کا شوہر نہیں ہوں بلکہ...... بلکہ کوئی اور شخص ہوں جس کے پہلو میں لیٹ کر اُسے اب گناہ کا احساس ہو رہا ہے۔ ایک ایسا چہرہ جس نے ہوس میں آکر کوئی گناہ تو کرلیا ہو مگر اب اُس پر پچھتا رہا ہو۔
"میرے دوست! یہ احساس ایک مختصر سے لمحے

کے لیے اُس کے چہرے پر طاری ہوتا تھا۔ پھر وہ پوری طرح مجھے دیکھ لیتی تھی۔ وہ مجھے اپنے شوہر کو اپنے پہلو میں لیٹا دیکھ کر جیسے اچانک کسی خوفناک خواب کے طلسم سے نکل آئی ہو۔ اُس کی تمام پشیمانی ختم ہو جاتی اور احساس گناہ حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا اور اُس کے چہرے پر وہ لازوال مسکراہٹ آ جاتی جس میں طمانیت کا احساس موجود ہوتا۔ جس میں میرے لیے محبت کا سمندر موج زن ہوتا اور وہ مسکراتی ہوئی مجھ سے لپٹ جاتی۔

میں خاموشی سے سب باتیں سنتا جا رہا تھا شاید وہ شخص غضب کا مردم شناس تھا۔ میرے چہرے پر وہ سوالات شاید خود بخود نمودار ہوگئے تھے جن کا جواب دینے کے لیے وہ بے چین تھا۔ مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر وہ بولا ”ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ آخر وہ کس قسم کی عورت تھی جو اپنے شوہر کے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی خود کو کسی اجنبی کے پہلو میں سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ میری صاف گوئی کے لیے معاف کیجیے گا اصل میں شادی سے قبل جب میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ ایک کلب میں رقاصہ تھی۔ ظاہر ہے کہ فیاض گاہکوں کے لیے اُس کی قربت حاصل کرنا کوئی مشکل امر نہ ہوگا۔ مگر جب مجھ سے اُس کے تعلقات بڑھے تو میرے لیے اُس کی زندگی کے اس تاریک پہلو میں کوئی قابل نفرت بات نہیں رہی۔ ہم میں سے اکثر لوگ بستر کے معاملات میں کتنے ہی پاکیزہ خیالات کے مالک کیوں نہ ہوں دوسرے تمام اخلاقی معاملات میں خاصے پست ہوتے ہیں، ہم میں حاسد، لالچی، شرابی اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جب ہم ان سب کو برداشت کر لیتے ہیں تو ایک ایسی عورت سے شادی کرنے میں مجھے کیا جھجک محسوس ہوتی جو بدن فروشی تو کرتی تھی لیکن اُس کی روح پاکیزہ تھی اور اُس کے خیالات ارفع و اعلا تھے۔ میں نے اُس سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لوگ تو معشوق کے تل پر سمرقند و بخارا نثار کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اُس کی صبح کی مسکراہٹ پا کر محسوس کیا کہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے اور اس کے بدلے کوئی بھی قیمت ادا کی جاسکتی ہے۔ ہاں وہ مسکراہٹ میرے لیے بیش بہا سرمایہ تھی۔

”لیکن میرے دوست! چند دنوں تک روزانہ اس مسکراہٹ سے لطف اندوز ہونے کے بعد میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب خیال آیا۔ میں نے وہ مسکراہٹ اس قدر قریب سے دیکھی تھی کہ اب مجھ پر اس کا ایک بالکل متضاد رُخ دیکھنے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ میرا جی چاہنے لگا کہ اُس خوبصورت چہرے پر وہ لازوال مسکراہٹ نہ کھیلے جو مونا لیزا کی یاد دلاتی تھی بلکہ میں اس چہرے پر خوف اور رنج کے تاثرات بھی دیکھ سکوں۔

اور میں نے یہ منظر دیکھنے کے لیے ایک انوکھا منصوبہ بنایا۔ میرا ایک دوست ہیٹ فروخت کیا کرتا تھا اُس کے پاس لکڑی کے مصنوعی چہرے اور سر بھی تھے جن پر وہ اپنے ہیٹ بطور آرائش پہنا کر گاہکوں کو دکھایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اُس سے لکڑی کا وہ چہرہ حاصل کیا جو دور سے دیکھنے میں بالکل اصل نظر آتا تھا۔ اس میں اصلیت کا رنگ بھرنے کے لیے باقاعدہ بڑی بڑی مونچھیں بھی بنائی گئی تھیں۔ میں نے مصنوعی بالوں کے ذریعے وہ مونچھیں اور بھی لمبی کر دیں اور داڑھی بھی بنا دی۔ اس طرح وہ چہرہ بالکل کسی ملاح کے چہرے کی طرح خوفناک نظر آنے لگا اور میں نے اُسے دیکھا تو مجھے بھی خاصا خوف محسوس ہوا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ چہرہ میرے چہرے کے نقوش سے یکسر مختلف ہوتا کہ میری بیوی صبح کے وقت اپنی نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھ کر ہی خوف میں مبتلا ہو جائے اور میں یہ دیکھ سکوں کہ کیا ایک انتہائی حسین چہرہ خوف کے عالم میں بھی اتنا ہی حسین نظر آتا ہے جتنا مسکراتے ہوئے نظر آتا ہے؟ یا اُس سے مختلف ہوتا ہے۔

شاید آپ مجھے خبطی سمجھ رہے ہوں گے میں نے

محض ایک خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس قدر تردد سے کام لیا لیکن حسن پرست لوگ حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایسی عجیب باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ دوسرے روز صبح بیدار ہو کر میں نے اپنی بیوی کے خوابیدہ چہرے پر گہری نظر ڈالی اور سوچا کہ آج میں اس چہرے، پر وہ لازوال مسکراہٹ نہیں بلکہ خوف و دہشت کے تاثرات دیکھوں گا میں بڑی آہستگی کے ساتھ بستر سے نکل گیا۔ پھر میں نے تکیے پر وہ مصنوعی چہرہ اُس طریقے سے لٹا دیا جیسے میری بیوی سچ مچ کسی اجنبی ملاح کے پہلو میں سو رہی تھی۔

میں بے تابی سے اُس وقت کا انتظار کرنے لگا جب وہ حسب معمول بیدار ہو گی اور چھت پر نظر ڈالے گی اور اُسے اپنے پہلو میں کسی کی موجودگی کا احساس ہو گا۔ پھر روز کی طرح وہ ہلکی سی تشویش کے ساتھ چہرہ گھما کر پہلو میں لیٹے ہوئے شخص کی طرف دیکھے گی۔ پھر وہ مسکرا نہیں سکے گی بلکہ خوف کے عالم میں چیخ پڑے گی۔ ملاح کا وہ خوف ناک چہرہ اُسے یقیناً خوف زدہ کر دے گا۔ پھر میں اُسے بتاؤں گا کہ یہ محض ایک مذاق تھا۔ یقیناً وہ بھی میرے اس دلچسپ مذاق سے لطف اندوز ہو گی۔

میں نے سوچا کہ نہ جانے کتنی دیر تک سوتی رہے اس لیے اسے کسی طریقے سے بیدار کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے آہستہ سے زمین پر پاؤں مارا۔ دھپ کی آواز پیدا ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کسی چابی والی گڑیا کی طرح متحرک ہو گئی۔ روز کی طرح اُس کی نیم وا آنکھیں چھت کی طرف کھلیں۔ پھر اُس کی آنکھوں میں وہی سوچ پیدا ہو گئی کہ وہ کہاں ہے؟ پھر آہستہ آہستہ اُسے اپنے پہلو میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اُس نے اپنا چہرہ اُس شخص کی طرف کر لیا جو اُس کے پہلو میں لیٹا تھا......"

وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت کی پرچھائیاں واضح دکھائی دینے لگیں۔ وہ شاید کسی اندرونی طوفان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوالیہ انداز میں لگاتار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ وہ بولتا کیوں نہیں؟ کیا وہ اس مذاق پر ناراض ہو گئی تھی؟

"مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس مذاق کا کیا نتیجہ برآمد ہو گا؟ لیکن اس کا جو انجام ہوا کم از کم میں خود کو اُس کا سزاوار ہرگز نہیں سمجھتا تھا...... ہرگز نہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن یہ ہو چکا ہے۔ آہ! اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اپنی اس خواہش پر ابتدا ہی سے قابو پا لیتا لیکن افسوس کہ ایک زندگی تباہ ہو گئی۔ ایک لمحے کی تفریح پر ایک پوری زندگی بھینٹ چڑھ گئی"۔

اُس کا گلا رُندھ گیا۔ اب بھی ڈاک خانے میں خاصا رش تھا اور لوگ اپنے خطوں اور منی آرڈروں کے لیے اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ میں اُس شخص سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کیا وہ عورت اُس کے مذاق پر ناراض ہو کر چلی گئی تھی؟ کیا وہ اب زندہ نہیں ہے؟ آخر کس کی زندگی برباد ہو گئی؟ چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا مگر اب وہ بولنے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا آخر بے تاب ہو کر میں نے پوچھا" لیکن ہوا کیا جناب؟ کیا وہ بہت زیادہ ڈر گئی تھی؟ کیا وہ آپ سے ناراض ہو گئی تھی؟"

"نہیں"۔

"تو پھر اور کیا ہوا؟ معاف کیجیے گا میں سمجھ نہیں سکا"۔

"کمال ہے یہ بات تو آپ کو اب تک سمجھ لینی چاہیے تھی۔ پہلے میں ہمیشہ ہی سمجھتا رہا کہ میری بیوی روز صبح جب مجھے اپنے پہلو میں دیکھتی ہے تو اُس کے چہرے پر ایک لازوال مسکراہٹ بکھر جاتی ہے لیکن اُس روز۔ ہاں اُس روز جب وہ اُس چہرے پر نظر ڈال کر مسکرائی تو میں نے اندازہ لگایا کہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک لازوال مسکراہٹ کی جھلک دیکھ رہا ہوں اور وہی آخری نظارہ تھا۔ میں نے اُسی لمحے اُس سے جدائی کا فیصلہ کر لیا۔

اِک عہدِ وفا

نوشابہ اختر

ایک کشمیری دوشیزہ کی داستان، وہ شجاعت و بہادری کا پیکر تھی

عورت کی محبت میں بہت دم ہے یہ زندگی دے نہ دے زندگی لینے کی اہلیت ضرور رکھتی ہے کیونکہ اس کی محبت سے زندگی کسی نصیب والے ہی کو مل سکتی ہے۔ یہ ایک جھلک کے لیے پورے لشکر ذبح کرواسکتی ہے۔

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک کا ''کیسے ممکن'' ہے پڑھتے ہوئے ذہن ایک دم سے کئی سال پیچھے چلا گیا اور میں جو رمضان کی مصروفیات میں صرف سوچ رہی تھی کہ کیا لکھوں، ماضی کے اُس دالان میں جا اُتری۔

جہاں دادی ماں بیٹھی تھیں اور سوچوں میں گم تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ حسب معمول میں نے سوال کردیا۔

''سوچتی کچھ اور ہیں اور تسبیح کے دانے گھمائے جارہی ہیں''۔

انہوں نے مسکرا دیکھا اور بولیں'' تم باز نہیں آئیں، میں سوچ تو ضرور رہی ہوں لیکن دھیان اللہ کی طرف ہی ہے''۔

''واہ جی واہ'' ایک وقت میں دوکام، ایک تیر سے دو شکار'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو انہوں نے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگالیا۔

یہ تھیں میری ننھی منی سے دادی ماں۔ ننھی منی اس لیے کہ وہ دُبلی پتلی بے حد سمارٹ دُودھ اور معدے سے گندھی ہوئی خوبصورت نین نقش والی ایک کشمیرنی تھیں کہ گویا کشمیر کا ڈھیروں حُسن اُن کے اندر سمو دیا گیا تھا۔ اندھیرے میں اُن کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اور شاید اُن کی روحانیت بھی اس حُسن کو چار چاند لگا رہی ہوتی تھی۔

جب پاکستان بنا تو ہم تو یہیں تھے کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد بہت پہلے کشمیر سے ادھر آگئے تھے اور اس آنے میں کئی کہانیاں تھیں، جو کچھ ہمیں ملیں اور کچھ وقت کی گردش میں گم ہوگئیں۔

ایک محفل میں دو خواتین مجھے گھورے جارہی تھیں اور میں خوامخواہ نظریں چُرا رہی تھی جیسے ان کی کوئی چیز چوری کرلی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اُن میں سے ایک خاتون مجھ سے مخاطب تھیں'' آپ کون ہیں اور کہاں سے ہیں؟''

میں چونک اُٹھی، اتنی تفتیش [illegible] واقعی کوئی جرم [illegible] بیٹھی ہوں [illegible] انہوں نے پھر یہ سوال [illegible] آپ [illegible] سے ہیں'' [illegible] جی میں لاہور سے ہی ہوں۔ میں نے مودبانہ عرض کیا تو

وہ بولیں ''نہیں آپ کی اصل کیا ہے۔'' ''بی بی میں ایک مسلمان عورت ہوں اور اپنے والدین کی جائز اولاد ہوں۔'' میں نے انہیں جواب دیا تو وہ بولیں'' نہیں یہ سب ٹھیک ہے مگر آپ کچھ اور ہیں یعنی آپ کی اصل کچھ اور ہے'' میں حیران کہ ان کی بات کا کیا جواب دوں کہ دادی اماں درمیان میں آئیں۔ وہ کہیں دور بیٹھی مسکرا رہی تھیں اور میں نے اپنی جان چھڑانے کو یوں ہی کہہ دیا'' شاید میں کشمیری ہوں اس سے آپ کو کچھ فرق لگ رہا ہے''

'' یہ ہوئی نا بات'' وہ دوسری خاتون سے بولیں، ''دیکھا، میں نہ کہتی تھی، یہ یہاں سے نہیں ہیں۔ میرے موبائل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور میں ہال سے باہر نکل آئی اور صرف ہال سے نہیں نکلی [illegible] سے بھی نکل آئی کہ مجھے اپنی دادی ماں سے [illegible] پھر ملاقات کرنی تھی۔

ہاں تو میں دادی ماں کے حُسن کی بات کررہی تھی۔ وہ واقعی بے حد حسین تھیں لیکن اُن کی باتیں اس سے بڑھ کر حسین ہوتی تھیں وہ ہر وقت گنگناتی رہتی تھیں۔

''میرے وطن! میرے وطن
تیری جنت میں آئیں گے اک دن''

ایک روز یوں ہی میں نے سوال داغ دیا۔

''جب وطن سے اتنی محبت تھی تو وہاں سے چلے کیوں آئے؟ رہتے نا وہیں۔'' وہ اپنی پیاری سی مسکراہٹ کی چاندنی چاروں طرف بکھیرتے ہوئے بولیں۔

''پھر آج میں تجھے بتا ہی دوں کہ میرے باپ دادا نے وہ جگہ کیوں چھوڑی۔ میری پیاری بیٹی! جہاں عزتیں محفوظ نہ رہیں وہاں سے ہجرت کرنا ہی پڑتی ہے اور ہمیں بھی اُس ڈوگرراج میں اپنے کھیت اپنے

باغ اور اپنی جنت، سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ آجا آج میں تجھے ایک کہانی سناتی ہوں۔ ایسی کہانی جس میں ہر بیروان زہر کی پڑیا پلو میں باندھے پھرتی ہے۔

''وہ بھی ایک بادلوں بھرادن تھا۔'' دادی ماں دُور فضاؤں میں کھوگئی تھیں۔ ''ہم دونوں...... میں اور صفورا روز کی طرح بکریاں چرانے پہاڑوں پر نکل گئیں۔ بکریں چرانا تو ایک بہانہ تھا ہم دونوں بچپن کی سہیلیاں پل بھر کے لیے جدا نہیں رہتی تھیں۔ صفورا کی اماں یعنی میری تائی ماں بہت پہلے فوت ہوگئی تھیں۔ اب تایا ابا جنہیں ہم سب بابا کہتے تھے اور صفورا ہی اپنے گھر میں رہتے تھے۔ ادھر میں تھی ایک شہید کی بیٹی اور میری ماں جو شہید کی بیوہ تھیں ہم ایک گھر میں تھے۔ زروان میرا بھائی اور صفورا کا منگیتر ڈوگرہ فوجیوں سے جنگ کرنے کے لیے نہ جانے کہاں کہاں پھرتا تھا پھر جب وہ چند گھڑیوں کے لیے گھر آتا۔ تو جیسے ہر سو بہار آجاتی۔ صفورا کی آنکھیں ہیروں کی طرح جگمگانے لگتیں۔ اُس کی ہنسی بہتے جھرنوں کا روپ دھار لیتی وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ اور آنے والی بہار میں ہم اُن دونوں کی شادی کرنے والے تھے۔

تو بنو! اس روز بھی ہم دونوں بکریوں کا ریوڑ لے کر وادیوں میں آزاد تتلیوں کی طرح پرواز کررہی تھیں کہ مجھے لگا صفی میرے سے کہیں دُور چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے زور زور سے آوازیں دیں۔ اوپر سے بارش بالکل پڑنے والی تھی۔ میں بکریاں سمیٹ رہی تھی اور صفورا کو بلا بھی رہی تھی کہ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور دھڑام سے زمین پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا صفی! تجھے اتنی بار کہا ہے دُور نہ جایا کر۔ پر تُو میری بات سنتی ہی نہیں۔ اب دیکھ ہوا ہے، دیکھ بارش بھی برسنے والی ہے۔''

''کیا بارش برسے گی تو ہم گھل جائیں گے نمک کی طرح۔ ارے میری سکھی! ہم تو روئی کے گالوں کی طرح اور بھاری ہو جائیں گے۔ ہم کشمیر کے بچے گھلنے والے نہیں''۔

''واہ بھئی واہ! ایسی طوفانی باتیں تیرا زرواق سن لے نا تو بے ہوش ہو جائے گا'' میں نے اُسے چھیڑا تو وہ مسکرا دی ''ایرج! میری بہن! دیکھتے ہیں کون کس کے لیے بے ہوش ہوتا ہے''۔

جانے اس کی آواز میں کیا تھا کہ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا وہ تو جیسے بہت دُور کہیں کھو گئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی ''چلو گھر چلتے ہیں بابا اور چاچی پریشان ہورہے ہوں گے''۔ اُسے اُن دو بزرگوں کی ہر گھڑی فکر ہوتی تھی۔

جانے اُن چند گھڑی میں کیا ہوا تھا کہ صفی ایک دم سے بدل سی گئی تھی۔ تنگ آکر میں نے اُسے جھنجھوڑ دیا ''کیا ہوا ہے کچھ تو بتاؤ، کوئی خاص بات ہے جو تم مجھے بتا نہیں رہیں''۔

''بتادوں گی ذرا صبر سے کام لو اور کوئی پریشانی والی بات نہیں'' اُس نے مجھے تسلی دی اور میں بھی سنبھل گئی۔

ہم سب لڑکیاں پانچ پانچ جماعت ضرور پڑھی تھیں اور اس وقت کی پانچ جماعت پڑھی لڑکی بہت پڑھی لکھی سمجھی جاتی تھی اور صفورا تو اور بھی بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ قرآن پڑھتی تو ترجمہ ضرور پڑھتی اور پھر پہروں کسی ایک آیت کو لے کر سوچتی رہتی اور اُسے یقین تھا کہ رب دو جہاں کے حکم سے ہر کام ہوتا ہے اور رب جس سے چاہتا ہے کوئی بڑا کام لے لیتا ہے۔ وہ اپنی چھوٹی سی کاپی میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی اور مجھے جب موقع ملتا میں سے پڑھ لیتی [illegible]

درمیان خوب لڑائی ہوتی اور وہ مجھے چور تک کہہ دیتی۔ لیکن وہ صاف دل اور اتنی شفاف تھی کہ اس کی لڑائی کے جملے بھی محبت سے بھرپور ہوتے تھے اور اس روز جب میں اُس کے گھر گئی تو وہ کاپی لکھتی چھوڑ کر بابا کے ساتھ کہیں گئی تھی اور مجھے کاپی پڑھنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے لکھا تھا:

اُس روز اُس وادی میں کیا ہوا۔ وہ' وہ اونچا لمبا شیطان نما انسان کون تھا، اُس نے زور سے میرا بازو پکڑا اور بولا ''تو یہاں بکریاں چرانے کیوں آئی ہے تجھے پتہ نہیں یہاں آنا منع ہے۔'' میں ڈر گئی اور میں نے کہا'' نہیں مجھے معلوم نہیں تھا مجھے چھوڑ دو' آئندہ ادھر نہیں آؤں گی'' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا بڑی گندی طرح سے اور بولا'' کون سی بستی سے آئی ہو'' میں نے لرزتی ہوئی انگلی اپنی بستی کی طرف اُٹھا دی تو وہ پھر مسکرایا۔

''تم ڈر کیوں رہی ہو، کوئی بات نہیں تم یہاں بکریاں لے آیا کرو اور کسی وقت ایک ڈول دودھ میرے بنکر میں دے دیا کرو۔ وہ سامنے میرا بنکر ہے۔ تم بہت خوبصورت ہو'' مجھے بہت غصہ آیا''تم کون ہوتے ہو میری تعریف کرنے والے گندے غلیظ ڈوگرے۔'' وہ ہنس پڑا،''میں غلیظ ڈوگرہ نہیں ہوں۔ میں کرنل بلراج کنول ہوں سمجھیں۔ تم میرے جی کو بھاگئی ہو، آؤ میرے ساتھ باتیں کرو''۔ میں نے اُسے پلید انسان کہا تھا تو وہ ہنسنے لگا۔ وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں اپنا ہاتھ چھڑا رہی تھی میں نے چلانا چاہا تو اس نے میرا منہ بند کر دیا۔''چلاؤ نہیں وعدہ کرو کل آؤ گی تو ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔'' میں نے ڈر کے مارے اس سے وعدہ کر لیا۔ وہ ہنسا،''کشمیریوں والا وعدہ ہے یاد رکھنا، اگر نہ آئی تو ساری بستی اُڑا دوں گا'' اور میں بھاگتی ہوئی ایرج کے پاس آ گئی تھی۔ میں بہت ڈر گئی ہوں لیکن، پتہ نہیں میرے دل میں کیا ہے جو مجھے کہیں دور لے کر جارہا ہے۔ ایرج کو کچھ نہیں بتاؤں گی مگر مجھے کچھ کرنا ہے، شاید بہت کچھ''میں نے اس کی کاپی وہیں رکھی اور اپنے گھر آ گئی۔

بھلا یہ کیا کر سکتی ہے۔ نادان لڑکی چلی ہے ستاروں سے باتیں کرنے، مجھے اس کا خاص خیال رکھنا ہے میرے بھائی کی دُلہن ہے، میں سوچتی رہی مگر میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ وہ روز رات کو میرے پاس آجاتی تھی۔ دوسری رات وہ ذرا دیر سے میرے پاس پہنچی اور آتے ہی سو گئی اور تیسری رات بھی یہی ہوا۔ وہ آتے ہی سو گئی اور وہ بڑبڑا رہی تھی۔ چھوڑ دے میرا ہاتھ میں کل پھر آ جاؤں گی۔ چھوڑ دے راج مجھے چھوڑ دے''۔ میں حیران سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اگر اُسے جگا کے کچھ پوچھتی تو وہ یقیناً انکار کر دیتی۔ میں یہ سوچ کر سو گئی کہ اس کی کاپی پڑھوں گی۔

دوسرے روز میں عین اس وقت اس کے گھر گئی جب وہ بابا کو حکیم جی کے پاس لے کر گئی ہوئی تھی۔ ہم گھروں کے دروازے بند نہیں کرتے تھے۔ میں اندر چلی گئی میں نے الماری سے اس کی کاپی نکالی۔ اس نے لکھا تھا۔

وہ میری بہت تعریف کرتا ہے میں آیت الکرسی کا ورد کرتی وہاں جاتی ہوں۔ میرا رب میری حفاظت کرنے والا ہے اور پھر میرے دوپٹے کے کونے میں بندھی ہوئی پڑیا۔ اللہ کرے اسے کھانے کی نوبت کبھی نہ آئے۔ خودکشی حرام ہے، اور میں حرام موت نہیں مروں گی۔ باری تعالیٰ میری مدد کرنا اپنے حبیب کے صدقے میری مدد کرنا''۔

چوکیدار کی آواز دُور سے نزدیک آتی اور پھر دُور چلی جاتی ہے۔ وہ بہت بے صبر ہو رہا ہے لیکن میں

نے اسے بہلا رکھا ہے جمعہ کی رات تک کے لیے۔ میں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ جمعہ کی رات وہ شبھ گھڑی آئے گی۔ جب، میں اس کی دلہن بنوں گی''۔

میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ یہ میری صفورا تو نہیں۔ میں اس کو نہیں بخشوں گی۔ میرے راج دلارے زروان کی منگ اور ایک ڈوگرہ فوجی کی دلہن بننے جارہی ہے۔ میں سوچتی ہوئی اپنے گھر لوٹ آئی مگر اس شام بڑا طوفان آیا۔ بادل بھی گرج گرج کر بولے۔ بجلی ایسے چمکتی تھی گویا سب کچھ جلا کر راکھ کردے گی۔ مگر اس سے بڑا طوفان صفورا کے لیے اٹھایا گیا۔ ماسی ریشماں کے چوکیدار بیٹے نے صفی کو کرنل کے بنکر کی طرف آتے دیکھا تھا۔

اور اس طوفانی رات میں بھی وہ میرے پاس آگئی۔ سمٹی سمٹائی بھیگی ہوئی۔ میں نے اس کو اپنے کپڑے دیئے اور کھلوں کے پاس بٹھا کر قہوے کا پیالہ تھمایا تو وہ کانپ رہی تھی۔ صفی تو کہاں سے آرہی ہے اور بستی والے کیا کہہ رہے ہیں کیا تو ڈوگرے کرنل سے ملنے جاتی ہے۔''

دادی ماں ہنس پڑیں، اب وہ مجھ سے مخاطب تھیں، ''تو مجھے حسین وجمیل سمجھتی ہے نا مگر اس میں تو سارے کشمیر کا حسن سمٹ کر آگیا تھا۔ اس کی ہنسی جلترنگ بجاتی تھی اور میں اس کی ہنسی کی دیوانی تھی مگر اس رات وہ ہنسی کھنک نہیں رہی تھی۔ کچھ روتی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''بستی والے تو دیوانے ہیں۔ میں تو ہر رات تیرے پاس آتی ہوں تُو تو گواہ ہے نا اس بات کی۔''

''مگر تُو ذرا دیر سے آتی ہے یا اس لیے مجھے بھی شک ہورہا ہے۔'' جب میں نے اس کی طرف سے آنکھیں چراتے بات کی تو وہ پھر ہنس پڑی۔

''بابا کو کھانا کھلا کر برتن دھو کر عشاء کی نماز پڑھ کر جب تیرے پاس آؤں گی تو دیر ہی ہوگی۔ بابا کو پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے۔ کھانا جلدی جلدی نہیں کھاتا اور مجھے کون سا جلدی ہوتی ہے۔ ہماری تو رات اپنی ہے نا۔ ایرج اور صفی کتنے خوبصورت نام ہیں تو مجھے بھول تو نہیں جائے گی نا اگر میں مرجاؤں تو۔''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''صفی خدارا ایسی باتیں نہ کر۔ ہم ہیں ہی کتنے کہ ایک دوسرے کو کھو دینے کا سوچیں۔ چل سو جا پتہ نہیں کیا اوٹ پٹانگ بولتی رہتی ہے۔''

اگلے روز پھر مجھے اس کی کاپی پڑھنے کا شوق چرایا تو میں اس کے گھر چلی گئی۔ وہ بہت جلدی میں تھی کہنے لگی، ''ایرج تھوڑی دیر بیٹھو مجھے ایک کام ہے۔ جلدی آجاؤں گی ذرا حکیم صاحب تک جارہی ہوں'' اور وہ جلدی سے چلی گئی۔ میں تو موقعہ کی تلاش میں تھی اندر گئی اور کاپی ڈھونڈ کر پڑھنے بیٹھ گئی۔

''بابا بھی مجھے آوارہ سمجھ رہے ہیں، بد چلن، حرافہ۔ بابا میں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے بابا کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ بابا! اگر آپ نے مجھے آوارہ سمجھ لیا ہے تو میرا گلا گھونٹ دیں۔ کند چھری سے میری بوٹی بوٹی الگ کردیں۔ میں اُف نہیں کروں گی۔ میں تو آج بھی آپ کی ننھی صفورا ہوں۔ جسے آپ اپنے کندھوں پر بٹھا کر سیر کرواتے تھے۔ میں تو ایسی ماں کی بیٹی ہوں جس کے ساتھ بھائی شہادت کے پگڑ پہنے آج بھی راتوں کو گلیوں میں جوانوں کے جذبات آزادی کے لیے بیدار کررہے ہیں۔ بابا! میں پلید نہیں''۔ بابا نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''نہیں صفورا، میری بچی مجھے اپنے خون پر شک نہیں۔ تُو نے جس ماں کا دودھ پیا ہے وہ حوروں سے زیادہ پاک تھی۔ یہ لوگوں کی باتوں کا کیا کروں''۔

میں نے بابا کو بہلا دیا ہے۔ اُسے کچھ نہیں بتایا۔ بھلا

یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔ وہ ڈوگر کرنل جو مجھے اپنی دلہن بنانے کے خواب دیکھ رہا ہے اور میں کیا میں پوری جرأت اور بہادری سے کچھ کر سکوں گی۔ میرے اللہ! مجھے صحیح راہ بھی دکھا اور میری مدد بھی فرما"۔

اس کے قدموں کی آواز سن کر میں نے کاپی وہیں رکھی اور ٹوپی پہننے میں محو ہو گئی۔ وہ ہنستی ہوئی اندر آئی اور میرے اوپر دھڑام سے گر گئی۔ "میں بہت خوش ہوں ایرج بس دعا کرو میں، جو کام کرنا چاہتی ہوں وہ اللہ کے کرم سے کر پاؤں"۔

میں نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا، ... پڑھ کر میں جان تو گئی تھی کہ وہ کوئی انہونی کرنے والی ہے مگر میری ناقص عقل، اس انہونی تک پہنچ ہی نہیں سکی۔ جب میں نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔

"جا ایرج بوبی جی کو کھانا کھلا۔ پھر اُن کو دوا بھی دینی ہو گی میں رات کو آؤں گی نا۔ پھر بہت سی باتیں ہوں گی حیران نہ ہو۔ تجھے سب کچھ بتاؤں گی۔ تجھے نہیں بتاؤں گی تو اور کسے بتاؤں گی؟" اور یہ جمعرات کی رات تھی۔ دن بھر فوجی ٹرکوں کی آوازیں آتی رہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔ کوئی بندہ بھی آتا نظر نہیں آتا تھا مگر یہ تو یہاں ہوتا ہی رہتا تھا۔ ہمارے یہاں جوان لڑکیاں اپنی گرہ میں زہر لیے پھرتی تھیں اپنی عزت پر حرف آنے سے پہلے وہ چٹکی بھر زہر انہیں عزت کی موت دے دیتا تھا۔ مجھے رات کا انتظار تھا وہ آئی مگر دیر سے۔ لوگوں کی باتوں پر اب صفورا کے لیے لعنت ملامت تھی۔ وہ ...ں کو پتھر مار مار کر مار ڈالنا چاہتے تھے مگر تایا ابا کا ... شملہ ... کی راہ میں دیوار بنا کھڑا تھا۔

... نے ... ڈانٹ دیا "کیوں بے غیرت کرنے جا رہی ہے، لوگ اب کسی بھی وقت تجھے سنگسار کر دیں گے صفورا اور تیرے ساتھ میرا بھائی بھی بے بسی کی موت مر جائے گا"۔

"صبر کر ایرج! ابھی تیری صفی اتنی بے غیرت اور آوارہ نہیں ہے کہ لوگ اسے سنگسار کر دیں۔ غلط فہمی کو دور بھی تو کیا جا سکتا ہے نا اور شاید مجھے اپنی صفائی دینے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور میرا اللہ میری عزت کے تار تار آنچل کو خوبصورت ستاروں کی لڑیوں سے بھر دے"۔

وہ ایسے بول رہی تھی جیسے کوئی خواب میں باتیں کرتا ہے۔ "اس کا نام پتہ نہیں کیا ہے مگر میں اُسے جب راج کہتی ہوں تو وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے" اس کی اس بات نے میرے صبر کے پیالے کو چھلکا دیا اور میں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ پر وہ تو ہنس رہی تھی "لے، جی بھر کے مار لے آج مجھے پھر شاید تجھے کبھی یہ موقعہ نہ ملے"۔

"کیا مطلب کیا تو اُس کمینے کے لیے ہم سب کے منہ پر کالک مل رہی ہے کیا تو اسکے ساتھ بھاگ جائے گی۔ باپ کا شملہ زمین میں روند دے گی" میں اب اُس پر چیخ رہی تھی اور اماں برابر بول رہی تھیں "کیوں لڑ رہی ہو تم دونوں۔ کتنی بار کہا ہے ایک دوسرے کی بات سن لیا کرو۔ یہ برداشت ہی نہیں ان لڑکیوں میں" اماں کو اگر حقیقت کی خبر ہو جاتی تو شاید اُس کا سانس بند ہو جاتا۔

صفی ہنستے ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "زری کو دھوکہ دوں کبھی ہو ہی نہیں سکتا جی! لیکن جب کہیں سے فرض کی پکار آ جائے تو ایسے ہزاروں زروان قربان کر دوں گی۔ بیٹھ جا۔ رات گزر رہی ہے اور میں تجھے وہ سب بتا دینا چاہتی ہوں جو ہونے جا رہا ہے۔

پھر اس نے بہت سی باتیں تو وہی کہیں جو میں کاپی ... پڑھ چکی تھی پھر اُس نے اپنی خوبصورت آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔

''تیری صفی آج بھی اتنی ہی پاکیزہ ہے جتنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن سن پہلے دن جب وہ سورما ملا تھا، میرے اردگرد ایک روشنی کا ہالہ بن گیا تھا اور یہ صرف چار دن پہلے کی بات ہے۔ ان چار دنوں میں رب نے مجھے کیا کیا دکھادیا تُو سوچ بھی نہیں سکتی۔ لیکن میں وہ سب بتا کے وقت ضائع نہیں کروں گی کیونکہ وقت بہت کم ہے۔ سُن میری پیاری ایرج، آنیوالی رات بہت کچھ لارہی ہے۔ آج دن بھر ٹرکوں میں ٹنوں بارود کے ڈبے آئے اور یہاں کرنل کے بڑے ٹینکر میں ذخیرہ ہوتے رہے اور یہ سارا بارود اگلے چند روز میں ہم سے چار بستیاں چھوڑ کر جو بڑا شہر ہے وہاں لے جایا جائے گا اور یہ خبیث خود ہی فساد پیدا کرکے بے دریغ بارود استعمال کریں گے۔ میرے وطن کی گلیاں خون میں نہا جائیں گی اور سیب کے ننھے شگوفے اور آڑو اور خوبانی کے خوبصورت درخت بارود کی بُو سے جھلس جائیں گے۔ کتنے بچے یتیم اور کتنی تیرے میرے جیسی صفورائیں بیوہ ہوجائیں گی۔ میں اس بار ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میری دوست آج تیری اور میری آخری ملاقات ہے۔ کل تُو مجھے کشمیر کی دلہن بنائے گی اور میں سہاگ رات میں اپنی جان کا نذرانہ اپنے پیارے وطن کو پیش کرکے معمولی سا کام کر جاؤں گی۔ بڑی مشکل سے میں نے اس خبیث سے اپنے آپ کو بچائے رکھا ہے۔ شراب کے نشے میں وہ سب کچھ بول جاتا ہے اور میں اُسے بہت بہادر بڑا سورما کہتی رہتی ہوں۔ میں نے اُسے حُسن اور بہادری کے ایسے سنگھاسن پر بیٹھا دیا ہے کہ اس کی عقل بالکل ماؤف ہوچکی ہے اور اللہ کرے اس کی عقل ماؤف ہی رہے۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں دلہن بن کر آؤں گی مگر اُس شبھ گھڑی سے پہلے تُو نے میرے ساتھ صرف باتیں کرنی ہیں مجھے چھونا نہیں تو اجی......!'' وہ زور سے ہنسی، ''وہ عقل کا اندھا اتنا خوش ہوا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ میرا رب ہے اجی! جس نے مجھے اس راہ پہ ڈالا اور میرے لیے ساری راہیں سیدھی کرتا جارہا ہے ورنہ میں تو کتنی ڈرپوک ہوں تُو جانتی ہے''۔

''نہیں صفو! کوئی کشمیری لڑکی ڈرپوک نہیں، ہم سب بہت بہادر ہیں، ہم عزت سے جینا اور عزت سے مرنا جانتے ہیں لیکن میں تیرے لیے ڈر رہی ہوں صفو، تیری ننھی سی جان!''

اس نے میری بات کاٹ دی'' اس ننھی سی جان میں ایمان کی طاقت اور وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بس کل رات تُو نے مجھے کشمیر کی دلہن بنانا ہے اور زری کو بتا دینا میں نے اس سے کوئی دھوکہ نہیں کیا۔ میرے وطن نے مجھے پکارا اور میرے رب نے مجھے حکم دیا تو میں انگاروں پر چلنے کے لیے نکل آئی۔ آ میرے ساتھ لگ کے سو جا کہ پھر ہماری ملاقات فردوس بریں کے تختوں پر ہوگی اور وہاں تُو مجھے اپنے بھائی کی دلہن بنائے گی''۔

اس کی خوابناک آواز آہستہ آہستہ مدہم ہوگئی وہ میرے ساتھ لگ کے ایسے سورہی تھی جیسے کوئی ننھی منی فرشتہ صفت بچی اپنی ماں کے ساتھ چپک کے سو رہی ہو، میری آنکھیں اُسے تکے جارہی تھیں اس کا حُسن اور بھی بڑھ گیا تھا شاید اُس کے حُسن سے شرما کر چاند نے بھی سیاہ لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

دادی کہہ رہی تھیں، ''میرا جمعہ کا دن کیسا گزرا۔ بنو میں بتا نہیں سکتی، لوگوں کی صفی کے خلاف باتیں سُن سُن کر خون کھول رہا تھا۔ لیکن مجھے صفی کو دی ہوئی قسم کو نبھانا تھا اور اس راز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن رکھنا تھا اور سب کو یہی بتانا تھا کہ وہ تو ساری رات

میرے ساتھ ہوتی ہے اور وہ کبھی بھی بُری نہیں ہوسکتی۔ دن میں میں دوبار اس کے گھر گئی وہ بابا کی ساری چیزوں کو سلیقے سے رکھ رہی تھی۔ اس نے گھر کی ہر چیز کو سجا سنوار دیا۔ اس نے بابا کی پسندیدہ پنجیری بنا کے چھوٹے چھوٹے گولے بنائے اور ڈبے میں ڈال دیئے۔ اس نے دل وڑیاں بنائیں اور انہیں بھون کر رکھ دیا۔ میں اُسے دیکھ رہی تھی ایک عجیب ماورائی سا حُسن اس کے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی کوئی عام مسکراہٹ نہیں ایسی مسکراہٹ جو کسی محبوب ترین چیز کو حاصل کرنے کا خواب دیکھتے ہوئے ہوتی ہے۔ پھر فارغ ہو کر وہ نہائی، سیاہ لمبے بالوں کو سکھا کر بڑی سی چٹیا بنائے ہوئے وہ بولی "اجی! اللہ تعالیٰ نے زندگی کو اپنی امانت کہا ہے نا، میں نے اس کی امانت میں کبھی خیانت نہیں کی اور آج میں اس کی امانت اُسے لوٹانے جارہی ہوں، اجی! تمہارے صبر اور دعاؤں کی ضرورت ہے، اللہ مجھے اس امتحان میں کامیاب کرے"۔

میں نے آمین کہا۔ تم سوچ سکتی ہو بنو! کہ اُس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ بچپن کی سکھی یوں مجھ سے دُور چلی جائے گی وہ سکھی جس کو میں نے اپنے بھائی کی دُلہن بنانا تھا۔ ہم لڑکیاں کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں۔ پر اُن کی تعبیریں تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہیں میں نے سارا دن آیت الکرسی کا ورد کرتے گزار دیا اور پھر رات کے بعد اس کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ رات ڈھلے جب وہ میرے آنگن میں اُتری تو جیسے چاروں طرف نور ہی نور بکھر گیا۔ اس کی آنکھوں کی جوت بہت بڑھ گئی تھی اتنی کہ بنو! مجھ سے اس کی آنکھوں میں دیکھا نہ گیا۔ جیسے مہندی کی رات دُلہن بہت پارسا، بہت سندر، بہت نکھری ہوئی لگتی ہے نا۔ میری صفوان سب سے بڑھ کر لگ رہی تھی۔ ماں نے دو دفعہ کہا۔ "آج تو کیا کھٹ پھٹ کررہی ہے اجی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "آج بڑا خاص لمحہ آنے والا ہے ماں۔ جب چاندنی ہمارے آنگن میں اُترے گی۔" ماں جو دیکھ نہیں سکتی تھی ہنس پڑی۔ "بس تُو اور صفی تو صرف باتیں بنانے میں ماہر ہو۔ آئی نہیں ابھی تیری چاندنی"۔ "بس آتی ہی ہوگی" میں نے مختصر سا جواب دیا کیونکہ میں آیت الکرسی کو اپنے لبوں سے جُدا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ماں کو ابھی علم نہیں تھا کہ صفورا تو کب کی آچکی ہے اور میں اُسے دُلہن بھی بنا رہی ہوں لیکن ماں کے لاڈلے زروان کی نہیں، اپنے اور اس کے اور سب کے کشمیر کی دُلہن۔

جب وہ بجی سنوری میرے سامنے بیٹھی تھی تو میرے اندر جذبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ تو پُرسکون تھی، بے حد پُرسکون کیونکہ وہ ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے جارہی تھی۔

پھر وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی "تیرے سارے واہمے ختم ہو چکے ہیں نا اجی! تجھے یقین ہے نا کہ تیری صفورا اپنے وطن پر اپنا سب کچھ نثار کرنے جارہی ہے۔ میرے جانے کے ٹھیک پون گھنٹے کے بعد اگر دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو جائیں تو یقین کر لینا کہ تیری صفی اپنے وطن پر جان نثار کر کے جنت کی راہوں پر چل پڑی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو تو سمجھ لینا کہ میں نے زہر چکھ کر اپنے آپ کو موت کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہے کیونکہ کرنل کے بینکر سے ہم جیپ پر بڑے بینکر میں جائیں گے۔ جو تقریباً چالیس منٹ دُور ہے اور پھر وہ بے صبر سور فوراً مجھے اپنی دلہن بنانے کے لیے اگنی کے پھیرے لینا چاہے گا اور وہی اگنی اس کے لیے جہنم اور میرے لیے جنت کے در کھول دے گی۔ یہ ساری باتیں اُس کی بتائی ہوئی تھیں اجی! میں تو بس ایک پتنگ ہوں۔ ایسی پتنگ

جس کی ڈور اُنگلیاں کاٹ ڈالتی ہے۔ اب مجھے جانے دے کیونکہ وہ شبھ گھڑی آنے والی ہے۔ جس کا اس کو انتظار ہے اور مہربان رحمتوں بھرے لمحے جن کا مجھے انتظار ہے۔ اپنے لبوں کو آیت الکرسی کے ورد سے سجائے رکھنا اجی! بابا سے کہنا اس کی بیٹی آج بیٹا بن گئی ہے۔ جس کی اُسے ہمیشہ سے حسرت رہی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کاش میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا جسے وطن کی مانگ میں سندور آزادی بھرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا۔ اب ہم سب جنتوں میں ملیں گے۔‘‘

اور وہ چلی گئی، میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ رات کی سیاہی میں میری آنکھیں اُسے جاتے دیکھ رہی تھیں اور وہ جل پری کی طرح ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔

پھر میں نے اندر آکر جائے نماز بچھائی اور سجدے میں گر گئی۔ میں رو رہی تھی۔ کیا دُعا کر رہی تھی مجھے کچھ خبر نہیں۔ میرے آنسوؤں سے زمین بھیگ رہی تھی۔ میری صفو کی حفاظت کرنا میرے رب اس کی عزت و پاکیزگی کی حفاظت کرنا۔ اسے اپنے امان میں رکھنا باری تعالیٰ! اسے تنہا نہ چھوڑنا۔ اس شیطان سے اس کی حفاظت کر، جانے کتنا وقت بیت گیا۔ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر گیا۔ کتنے تارے ڈوبے اور کتنے نئے ابھرے مجھے کچھ خبر نہیں یہ لمحے نہیں، تھے صدیاں تھیں۔ جو میرے آنسوؤں کی روانی میں بہے جا رہی تھیں۔

اور پھر ایک دم سے، زمین لرز اُٹھی۔ ساری بستی گھروں سے باہر نکل آئی۔ ماں بھی میرا ہاتھ تھامے باہر آگئی۔ بابا بھی اپنی لاٹھی ٹیکتے آگئے۔ ہر ایک کی زبان پر تھا ’’یہ کیا ہو رہا ہے، کیا بستی پر حملہ ہونے والا ہے، کیا ڈوگرے یہاں آگئے ہیں‘‘۔ ’’صفو کہاں ہے اجی! میری بیٹی کہاں ہے؟‘‘

بابا نے فوراً اُسے تلاش کرنا چاہا تو میں بابا سے لپٹ گئی۔ میں نے بابا کے کان میں روتے ہوئے سرگوشی کی ’’بابا یہ تیری بیٹی کی بارات ہے جس پہ پٹاخے چل رہے ہیں۔ تیری بیٹی اپنے وطن کی دلہن بن کے اس پر قربان ہوگئی ہے، رو نہیں بابا، شہیدوں کے لیے روتے نہیں‘‘ اور میں ماں اور بابا کو لیے اندر آگئی اور میں نے ساری بات اُن کو تفصیل سے سنائی۔ میں رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔ اور بابا..... وہ تو شاید عرش کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ اُن کی پیشانی اتنی نورانی تو کبھی بھی نہ تھی۔ کیا یہ ایک شہید کا باپ ہونے کا اعزاز اللہ نے انہیں عطا فرمادیا تھا۔ ’’میری بچی‘‘ پتہ نہیں کیا کیوں، اس لمحے مجھے صفو سے بہت حسد ہوا۔ وہ، میری ہمجولی، میری سکھی، میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے والی، میرے مشوروں پر عمل کرنے والی پانچ روز کی ریاضت سے کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور میں تو وہیں کی وہیں تھی۔ ایک ڈرپوک، بزدل چوزے کی طرح بابا اور ماں کی بانہوں میں سسک رہی تھی۔

وہ دھماکے جانے کتنی دیر تک ہوتے رہے تھے لیکن وہ کہاں تھے، صبح تک کسی نے کچھ بھی نہ کہا ... آواز آتی رہی۔ اور ہم ڈرے سہمے اپنے گھروں میں دبکے رہے کیونکہ اب گھر گھر تلاشی شروع ہونے والی تھی اور ہمیں نہیں بتانا تھا کہ ہماری بستی کی دوشیزہ ایک عظیم الشان کارنامہ سرانجام دے کر شہید ہو چکی ہے۔

پھر کئی روز تلاشی میں گزر گئے، بستی کے کسی بندے نے صفورا کا ذکر نہیں کیا حالانکہ سب کو اس کی شہادت کا یقین ہو چکا تھا۔ اگلی راتوں میں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی دبے پاؤں آنگن میں چل رہا ہے اور بڑی خوش الحانی سے آیت الکرسی کا ورد کر رہا ہے۔ بہت سے مردوں پر تشدد بھی کیا گیا۔ جن میں صفی کے بابا بھی شامل تھے۔ پھر سب گھروں کو آگئے۔ بستی میں سرگوشیاں اُبھرتی تھیں۔ ’’رات کو تم نے دیکھا ایک دلہن گلیوں میں

گھوم رہی تھی'' رات کو تمہیں کسی خوشبو نے گھیرا، بہت سندر، مستانی سی خوشبو تھی جو آگے آگے جا رہی تھی اور منو دلہن بنی مسکراتی چھم چھم کرتی میرے آنگن میں تو روز اُترتی تھی۔

بعد میں لوگوں نے کہا کہ ڈوگرہ کرنل نشے میں دھت تھا۔ اس کو ٹھوکر لگی اس کے ہاتھ سے سگریٹ گر کر کسی ڈرم کے ساتھ ٹکرائی اور چاروں طرف تباہی پھیل گئی لیکن یہ ٹھوکر کس نے لگائی کسی کو اس کا علم نہ تھا۔

....

دادی ماں رو رہی تھیں اور میرا بھی بُرا حال تھا'' وہ بولیں اس کے بعد گھر گھر تلاشی ایک بدروح کی طرح ہمارے علاقے میں گھس آئی۔ جوان بیٹیوں کو کہاں چھپائیں۔ عزتیں کیسے محفوظ ہوں گی۔ ہمارے مفتی صاحب نے ہجرت کا فتویٰ دے دیا اور یوں ہم اپنا وطن اپنی ماں جیسی پاک زمین اپنے لہلہاتے کھیت' شگوفوں سے لدے درخت اور گنگناتی فضاؤں کو چھوڑ کر آ گئے لیکن میری بنو! میرا گیت سن لو۔

میرے وطن! میرے وطن
تیری جنت میں آئیں گے اک دن
ستم شعاروں سے تجھ کو چھڑائیں گے اک دن
شگفتگی گل و نسترن نہیں بھولے
حسین پھولوں کی وہ انجمن نہیں بھولے
تیری بہاروں میں پھر مسکرائیں گے اک دن
جہاد حق کے لیے کر رہے ہیں تیاری
دکھائیں گے صف دشمن کو شانِ قہاری
تیری فضاؤں میں کلیاں کھلائیں گے اک دن
بھلاؤں کیسے مناظر تیری بہاروں کے

اور روتے روتے، دادی ماں کی ہچکی بندھ گئی ''وعدہ کرو میرے ساتھ! تم لوگ میری جنت کو دشمن کے چنگل سے آزاد کراؤ گے، وعدہ کرو''۔

اور میں آج صفی کی ڈائری کا وہ صفحہ پڑھ رہی ہوں ''نہ رو بٹی! میرے گھر کا چراغ تجھ سے روشن ہے۔ صفی! میں اپنی ساری توانائیاں ایک بیٹے کے کاندھے پر رکھنا چاہتا تھا۔ ان ہاتھوں سے پھینکے ہوئے وزنی بم اس کی ملکیت میں دینا چاہتا تھا۔ میری جوانی نے ہزاروں دشمنوں کی جوانیاں خون میں نہلا دی تھیں اور میں سوچتا تھا ایک بیٹا میری اس طاقت کو اور مضبوط کر دے گا میری ننھی کلی! تو یہ سب نہیں کر سکتی! اللہ کرے تیرے وجود سے جنم لینے والے تیرے بیٹے اس خوبصورت وادی کو ابلیسی دشمن کے چنگل سے آزاد کروالیں''۔ ''بابا! میں تیری دعا ہوں۔ میں وہ آہنی ہاتھ بن جاؤں گی جس سے دشمن کو بہت بڑا نقصان ہوگا اور بابا میں تیرا سر فخر سے بلند کروں گی''۔

اور یہ سب پڑھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں ''ناز و نعم میں پلنے والے ہم کیا کبھی اتنے مضبوط ہو سکیں گے۔ ایئر کنڈیشنڈ سکولوں میں پڑھنے والے بچے، اور کمپیوٹر اور آئی پیڈ پہ گیمز کھیلنے والے بچے کیا بھاری بندوقوں اور بموں کا بوجھ اٹھا سکیں گے۔ ہم تو دن بدن ایک نازک اندام قوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایمان کی بہت ساری کمزوریوں کے ساتھ لیکن اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ یہیں سے ایک ایسی قوم پیدا کرے گا جو اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے اقبال کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرے گا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کیونکہ ایک عورت بھی عزم و ہمت کی دیوار بن سکتی ہے اور عورت کے عزم کے سامنے تو چٹانیں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔

ہنسی علاج غم

حساب

استاد: (شاگرد سے) اگر تین مرغیاں اور ایک مرغ ہو تو کل کتنے بچے ہوں گے؟

شاگرد: (سوچ کر) جی تقریباً ساٹھ انڈے اور ان میں سے تقریباً چالیس چوزے نکلیں گے۔

(مرسلہ: خالدہ عمران۔ وزیر آباد)

دانتوں کا ڈاکٹر

ایک جگہ پہلوانوں کی کشتی ہو رہی تھی۔ ایک صاحب بڑے زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ''توڑ دے توڑ دے بتیسی کے بتیس دانت توڑ دے''۔

ایک اور صاحب نے پوچھا۔ ''کیا آپ ان کے سپورٹر ہیں؟''

''جی نہیں میں تو ڈینٹسٹ (دانتوں کا ڈاکٹر) ہوں''۔ جواب ملا۔

(مرسلہ: شہزادی ناہید۔ ساہیوال)

وجہ

دو دوست کچھ دن بعد ملے تو ایک نے دیکھا کہ دوسرے کے سامنے کے تین دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ پوچھا۔

''ارے یہ کیا ہوا تمہارے سامنے کے تین دانت کہاں گئے؟''

''یار بیوی نے کڑک روٹی بنائی تھی''۔ جواب ملا۔

پہلا دوست بولا: ''تو بھلے مانس کھانے سے انکار کر دیتے''

دوسرے دوست نے جواب دیا۔ ''وہی تو کیا تھا''۔

(مرسلہ: حیدر ناظم۔ لاہور)

''سنہری موقع''

جج (چور سے) تم نے جوہری کی دکان سے زیورات چرائے تھے۔

چور۔ جی ہاں۔ جج۔ مگر کیوں؟

چور۔ کیونکہ جوہری کی دکان کے شوکیس پر تحریر تھا۔ سنہری موقع سے فائدہ اٹھائیں۔

(مرسلہ: نوشین اسد۔ لاہور)

دعویٰ

ایک بچہ ایک عامل کے پاس گیا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ روحوں سے ملاقات کروا سکتا ہے اور بولا میں اپنے دادا کی روح سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

عامل اسے ایک نیم تاریک کمرے میں لے گیا جہاں ایک سنجیدہ آواز آئی ''کیا بات ہے میرے پوتے''

بچے نے کہا ''دادا جان! آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے۔ آپ کا تو ابھی انتقال بھی نہیں ہوا؟''

(مرسلہ: انجم سلمان۔ حافظ آباد)

غصہ

ایک پٹواری ایک جگہ زمین کا معائنہ کرنے گیا۔ وہاں اسے کتوں نے گھیر لیا۔

بھاگتے بھاگتے اس نے غصے سے کہا۔ ''کاش تمہاری ایک ایکڑ بھی زمین ہوتی تو میں تمہیں سبق سکھا دیتا۔''

(تحریر: مرتضیٰ حسن۔ پشاور)

افسوس

ایک بڑے شہر کے بک سیلر سے کسی مذہبی آدمی نے مذہب سے متعلق دو کتابوں کے ایڈیشن طلب کیے۔ ایک کتاب کا نام ''خدا کے ماننے والے'' اور دوسری کا نام ''خدا پر اعتماد'' تھا۔ بک سیلر نے وعدہ کیا کہ وہ ہفتے کے اندر یہ نئے ایڈیشن دوسرے شہر سے منگوا دے گا۔ اس نے تار دیا۔ وہاں سے جواب آیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہاں ''خدا کے ماننے والے اور خدا پر اعتماد کرنے والے'' دونوں ہی ختم ہو چکے ہیں۔

”محبت کی معراج“

محمد سلیم اختر

تاریخ کے جھروکوں سے ایک یادگار تحفہ، نواب سعد اللہ خان کی دلہن کی کہانی جس نے اپنی شادی کے لیے چار من الائچی فراہم کرنے کی شرط رکھی تھی!

نواب ہاتھی پر سوار تھا، دلہن کا ڈولا سرخ اطلس اور پھولوں سے سجا تھا، سونے اور چاندی کے پھول اس پر نچھاور کیے جا رہے تھے۔ نواب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گاؤں سے باہر درخت کے نیچے کھڑا شیرو رو رہا تھا۔ ڈولا جب اس کے پاس سے گزرا تو نواب نے ڈولی سے پردہ اٹھا کر شیرو سے کہا ”شیرے، جب میں مر جاؤں تو آ کر اپنے ہاتھوں دفن کر دینا“۔

پٹنہ کے قریب ایک گاؤں لکھل پور میں ایک نہایت ہی غریب شخص کی بیٹی کے حُسن اور خوبصورتی کے بہت ہی چرچے تھے۔ غربت نے بھی اس کا حُسن ماند نہیں پڑنے دیا تھا۔ گویا کیچڑ میں پھول والا معاملہ تھا۔ وہ غربت کی ماری ”آٹا، نمک اور مرچ پیس کر گزارا کرتی تھی۔ وہ جب چکی پر بیٹھتی تو اس کے حُسن کو چار چاند لگ جاتے۔ اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حُسن کی بے پناہ دولت سے نوازا تھا۔ جو بھی اس حُسن کی دیوی کو دیکھتا، مبہوت سا ہو جاتا، حیران رہ جاتا اور اس کے حُسن کو اپنے خوابوں

اور خیالوں سے نہ جھٹک پاتا۔

ریاست کے ولی عہد سعد اللہ خان کی جب اس پر پہلی نظر پڑی تو قدرت کی صناعی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے ایک ایک رنگ سے حُسن کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہیرے شہاب جیسی رنگت اور اسکی مدھ بھری نشیلی آنکھیں دیکھ کر اسے لگا کہ جیسے اپسرا بھول کر زمین پر اُتر آئی ہے۔ ولی عہد اتنا بے قرار ہوا کہ اس نے بے اختیار ہوکر اس کی بانہہ پکڑلی۔ پھولوں سی لدی شاخ جیسی بانہہ۔ اس کے ہاتھ میں آنے کی دیر تھی کہ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلی۔ وہ کھیتوں میں دُور تک بھاگتی چلی گئی۔ ولی عہد بھی اس کے پیچھے بھاگتا اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا بالآخر اس نے اسے جالیا۔

اسی کھیت میں لڑکی کا باپ کام کررہا تھا۔ اس نے بیٹی کی چیخیں اور فریاد سنی تو بھاگا...... اس کو آتے دیکھ کر ولی عہد نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہوکر ہوا ہوگیا۔ لڑکی کے باپ نے بیٹی کو گلے سے لگایا اور ولی عہد کو دُور تک جاتا دیکھتا رہا۔

اس لڑکی کا نام وحیدن تھا۔

ولی عہد نے ایک عرصہ تک اپنی ہر کوشش کرڈالی کہ وہ لڑکی اس کی حرم سرا میں آجائے۔ طرح طرح کے لالچ دیئے گئے مگر اسے کامیابی نہ مل سکی۔ وحیدن کے باپ نے جلدی سے اس کی شادی کردی اور وہ اپنے گھر کی ہوگئی اور اپنے شوہر کے ہمراہ خوش وخرم زندگی گزرنے لگی۔ یہ اس دور کی بات ہے کہ ہر طرف امان وانصاف اور خداترسی تھی۔ ولی عہد کا باپ نہایت ہی سخت اور اصول پسند قسم کا انسان تھا اور خاص کر اس معاملے میں وہ زبردستی کا قائل نہ تھا ورنہ وحیدن کسی نہ کسی طرح حرم سرا کی مہمان بن ہی جاتی۔

ولی عہد کو ناکامی ہوئی تو اس نے اس غم کو سینے سے لگالیا۔ اس نے اس غم کو بھلانے کے لیے شراب کا سہارا لیا اور دن رات شراب کے نشے میں دھت رہنے لگا۔ وحیدن اس کے خوابوں اور خیالوں سے نہ نکل رہی تھی۔ اس نے اوپر تلے کئی شادیاں کر ڈالیں۔ عیش وعشرت کی محفلیں بھی سجائیں۔ مگر وہ وحیدن کو نہ بھلا سکا۔ وہ جب بھی وحیدن کو دیکھتا اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ وحیدن کئی بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ ان میں اس کی بیٹی نوان سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ اپنی ماں پر گئی تھی بلکہ اس سے بڑھ کر تھی۔ وہی رنگ وہی نقش ونگار، وہی روپ، وہی جوانی کا خمار، وہی بانکپن...... جسے ولی عہد نے دیکھا تو وہ نوان پر فدا ہوگیا۔

نوان اب جوان ہو چکی تھی جبکہ ولی عہد بڑھاپے کی دہلیز کو چھو رہا تھا مگر اس کا عشق ابھی بھی جوان تھا۔ نوان کو دیکھ کر وہ وحیدن کو بھول گیا اور نوان سے شادی کرنے کے خواب دیکھنے لگا وہ نوان سے شادی کرکے اپنی وہ حسرتیں پوری کرنا چاہتا تھا جو وحیدن کے نہ ملنے سے ناکام ہوگئی تھیں۔ مگر نوان ولی عہد کے ارادوں سے بے خبری تھی وہ تو اپنی دنیا میں اور پیار میں مگن تھی۔ گاؤں کا چرواہا شیرو، نوان سے بے پناہ محبت کرتا تھا وہ ایک گھبرو جوان تھا اور مردانہ حُسن میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ پورے گاؤں میں اس جیسا بہادر اور لٹھ باز جوان نہیں تھا۔ چاندنی راتوں میں جب وہ بانسری کی تان چھیڑتا تو راہ چلنے والے بھی ٹھٹک جاتے۔ اس کی بانسری میں ایک جادو تھا۔ حسن وعشق کا جادو جو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ نوان اس سے محبت کرتی تھی۔ شیرو نے نوان سے محبت کے زیادہ عہدو پیمان نہ کیے بلکہ اس سے شادی کرنے کا کھل کر اظہار کرڈالا اس نے اپنی ماں کو نوان کا رشتہ لینے اس کے گھر بھیج دیا۔

وحیدن بھی بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی پھر بھی وہ اسی طرح حسین تھی۔ اسے ایک پچھتاوا

اب بھی تھا اور وہ کہتی تھی کہ ایک غریب انسان کی بیوی بن کر میں نے اپنی قدر و قیمت کھودی ہے۔ کاش میں محل کی رانی بن کر رہتی اور مزے سے راج کرتی دنیا کی ہر چیز میرے قدموں میں ہوتی۔

اس کا غریب شوہر سنتا تو دکھی سا ہو جاتا اور کہتا ”وحیدن ! جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ میں نے غریب ہونے کے باوجود تجھے اتنا پیار دیا ہے کہ دنیا جانتی ہے کہ تمہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تجھے اتنی خوبصورت اور پیاری اولاد دی ہے“۔

مگر وحیدن اب ناسودہ خواہشات اور پچھتاوؤں کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ اسے خوبصورت ولی عہد یاد آتا۔ تو پچھتاوے اسے گھیر لیتے گاؤں میں کبھی کبھار اس سے مڈبھیڑ ہوتی تو اس کی آنکھوں میں وہی پیار دیکھ کر وہ پچھتانے لگتی کہ اس کی شادی ولی عہد سے ہوتی تو وہ کیسی حسین زندگی گزار رہی ہوتی۔ نوان کے لیے شیرو چرواہے کا رشتہ آیا تو اسے ایسا لگا کہ جیسے وقت کی مہار کسی نے تھام لی ہو۔ وحیدن جانتی تھی کہ نوان شیرو سے پیار کرتی ہے۔ اسے لیے اس نے نوان کو اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ پیار ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا، زندگی گزارنے کے لیے مال و دولت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بھی بہت کچھ درکار ہے...... مگر نوان کچھ نہ بولی...... وہ خاموش ہی رہی۔

شیرو کی ماں روزانہ ہی وحیدن کے گھر آنے لگی اور نوان کے رشتے کی بات کرتی مگر وحیدن کا جواب

تاخیر

ایک ٹیلر ماسٹر ایک پوشاک بنانے والی فرم میں پچیس برس سے ملازم تھا اور وہ کبھی بھی کام پر تاخیر سے نہ پہنچا تھا۔ ایک روز وہ نو بجے کی بجائے دس بجے اپنے کام پر پہنچا تو اس کے سر اور بازوؤں پر پلاسٹر اور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فرم کے مالک نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا...... ”تم دیر سے کیوں آئے ہو؟“

ٹیلر ماسٹر: میں ناشتے کے بعد تیسری منزل پر واقع اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا کہ نیچے گر گیا۔

”تو اسی میں ایک گھنٹہ لگ گیا“ فرم کے مالک نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

(دُعا حیدر۔ لاہور)

کرامات

مقابلے کے امتحان میں امیدوار سے پوچھا گیا: ہندوؤں کے ایسے دو لیڈروں کے نام بتائیے جن میں سے ایک نے مسلمانوں کو سینے سے لگایا اور دوسرے نے پیچھے سے چھرا گھونپا۔

امیدوار: باپو اور گاندھی جی۔

بورڈ کا چیئرمین: آپ بالکل صفر ہیں افسری خاک کریں گے؟ آپ کو اتنا معلوم نہیں کہ گاندھی کو باپو کہا جاتا ہے۔ آپ تشریف لے جائیے۔

امیدوار: جناب! مجھے تو بہت کچھ معلوم ہے لیکن شاید آپ لنگوٹی کی کرامات سے واقف نہیں ہیں۔

لاجواب

ایک خاتون نے ایک فقیر کو بہت سے پرانے کپڑے دیتے ہوئے کہا یہ سب تمہارے کام آ جائیں گے۔ انہیں معمولی سی مرمت کی ضرورت ہے زیادہ سے زیادہ ایک دن کا کام ہے۔

ٹھیک ہے بیگم صاحبہ تو پھر میں کل آ جاؤں گا۔ فقیر نے کپڑے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

(مرسلہ: نصیر اختر۔ لالہ موسیٰ)

نہ پاکر ایک روز بولی اور کہنے لگی'' وحیدن ! ہم بھی تمہاری طرح غریب لوگ ہیں مگر تم تو جانتی ہو کہ نُوان اور شیرو ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتے ہیں تُو نوان کی شادی کے لیے ہاں کردے، وہ دونوں تمام عمر خوش رہیں گے، اب کوئی نواب زادہ تو نہیں آئے گا نوان کو بیاہنے''۔

وحیدن بولی''میں نوان کی شادی کسی نواب ہی سے کروں گی شیرو سے نہیں''۔

وحیدن نے یہ کہہ کر شیرو کی ماں کو انکار کردیا۔

سعد اللہ خان، جو اب نواب بن چکا تھا۔ اس نے بھی اپنے آدمی وحیدن کے پاس نوان کے رشتے کے لیے بھیج دیے۔ وحیدن کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے نوان کو بتایا مگر وہ بے چاری کیا کہتی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی ماں شیرو سے تو اس کی شادی کسی صورت نہ کرے گی اس نے سن رکھا تھا کہ نوابوں کی شادیوں میں الائچیاں' عطر اور پھول آتے ہیں۔ نوان نے تو زندگی میں الائچی دیکھی بھی نہ تھی۔ نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ وہ بولی اور ماں سے کہنے لگی''نواب سے کہو کہ میری بری میں پانچ من الائچیاں لا سکتا ہے تو میں شادی کے لیے تیار ہوں!!''نوان نے یہ سوچا تھا کہ الائچی کوئی بہت ہی مہنگی چیز ہوگی۔ نواب نہ لا سکے گا اور شادی سے انکار کردے گا۔ یوں اس کی شادی شیرو سے ہوجائے گی یہ نوان کی سادگی اور بھولپن تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ الائچی تو ایک سستی چیز ہے جو نواب کے لیے ناممکن نہیں ہوگا۔

یہ 1760ء کا ذکر ہے اس وقت حالات کچھ زیادہ ہی خراب تھے۔ مرہٹے ملک میں تباہی مچا رہے تھے اور تخت تاراج کر رہے تھے۔ راجہ بھرت پور اور سورج مل جاٹ، مہار راؤ بکر اور سندھیا کا ساتھ دے رہے تھے ان کے فوجی شہر میں لوٹ مار کرتے پھر رہے تھے۔

مرہٹہ پیشوا بالاجی باجی راؤ، پورے ہندوستان پر اپنے راج کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک قیامت سی بپا تھی۔ نفسا نفسی کا دور دورہ تھا۔ مغل حکومت طوائف الملوکی کا شکار تھی ۔ ولی عہد شاہ عالم کرناٹک میں تھا اور دلی کے لال قلعے میں شاہ عالم کے بیٹے جواں بخت تھے۔ سداشیو بھاؤ اور بسواس راؤ نے تین لاکھ لشکر کے ساتھ دلی میں قدم رکھا۔ قلعہ دار یعقوب خان اور اس کے پانچ ہزار سپاہی اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ قلعہ بند ہوکر کب کرتے۔ مجبوراً قلعہ مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا۔ مرہٹوں نے جوان بخت کو تخت نشین کرکے وزارت شجاع الدولہ والی اودھ کے حوالے برائے نام کردی۔

ایسے میں سارے کاروبار بند تھے۔ منڈیاں اور بازار ویران تھے۔ نوان کی فرمائش نواب کے لیے تھوڑا سا مسئلہ تو بنی مگر اس نے حکم نافذ کیا کہ کسی طرح پانچ من الائچی فراہم کی جائے تاکہ وہ بارات لے کر جا سکے۔ بمشکل تین من الائچی ملی۔ نواب کے کارندوں نے مزید فراہمی سے انکار کردیا۔ نواب نے پھر سختی سے حکم دیا کسی بھی شہر اور کسی بھی جگہ سے الائچی خریدی جائے ورنہ کسی کی خیر نہیں۔ کارندے حکم پاکر پھر سے الائچی کی تلاش میں نکلے وہ بنارس اور فیض اودھ تک گئے اور کسی نہ کسی طرح الائچی لے ہی آئے۔

وحیدن اس روز بہت خوش تھی کہ اس کے گھر نواب کی بارات آنے والی تھی۔ نہایت شان وشوکت دھوم دھڑکے اور باجے گاجے کے ساتھ بارات آئی۔ ہزاروں روپے لٹائے گئے۔ وہ ربیع الاول کی نوتاریخ تھی۔ جب نوان کا نام بدل کر نزہت محل رکھا گیا۔ نواب ہاتھی پر سوار تھا، دلہن کا ڈولا سرخ اطلس اور پھولوں سے سجا تھا، سونے اور چاندی کے پھول اس پر نچھاور کیے جارہے تھے۔ نوان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گاؤں سے باہر درخت کے نیچے کھڑا

شیرو رو رہا تھا۔ ڈولا جب اس کے پاس سے گزرا تو نوان نے ڈولی سے پردہ اٹھا کر شیرو سے کہا "شیرے! جب میں مرجاؤں تو آ کر اپنے ہاتھوں دفن کر دینا"۔

شیرو نے روتے ہوئے وعدہ کرلیا۔ نواب نے سن لیا اور نئی نویلی دلہن کی یہ خواہش پوری کرنے کا وعدہ کرلیا۔ نواب نے نوان کو الائچی محل کا خطاب دے ڈالا۔

چند برس گزرے تو نواب کا انتقال ہوگیا محل میں چار بیوائیں موجود تھیں۔ نوان روزانہ ہی صبح کو محل کے جھروکے میں آ کر بیٹھ جاتی اور وہاں سے شیرو کو دیکھا کرتی۔ ۵۰ سال گزر گئے۔ یہاں تک کہ اس پر بھی بڑھاپا آ گیا۔ 53 سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ 53 سال نوان نے شیرو کو دُور دُور سے دیکھ کر گزار دیئے۔ وہ اتنے برس سے موت کا انتظار کرتی رہی کیونکہ مرنے کے بعد ہی وہ اپنے محبوب کی بانہوں میں جا کر سکون سے ابدی نیند سو سکتی تھی۔ نوان کی آخری تمنا یہی تھی۔ یہی اس کی آخری خواہش تھی۔ شیرو روز صبح جھروکے کے باہر آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک دن وہ حسب معمول آیا تو نوان وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کا دل گھبرانے لگا کیونکہ اتنے برسوں میں کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا۔ محل کے دروازے پر آ کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ نوان بیمار ہے۔ شیرو بہت ہی فکر مند ہوگیا۔ پندرہ دن یوں ہی گزر گئے۔ نوان پندرہ دن بیمار رہ کر مرگئی۔ شیرو کو پتہ چلا تو وہ روتا پیٹتا آیا تھا۔ نوان جس نے ایک جھونپڑی میں جنم لیا تھا موت اسے محل میں لے آئی تھی۔

نوان کو سب الائچی محل کے نام سے پکارتے تھے۔ نواب کی بڑی بیگم نے اس کی لاش شیرو کے حوالے کی اور طنز سے بولی "یہ الائچی واقعی تمہارے لیے موزوں تھی"۔

شیرو روتا پیٹتا نوان کو محل سے لے آیا اور اسے گنگا کے کنارے برگد کی چھاؤں میں اسے دفن کردیا۔

اس نے نوان کی قبر پر ایک ریشمی چادر چڑھائی اور روتے ہوئے بولا "یہ تھی میری شادی اور یہ میری دلہن جو مٹی کے نیچے سو رہی ہے"۔

اپنی محبت کو یادگار بنانے کے لیے بوڑھے گڈریئے شیرو نے دن رات محنت کرکے مٹی سے ایک مقبرہ بنالیا۔ مٹی کے ہر ذرے میں اس کی محبت فروزاں ہے۔ کوئی ذرہ اور کوئی اینٹ ایسی نہ تھی جس پر اس کے آنسو نہ ٹپکے ہوں۔

مٹی کا یہ انمول مقبرہ آج بھی محبت کی داستان لیے ہوئے ہے۔ چاندنی راتوں میں یہ روشن روشن مقبرہ اپنی داستان محبت زبان خموشی سے بیان کرتا ہے۔ آج بھی پٹنہ کے قریب گنگا کے کنارے مٹی کا یہ خوبصورت مقبرہ پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اسے "مقبرہ الائچی بیگم" کہا جاتا ہے۔ دُور دُور سے سیاح اور محبت کے متوالے آ کر محبت کی یادگار دیکھتے ہیں اور پھر سر جھکا کر نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہر سال یہاں عرس منعقد ہوتا ہے۔ محبت کرنے والے اور نوجوان لڑکیاں یہاں آ کر چادریں چڑھاتی ہیں۔ یہ چادریں محبت کی امین ہوتی ہیں اور ان کو تحفے میں دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ویلنٹائن ڈے کو تو یہاں محبت کے متوالوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ ریشمی چادروں کا ایک انبار لگ جاتا ہے۔ جو بطور تحفہ ایک دوسرے کو دی جاتی ہیں۔ اس چادر کے ہر تار میں محبت کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ نوان کی انمٹ وفا کی خوشبو...... جو یہ ثابت کرتی ہے کہ محبت کبھی نہیں مرتی لیکن اپنا آپ منوالیتی ہے۔ محبت زندہ رہتی ہے۔

نوان مٹی سے بنی تھی، مٹی میں مل گئی اور اس کا مقبرہ بھی مٹی کا ہی بنا۔ جو اہل دل کو سنگ مرمر سے بنے تاج محل سے بھی زیادہ پیارا لگتا ہے اور یہی نوان اور شیرو کی محبت کی معراج ہے۔

غزل

جیسے بھی ہو تم میرے ہو
اک بار کہو تم میرے ہو
سو باتوں کی بات ہے یہ
تم جہاں بھی رہو بس میرے ہو
دنیا سے کچھ نہ چھپانا تم
سب سے کہہ دو تم میرے ہو
اب سوچ بچار کو چھوڑو بھی
مجھے اپنالو تم میرے ہو
سب کی باتیں، اب جانے دو
بس مہر کہے تم میرے ہو

(مہرنسیم/لاہور)

آخر دسمبر کی ایک نظم

دسمبر پھر آ گیا ہے!
بہت سارے گمشدہ لمحے
مجھے آوازیں دیتے ہیں
بہت سارے دلکش مناظر
یادوں کے جھروکوں سے جھانک کر
بیتے ہوئے وہ رنگین موسموں کی
داستانیں سناتے ہیں
مجھے ان سارے لمحوں کو
آج آخر شب تک
ڈھونڈنا ہے
بہت سارے لفظوں کے
گیت بننے ہیں
بہت ساری ساعتوں کو
کہانیوں کی صورت محفوظ کرنا ہے
گلاب موسموں کی داستانیں بھی
رقم کرنی ہیں
زرد رُتوں کی اُداس ساعتوں
کے افسانے بھی لکھنے ہیں
انکو سنانے کو جو بہت دُور رہتے ہیں
مگر آنکھوں میں بستے ہیں
درد کی صورت دل میں سمائے ہیں

(ڈاکٹر درخشاں انجم)

غزل

ایک پردہ سا ہے جو حائل اٹھایا جائے
جلوۂ حسن حسنِ یار دکھایا جائے
اس نے جب اپنی کہانی میں مجھے چھوڑ دیا
اب ضروری ہے کہ کردار نبھایا جائے
جسد خاکی تو میرا کنج لحد پہنچ گیا
اب میرا خون بھی مقتل سے اٹھایا جائے
اس نے آنا ہے جو سائے سے بھی ڈر جاتا ہے
رات کالی ہے کوئی دیپ جلایا جائے
جس نہج پر تھا محبت پہ وہ رانجھے کا یقیں

اس سے آگے، تو میرے وہم کا سایہ جائے
یہ جو اک بوجھ سا کاندھوں پر میرے ہے نصرت
کس کا سر ہے یہ میرے پاس بتایا جائے
(نصرت عارفین/ انتخاب: یاسمین کنول)

غزل

آنکھوں میں سیلاب ہے پیارے اور ہے کیا
اُجڑا اُجڑا خواب ہے پیارے اور ہے کیا
نیند بکھر جاتی ہے ہر اک آہٹ پر
دل میرا بیتاب ہے پیارے اور ہے کیا
نفرت کی دیوار کھڑی ہے راہوں میں
پیار بہت نایاب ہے پیارے اور ہے کیا
آج بھی میری سوچ کے گہرے ساگر میں
کشتی اِک غرقاب ہے پیارے اور ہے کیا
آج بھی رانا اپنا جیون شیشے کا
درد کا ایک ہی باب ہے پیارے اور ہے کیا
(قدیر رانا۔ راولپنڈی)

غزل

تیرے دمِ آخرت پر تجھے الوداع بھی نہ کہہ سکی
تیری سادگی اتنی حسین تھی تجھے بے وفا بھی نہ کہہ سکی
عشق جرم تھا! مگر میں کر بیٹھی تجھ سے
کتنی نادان تھی دنیا اسے خطا بھی نہ کہہ سکی
تیری یاد نے مجھے کبھی تنہا ہونے نہ دیا
آج تنہا ہوئی بھی تو خود کو جدا نہ کہہ سکی
تجھے پوجنے کی حد کردی ساحل نے آج
تو بشر تھا سو تجھے خدا بھی نہ کہہ سکی!!
(ساحل نور)

غزل

دن بھر وہ کرے بات کسی اور طرح سے
اور مجھ پہ کھلے رات کسی اور طرح سے
یا جھومتا گاتا ہوا آئے گا ادھر وہ
یا گزرے گی برسات کسی اور طرح سے
اے زیست تو اب مجھ بھی کہے سوچ لیا ہے
کٹنا ہے تجھے ساتھ کسی اور طرح سے
اس لطف کے اسرار نہیں کھلتے ہیں مجھ پر
کر مجھ سے ملاقات کسی اور طرح سے
اور [illegible] کرو امتیاز پھر اک بار نظارہ
شاید کہ کھلے [illegible] کسی اور طرح سے
(ایس۔ امتیاز احمد)

غزل

کاش کہ ہم بھی تمہیں جان سے پیارے ہوتے
کاش ہر موڑ پر تم ساتھ ہمارے ہوتے
دور ہی جاتا تھا گر پاس نہ آئے ہوتے
خواب آنکھوں میں ہماری نہ اتارے ہوتے
میں بکھرتا نہ کبھی زیست کے ہنگاموں سے
انگلیوں سے جو مرے بال سنوارے ہوتے
تیری الفت کی قسم رہتا اگر ساتھ ترا!!
جیت کے ہم نہ یہ بازی کبھی ہارے ہوتے
سنگ تو مارے زمانے نے مگر کوئی نہ تھا!!
پیار سے جس نے ہمیں پھول بھی مارے ہوتے
شامیں کرتے نہ مرے نام کوئی حرج نہ تھا
کاش کچھ صبح مرے ساتھ گزارے ہوتے
ڈوبنے والا نہ یوں شوق سے ڈوبا ہوتا
تم بھی اک بار جو ساحل سے پکارتے ہوتے
نیر دیتا نہ [illegible] مجھ کو وہ تنہائی کی
مرے دامن میں اگر چاند ستارے ہوتے
(نیر رضاوی)

ماضی

درد سے لرزے ہوئے دن رات ہیں
زلف کی بکھری ہوئی زنجیر ہے
ٹوٹتے تاروں کی کچھ چنگاریاں
پھول کی بکھری ہوئی تقدیر ہے
داستان اُلجھی ہوئی اِک پیار کی
اک ادھورے خواب کی تعبیر ہے
چوڑیوں کے چند ٹکڑے اور اِک
خون سے لکھی ہوئی تحریر ہے
اب تو بس اس دامن ویراں میں ہے
ایک ماضی جو تری تصویر ہے
(وصف وفا)

غزل

ساقی چالان کیے جائیں گے مے خانوں کے
ناپ یکساں نہیں رکھتے ہیں جو پیمانوں کے
اگر گرانی میں جہاں پھول ہوئے ہیں ارزاں!
ریٹ دوگنے ہیں ہونے لگے گلدانوں کے
حضرتِ شیخ کو حق گوئی کی توفیق کہاں؟
وہ تو بھوکے ہیں اوّل روز سے نذرانوں کے
ہم سے ہی کارِ نمایاں کی توقع رکھنا!
ہم کہ سرخیل ہیں اس شہر میں دیوانوں کے
بعض لوگوں کے رویوں سے پتہ چلتا ہے!
بھیڑیے آگئے ہیں بھیس میں انسانوں کے
اب تو تہواروں کی آمد سے ہی خوف آتا ہے
تانتے بندھ جاتے ہیں سسرال سے مہمانوں کے
منتخب ہوگئے ہاؤسنگ کی سکیموں کے لیے
بخت بیدار ہوئے جب بھی بیابانوں کے
کوئی اس شمع پہ تعزیر لگا دے اے کاش
بے سبب قتل کیے جاتی ہے پروانوں کے
ماں کے ممتا سے جدا پیار سے بیوی کا نعیم
ذائقے جیسے الگ ہوتے ہیں 2 کھانوں کے
(نعیم نیازی)

غزل

کسی کو مناؤں یہ جی چاہتا ہے
ہنسوں اور ہنساؤں یہ جی چاہتا ہے
سرراہ آنچل وہ رُخ سے ہٹا دیں
کہ پھر زخم کھاؤں یہ جی چاہتا ہے
مجھے جام ایسا نظر سے پلا دے
غموں کو بھلاؤں یہ جی چاہتا ہے
کہ اب بن تمہارے بسر کیسے ہوگی
میں ان کو سناؤں یہ جی چاہتا ہے
تباہی کا احساس اپنی دلا کر
انہیں آزماؤں یہ جی چاہتا ہے
بہاروں کا موسم مجھے راس آئے
میں غنچے کھلاؤں یہ جی چاہتا ہے
مجھے ان سے الفت ہوئی جا رہی ہے
میں ان کو بتاؤں یہ جی چاہتا ہے
اُجالے اُخوت کے پھیلیں جہاں میں
دیا وہ جلاؤں یہ جی چاہتا ہے
دیا درس الفت کا اقبال تم نے
جہاں کو سناؤں یہ جی چاہتا ہے
(اقبال آرزو)

غزل

بُری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتہ
ہر اک پنکھڑی یوں نکھر جائے گی

رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
کوئی دن میں، گنگا اُتر جائے گی
اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر
یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں
یونہی عمر ساری گزر جائیگی
سنیں گے، نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائیگی
(الطاف حسین حالی)

غزل

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں میں سے یہی ایک سوال اچھا
جس کا انجام مصیبت وہ خوشی بھی ہے بُری
جس کا انجام خوشی ہو وہ ملال اچھا ہے
روز آتا ہے میرے دل کو تسلی دینے!
تجھ سے اے دشمن جاں تیرا خیال اچھا ہے
کہتے ہیں آج تو ناخن سے مرے دی تشبیہ
کل کہو گے ترے ابرو سے ہلال اچھا ہے
شک سے بوسہ ابرو نہیں دیتے وہ امیر
کہوں کیا میں نے غزل میں کہ ہلال اچھا ہے
(امیر مینائی)

سردی

کیسی سب کی حالت سردی!
یہ لو! غضب کی آئی سردی
اٹھلاتی بل کھاتی سردی
ٹھنڈک خوب ہے لائی سردی
کپڑے گرم نکالے سب نے!
کمبل اور رضائی...... سردی
گرمی کے دن بیتے.... سن لو!
موسم کی انگڑائی سردی!
کھاؤ پستے اور...... بادام!
پی لو سوپ کرو..... آرام!
گاجر مولی حلوہ جات
سردی کی ہیں سب سوغات
آئی سردی آئی سردی
یہ لو! غضب کی آئی سردی
(ڈاکٹر نعیم احمد ادیب)

غزل

جو اہل عشق ہیں نایاب ہوتے جاتے ہیں
یہ زندگی کے چلن خواب ہوتے جاتے ہیں
نشے کی جھانجھ میں، پیر مغاں کے منصوبے
جواریوں کے حسیں خواب ہوتے جاتے ہیں
وہ ذرے جن پہ نہ سورج کی پڑسکیں کرنیں
تمام کرمک شب تاب ہوتے جاتے ہیں
ابھی تو صاحب ظرف و ضمیر ہیں کچھ لوگ
مگر یہ لوگ بھی کمیاب ہوتے جاتے ہیں
تھا جس کی گونج سے آبادیوں میں واویلا
زمیں میں جذب وہ سیلاب ہوتے جاتے ہیں
گزرے ہیں جو شام و سحر کے ہنگامے
کتاب وقت کا اک باب ہوتے جاتے ہیں
(احسان دانش)

غزل

مستانہ پیے جا یونہی مستانہ پیے جا
پیمانہ تو کیا چیز ہے میخانہ پیے جا

کہ غرق مے و جام، غم گردش ایام
تو اے دل ناکام حکیمانہ پیے جا
مئے نوشی کے آداب سے آگاہ نہیں تو
جس طرح کہے ساقی میخانہ پیے جا
اس مکر کی بستی میں ہے مستی ہی سے ہستی
دیوانہ بن اور با دل دیوانہ پیے جا
مئے خانے کے ہنگامے میں کچھ دیر کے مہماں
ہے صبح قریب اختر دیوانہ پیے جا
(اختر شرانی)

غزل

رات بھر اس کشمکش میں اک پل سویا نہیں
کل میں جب جانے لگا تو اس نے کیوں روکا نہیں
یوں اگر سوچوں تو اک اک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں
کیوں اڑاتی پھر رہی ہے دربدر مجھ کو ہوا
میں اگر اک شاخ سے ٹوٹا ہوا پتا نہیں
آج تنہا ہوں تو کتنا اجنبی ماحول ہے
ایک بھی رستے نے تیرے شہر میں روکا نہیں
درد کا رستہ ہے یا ہے ساعت روز حساب
سینکڑوں لوگوں کو روکا ایک بھی ٹھہرا نہیں
شبنمی آنکھوں کے جگنو کانپتے ہونٹوں کے پھول
ایک لمحہ تھا جو امجد آج تک گزرا نہیں
(امجد اسلام امجد)

غزل

شراب چیز ہی ایسی ہے نہ چھوڑی جائے
یہ میرے یار کے جیسی ہے نہ چھوڑی جائے
ہر ایک شئے کو جہاں میں بدلتے دیکھا
مگر یہ ویسی کے ویسی ہے نہ چھوڑی جائے
اسی کے دم سے چھلکتی ہیں یہ بوجھل راتیں
مگر یہ پانی کے جیسی ہے نہ چھوڑی جائے
یہی تو ٹوٹے دلوں کا علاج ہے انجم
میں کیا کہوں تجھے کیسی ہے نہ چھوڑی جائے
(سردار انجم)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام:............ تعلیمی قابلیت:............
عمر:............ پسندیدہ شاعر:............
پسندیدہ غزل/نظم:............
مشاغل:............ تاریخ پیدائش/برج:............
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:............ پتہ:............
ای میل:............

نوٹ: اپنی پسند ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

سیّارۂ خواتین کارنر

ذہنی دباؤ عورتوں کو سہیلیوں کے قریب کردیتا ہے

''ویانا یونیورسٹی'' کے مطالعاتی جائزہ سے پتا چلا ہے کہ مرد اور عورت ذہنی دباؤ کی حالت میں مختلف برتاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ذہنی دباؤ کی حالت عورت خود کو اپنی سہیلیوں سے زیادہ قریب کر دیتی ہے جبکہ اس کے برعکس مرد دباؤ کی حالت میں خود کو اپنی ذات تک محدود کر لیتا ہے۔ مرد اس موقع پر زیادہ انا پرست بن جاتا ہے لیکن دوسری جانب عورت میں دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ماہر نفسیات کلاز لام کے مطابق لوگوں میں دباؤ سے نمٹنے کی حکمت عملی کے طور پر دو بنیادی رویے ظاہر ہوتے ہیں جس میں یا تو وہ خود کو اپنی ذات تک محدود کر لیتے ہیں یا متبادل کے طور پر زیادہ کھلے دل سے دوسروں کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ محققین نے بتایا کہ نتائج سے یہ واضح ہو گیا کہ دباؤ کی حالت میں عورتوں میں پرسکون نظر آنے والے اپنے ہم منصب مردوں کی بہ نسبت دوسروں کے نقطہ نظر کی تفہیم زیادہ بہتر تھی۔ البتہ مردوں پر اس کیفیت کا مخالف اثر ہوا تھا جو ان میں دوسروں کے احساسات کو سمجھنے کی صلاحیت کو کمزور بنا رہی تھی۔

خواتین قوت سماعت کی حفاظت کے لیے مچھلی کھائیں: تحقیق

طبی ماہرین نے قوت سماعت کی حفاظت کے لیے ایک آسان نسخہ تجویز کیا ہے کہ خواتین کو بڑھاپے میں قوت سماعت کے نقصان کے خطرے کو کم کرنے کے لیے مچھلی کھانی چاہیے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ہفتے میں کم از کم دو بار مچھلی کھانا اس دائمی مرض کی روک تھام یا اس میں تاخیر کا سبب بن سکتا ہے۔ 'ہارورڈ میڈیکل اسکول' سے منسلک محققین کے مطابق انھوں نے ایک ایسا مضبوط کنکشن دریافت کیا ہے جس سے مچھلی اور اس کے تیل میں موجود اومیگا 3 فیٹی ایسڈ کھانے اور قوت سماعت کو نقصان پہنچنے کے امکان میں کمی کے درمیان تعلق ظاہر ہوا ہے۔

محققین نے تجربے میں 65 برس کی خواتین کو شامل کیا جن کی 1991ء سے 2009ء تک ماہرین نے نگرانی کی۔ اس دوران 11,000 خواتین سماعت کے کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہوئیں۔ ہفتے میں دو یا زائد بار مچھلی کا استعمال کرنے والی خواتین میں سماعت کے نقصان کا خطرہ 20 فی صد کم رہا بہ نسبت ایسی خواتین کے جو کبھی

ہفتوں، مہینوں یا چھ برسوں میں مچھلی کا استعمال کرتی تھیں۔ امریکن جرنل آف کلینیکل نیوٹریشن میں شائع ہونے والی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ قوت سماعت کے نقصان سے حفاظت کو کم کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی مچھلی کھانا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کرہین کے بقول، ''مچھلی سماعت کی صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہے اور سماعت پر کیسے براہ راست اثرانداز ہوتی ہے؟ اس قدرتی طریقۂ کار کے بارے میں ہم لاعلم ہیں''۔ لیکن انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق کان کے اندر خون کے بہاؤ سے ہو جسے توانائی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور مچھلی اور اس کے تیل میں موجود اومیگا تھری فیٹی ایسڈ خون کے بہاؤ میں مددگار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کرہین کے مطابق یہ مطالعہ خواتین کی صحت کے لیے خوراک میں مچھلی کے فوائد کی ایک تازہ ترین مثال ہے۔ اس سے قبل کئی تحقیقات میں ظاہر ہوا ہے کہ مچھلی میں موجود حیوانی پروٹین اور اومیگا تھری فیٹی ایسڈ کے استعمال سے دل کے امراض اور الزائمر کا خطرہ کم کیا جاسکتا ہے اسی طرح حاملہ ماؤں کو ضروری غذائی اجزا فراہم کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

خواتین صرف تعاون نہیں مقابلہ بھی پسند کرتی ہیں: تحقیق

انسانی معاشرے میں ایک تصور عام ہے کہ مرد، عورت کے مقابلے میں اپنے گرد و پیش سے زیادہ آگہی رکھتا ہے اور اسی لیے وہ مسابقت میں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عورتیں مقابلے سے گھبراتی ہیں اور انھیں تعاون کرنے میں زیادہ بہتر تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک حالیہ تحقیق سے وابستہ سائنس دانوں نے اس تصور کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے مطالعے میں اگرچہ یہ خیال درست ثابت ہوا ہے کہ مرد مقابلے کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن دوسری جانب یہ تاثر بھی غلط ثابت ہوا ہے کہ عورتیں مقابلے سے زیادہ تعاون کو پسند کرتی ہیں۔ فن لینڈ کی 'آلٹو یونیورسٹی' سے منسلک تحقیق کاروں کی ٹیم نے مسابقت اور تعاون کے ساتھ کھیلنے کے لیے جس قسم کا جسمانی ردعمل ظاہر ہوتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

نتائج سے پتا چلا کہ مردوں نے تعاون سے زیادہ مقابلے کو انجوائے کیا جبکہ عورتیں یکساں طور پر مقابلے اور تعاون، دونوں سے ہی لطف اندوز ہوئیں۔ ڈاکٹر میشیاز نے کہا کہ کھیل کے دوران نہ تو مردوں نے اور نہ ہی عورتوں نے منفی جذبات کے حوالے سے کوئی واضح فرق محسوس کیا، جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ مسابقتی رویے کی حوصلہ افزائی میں صرف مثبت جذبات کردار ادا کرتے ہیں۔ تحقیق کاروں کا کہنا ہے کہ نتائج سے واضح ہوتا ہے کہ کھیل کے دوران عورتیں مقابلے کے برعکس تعاون حاصل کرنے پر زیادہ لطف اندوز نہیں ہو رہی تھیں۔

محققین کے مطابق یہ ہوسکتا ہے کہ مردوں کے حوالے سے پایا جانے والا یہ تصور کہ وہ تعاون کے بجائے مقابلے کو زیادہ پسند کرتے ہیں، قدرتی اختلافات کے بجائے صنفی توقعات کا نتیجہ ہو۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کرکے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email:sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

شاهی کوفتے

اجزاء:

مشینی قیمہ	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
چنے کی کھیلیں	تھوڑی سی
نمک، مرچ	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت
لہسن ادرک	دو چمچ پسا ہوا
ٹماٹر	ایک عدد
زیرہ	دو چمچ
انڈے	چھ عدد

ترکیب:

قیمہ باریک پیس لیں اور اس میں گرم مصالحہ اور ہری مرچیں اور ہرا دھنیا مکس کرلیں (سب مصالحہ پسے ہوئے ہوں) پھر قیمہ کو انڈوں کے گرد لپیٹیں اور کوفتے بنائے انڈوں کے گرد قیمہ لپیٹنے سے قبل اس میں چنے کی کھیلوں کا چورا بھی ملادیں۔ کوفتے بنانے

کے بعد گھی کڑکڑا کر اور انڈا پھینٹ کر کوفتے اس میں بھگو بھگو کر تل لیں پھر پیاز گھی میں ہلکا براؤن کرلیں اور مصالحہ بھونیں اس میں سوکھا دھنیا اور زیرہ ڈال دیں اور پھر ٹماٹر بھی ڈال دیں اور خوب بھونیں۔ سب کچھ یکجان ہونے کے بعد اس میں تھوڑا سا پانی ڈال دیں اور گریوی اپنی پسند کی رکھ کر

گرم مصالحہ اور کٹا ہوا دھنیا ڈال دیں پھر اس میں کوفتے ڈال دیں شاہی کوفتے تیار ہیں۔

زردہ
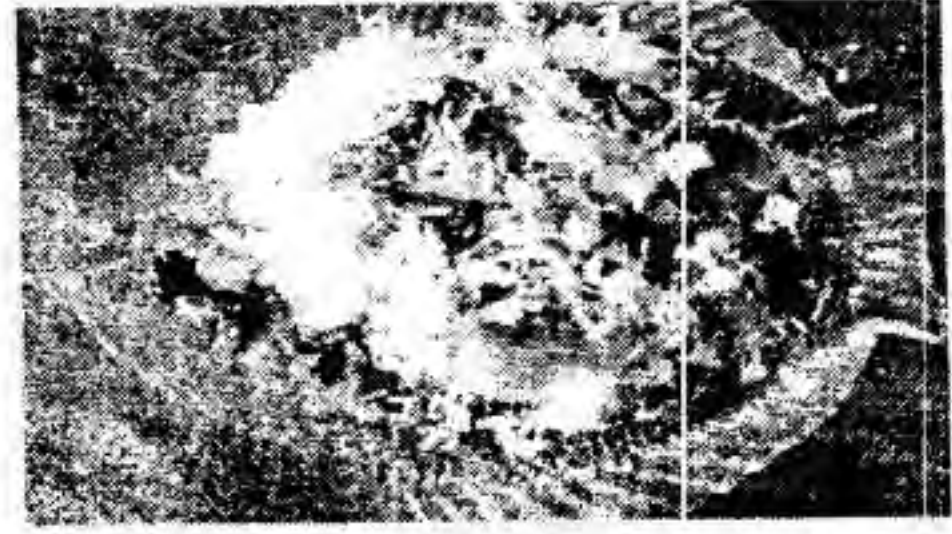
اجزاء:

چاول	ایک کلو
چینی	ڈیڑھ کلو
گھی	ڈیڑھ پاؤ
بادام	ایک چھٹانک
پستے	ایک چھٹانک
کشمش	ایک چھٹانک
الائچی	چار عدد

ترکیب:

چاول کو اُبلنے کیلئے چولہے پر چڑھا دیں اور اس میں تھوڑا سا زردا رنگ ڈال دیں جب چاول ایک کنی رہ جائے تو اس کا پانی نتھار کر دم دے دیجئے پھر ڈیڑھ کلو چینی میں ایک پاؤ پانی ڈال کر چاشنی تیار کرلیں گھی میں بادام، پستے، الائچی اور کشمش ڈال کر سرخ کرلیں اور اس میں تیار کی ہوئی چاشنی ڈال دیں اور اسے اُبلے ہوئے چاولوں میں ڈال کر چولہے پر رکھ دیں اور چمچہ چلاتی رہیے یہاں تک کے چاشنی خشک ہو جائے تھوڑی سی زعفران دودھ میں گھول کر دم کے ساتھ ڈال دیں اور اسے ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں جب دم ہو جائے تو چولہے سے اُتار لیں زردہ تیار ہے۔

ہرا مصالحہ چکن

اجزاء:

چکن (12 ٹکڑے)	½-1 کلو
ہری مرچ	8 عدد
ہرا دھنیا	2 گٹھی
درمیانی پیاز باریک سلائس	2 عدد
ادرک لہسن کا پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
کٹی کالی مرچ	1 چائے کا چمچہ
لیموں	3-4 عدد
دہی	½ عدد
تیل	1 کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: پہلے 1 کھانے کا چمچہ ادرک لہسن کا پیسٹ اور حسب ذائقہ نمک کو ½ کپ دہی کے ساتھ بلینڈ کرلیں۔ اب ½-1 کلو چکن کو ایک پین میں ڈالیں اور اوپر سے اس پر دہی ڈال کر مکس کریں اور بغیر ڈھکے پکائیں، یہاں تک کہ پانی خشک ہو جائے۔ پھر دوسری پین میں تیل گرم کرکے اس میں 2 عدد درمیانی پیاز کے سلائسز کو ہلکا سا براؤن کرلیں، اب پیاز نکال کر الگ رکھیں یہاں تک کہ وہ خستہ ہو جائے۔ پھر اسے پین میں تیار چٹنی ڈال کر

پکائیں۔ اب چکن کو الگ سے فرائی کرکے چٹنی میں شامل کریں۔ پھر اس میں 1 چائے کا چمچہ کٹی کالی مرچ، فرائی کی ہوئی پیاز اور تین چار لیموں کا رس ڈال کر ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر پکنے کیلئے چھوڑ دیں۔ آخر میں سادے چاول یا پراٹھوں کیساتھ سرو کریں۔

پروفیسر غلام رسول

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ

اللہ کے کامل ولی کی زندگی کے ایمان افروز واقعات جو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں

حلیہ سے وہ نوجوان دیوانہ سا دکھائی دیتا تھا۔ بکھرے بال گردوغبار سے اٹا وحشت زدہ چہرہ لیے دیوانہ وار مستانہ نعرے بلند کرتا چلا جارہا تھا۔ جسم پر پہنا ہوا خرقہ یوں جھول رہا تھا جیسے کسی مداری نے اُوٹ پٹانگ سا لباس پہن رکھا ہو۔ کبھی راہ چلتے لوگ حیرت سے اُسے دیکھتے پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتے۔ انہی راہ گیروں میں اُس نوجوان کا ایک پرانا استاد شیخ فتح اللہ بھی تھے۔ انہوں نے جب اپنے لائق اور ہونہار شاگرد کو اس حال میں دیکھا تو حیرت میں پڑ گئے کہ آیا یہ واقعی انہی کا شاگرد ہے۔

وہ ذہین شاگرد جس کی ذہانت اور علم دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ جو اپنی ابتدائی عمر میں ہی قابل تعریف کتب کا مصنف بن چکا تھا۔ جس کی صرف کے موضوع پر لکھی کتابوں کو وقت کے کامل فن اساتذہ نے یہ کہہ کر سراہا تھا کہ ''علم میں یہی ایک کتاب کافی ہے''۔ چنانچہ اُس نوجوان کو اس دیوانگی کے عالم میں دیکھ کر استاد جتنی بھی حیرت محسوس کرتا کم تھی۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اپنے شاگرد کو جا پکڑا اور حیرت زدہ لہجے میں کہا ''یہ کیا مداریوں کی سی حالت بنا رکھی ہے؟'' نوجوان نے جو استاد کو دیکھا تو آنکھوں میں لحہ بھر کو آشنائی کی چمک پیدا ہوئی جو اگلے ہی لمحے ماند پڑ گئی پھر بے رُخی سے جواب دیا ''میں مداریوں میں سے نہیں ہوں'' استاد نے اس کا نوٹس لیے بغیر تاسف بھرے انداز میں کہا ''افسوس! ہم تو تمہاری قابلیت اور طباعی کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے اور تم ہو کہ ہمیں جھٹلانے کے درپے ہو۔ دیوانوں کا بھیس بدلے ہمیں جھوٹا ثابت کرتے پھر رہے ہو، کچھ پڑھ بھی رہے ہو یا یونہی دیوانگی میں دن گزار رہے ہو؟'' نوجوان شاگرد نے لہرا کر جواب دیا ''پڑھ رہا ہوں...... پڑھ رہا ہوں...... میں حیرانی کی کتاب پڑھ رہا ہوں'' یہ کہہ کر دیوانہ وار ایک طرف کو دوڑ لگا دی اور چند لمحوں بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا اور شیخ فتح اللہ اپنے شاگرد کی حالت پر دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہ نوجوان جس کی اس کے استاد بے پناہ عزت کرتے اور اس کی قابلیت کی مثالیں پیش کرتے تھے۔ تاریخ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے نام سے مشہور ہو۔ 860 ہجری میں ردولی کے ایک مشہور عالم شیخ اسماعیل کے ہاں پیدا ہوئے۔ باپ نے بیٹے میں چھپی فطری و پیدائشی خوبیاں پہچان لیں۔ سو دوسری اولاد سے بڑھ کر چاہا اور تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا اور بیٹے نے بھی ثابت کر دیا کہ باپ کی نظر نے دھوکہ نہیں کھایا تھا۔ باپ کی اس توجہ کو عبدالقدوس نے رائیگاں نہ جانے دیا اور ہونہار اولاد کی طرح باپ کے اندازوں اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر طالب علمی کے زمانہ میں ہر لحہ مطالعہ میں صرف کیا، کتابوں سے عشق پیدا کیا۔ رات کو عبادت کی خاطر جاگتے۔ دن بھر علوم ظاہری حاصل کرتے اور رات خالق حقیقی وحدہٗ لاشریک کے آگے سجدے میں گزرتے۔ اس کی شاہ پڑھتے علم و ادب کے دائرے میں پروان چڑھتے پھلتے پھولتے رہے۔ شیخ اسماعیل نے بھی بیٹے کی اس عبادت اور علمی جدوجہد کو مسرت و رشک سے دیکھا۔ بیٹے کو دیکھتے تو آنکھیں منور ہو جاتیں۔

یہ سلسلہ تشفی بخش طور پر جاری تھا کہ ایک دن اچانک عبدالقدوسؒ کے سینے میں نجانے کیسی آگ بھڑ کی کہ جذب کی غیر معمولی کیفیت طاری ہو گئی۔ وجد کے عالم میں کپڑے پھاڑے اور دیوانہ وار نعرے بلند کرتے باہر نکل آئے۔

ماں کو جب بیٹے کی حالت کا علم ہوا تو صدمے سے نڈھال ہو گئیں۔ شوہر فوت ہو چکا تھا اور بیٹے نے دیوانہ بن کر بیوگی کا صدمہ پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ وہ روتی ہوئی اپنے بھائی قاضی دانیال کے پاس گئیں اور بیٹے کی حالت کا ذکر رو رو کر بیان کیا۔ قاضی دانیال بھی بھانجے کا حال سُن کر آبدیدہ ہو گئے۔ شہر کے حاکم تھے فوراً کارندوں کو بھیج کر بھانجے کو بلایا۔ قریب بٹھا کر نرمی سے پوچھا ''قدوس یہ کیا حالت بنا رکھی ہے رے۔ ماں کو کیوں تنگ کرتا ہے اور یہ تعلیم کیوں چھوڑ دی۔ یاد رکھو اگر یہی حال بنائے رکھا تو ہم تجھے سخت سزا دیں گے''۔

قدوسؒ نے یہ سن کر چلا چلا کر کہنا شروع کر دیا

''ہم سزا لیں گے، ہمیں سزا دو سخت سزا دو'' اس اثناء میں کہیں سے گیت کی آواز آئی۔ گانے کا عبدالقدوسؒ کے کانوں میں پڑنا تھا کہ وجد میں آ گئے حالت غیر ہوگئی۔ ماموں نے جو بھانجے کا یہ حال دیکھا تو دُکھ سے بہن سے کہا ''بہن! پریشان نہ ہو، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ آبادیاں اس کے لیے زنجیر بن گئی ہیں۔ یہ قیس بن چکا ہے۔ صحرا ہی اس کے مرض کا واحد علاج ہے، کچھ نہ کہو اسے''۔

عبدالقدوسؒ کو اب بالکل کھلی چھٹی مل چکی تھی۔ سارا وقت مجذوبوں اور قلندروں کی صحبت میں رہتے مگر کسی پل قرار نہ تھا۔ سینے میں آگ بھڑکی تو بجھنے کا کسی طور پر نام نہ لے رہی تھی۔ ہر پل بے چین ہر لحہ بے قرار عشق دیوانہ وار سفر کرتا رہا۔ بے خود سے ہوکر کبھی کہاں نکل جاتے کبھی کدھر کا رُخ کرتے۔ ایک دن اسی بے خودی و بے قراری میں دیوانہ وار کہیں بھاگے جارہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کی راہ روک لی اور پوچھا ''شیخ...... یہ راستہ تو ردولی سے باہر کی طرف جاتا ہے کدھر کا ارادہ ہے؟''۔

قدوسؒ نے جوش میں اُسے سامنے سے ہٹا کر کہا ''ہٹ جا ہمارے راستے سے ...... ہم خدا کے شہر جارہے ہیں......''۔ ''اچھا!'' وہ شخص آپ کی بات سن کر مسکرا پڑا اور کہا ''شیخ خدا کے شہر جاتا ہے تو شیخ احمد عبدالحقؒ کی درگاہ سے جا''۔

شیخ عبدالحقؒ چشتی سلسلے کے مشہور بزرگ تھے۔ اُن کی درگاہ ردولی میں ہی تھی۔ جہاں اُن دنوں اُن کا پوتا شیخ محمد سجادہ نشین تھا۔

راہ گیر کی بات نے عبدالقدوسؒ پر اس قدر اثر کیا کہ یک بیک دوبارہ ردولی کی طرف پلٹے اور دیوانہ وار درگاہ کی طرف دوڑنے لگے اور درگاہ کے در پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ شیخ عبدالحقؒ کی خانقاہ میں داخل ہوتے ہی اُن کی حالت میں تغیر سا رونما ہوا۔ طبیعت میں رچی بے قراری کسی حد تک زائل ہونے لگی۔ چنانچہ اب آپؒ کا بیشتر وقت درگاہ میں ہی گزرنے لگا۔ شیخ عبدالحقؒ کی روح سے فیض حاصل کرنے لگے جس نے آپؒ کے وجود میں پھیلی بے چینی و بے قراری ختم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ اب زیادہ تر درگاہ میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے۔ کبھی دل کی تپش بڑھنے لگتی تو ویرانوں میں نکل جاتے۔ آبادیوں سے دُور سنسان وادیوں میں جاتے اور عبادت کرتے۔ مختلف بزرگان دین کے مقبروں پر حاضری دیتے اور جب بے خودی طاری ہوتی اور تہجد کا وقت قریب آجاتا تو شیخ عبدالحق ''حق ہو......حق حق حق'' کی صدا بلند کرتے تو غفلت سے بیدار ہوتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

شیخ عبدالحقؒ کی درگاہ کے سجادہ نشین شیخ محمد جوان تھے اور قدوسؒ کے ہم عمر بھی۔ سو شیخ عبدالقدوسؒ کو آپ سے محبت تو تھی لیکن وہ عقیدت نہ تھی جو کسی مرید کو مرشد سے ہوتی ہے کیونکہ شیخ قدوسؒ فیض یاب تو براہ راست شیخ عبدالحقؒ سے ہی ہو رہے تھے۔ اس لیے اب بیعت کے معاملے میں تامل سے کام لے رہے تھے۔ وہ شیخ محمد کے ہاتھوں جب بھی بیعت کا سوچتے دل مطمئن نہ ہوتا۔ پھر مصیبت یہ تھی کہ جب دل میں کسی اور کے ہاتھ بیعت کرنے کا خیال جڑ پکڑتا اور وہ درگاہ سے نکلنے لگتے تو شیخ عبدالحق راہ روک کر پوچھتے ''قدوس...... تو کدھر چلا...... تو ہمارا ہے...... ہمیں چھوڑ کر کہاں جاتا ہے''۔

جب بار بار یہ صورتحال پیدا ہوئی تو ایک دن حضرت قدوسؒ جھنجھلا کر تڑپ کر بولے ''حضرت اگر میں کسی اور کے ہاتھوں بیعت کروں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مجھے آپ سے چھین لے گا۔ میں آپ کا ہوں آپ کا رہوں گا''۔

آپ کی بات سن کر شیخ عبدالحقؒ نے جواب دیا

"قدوس...... دوسروں سے بیعت لے گا کیا ہم مُردہ ہیں؟" یہ کہتے ہی انہوں نے خود کو قدوس کے سامنے ظاہر کردیا۔ حضرت قدوسؒ یہ دیکھ کر لرز گئے "لیکن شیخ عبدالحقؒ اُن کی حالت سے بے نیاز اُن کا ہاتھ تھام کر اپنے پوتے شیخ محمد کے پاس لے گئے اور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب کی مرتبہ آپؒ نے بھی عاجزانہ انداز میں شیخ محمد کا ہاتھ تھام کر اُسے بوسہ دیا اور انکساری اندازی میں کہا" شیخ! مجھے تھام لیجئے"۔

حضرت شیخ محمد نے مرشد ہونے کے باوجود آپ سے مریدوں والا برتاؤ نہ کیا۔ بلکہ عزت و احترام سے پیش آتے اور ہم رتبہ رفیق کی طرح آپ کے ساتھ مل کر عبادت و ریاضت کرتے۔ شیخ قدوسؒ نے بھی اپنے مریدی کے اس ابتدائی دور میں سخت مجاہدے کیے۔ نفس کو مار پیٹ کی، طلب کو دھتکارا شیخ عبدالحقؒ کے مزار پر خود جھاڑو دیتے۔ پانی بھر کر لاتے اور جھاڑ پونچ کرتے۔ قلبی حدت کو دُور کرنے کے لیے راتوں کو ریاضتوں میں بسر کرتے اور دن رات عبادت میں مشغول رہتے۔

ایک دن جب حضرت عبدالقدوسؒ اور حضرت شیخ محمد درگاہ میں بیٹھے وظائف میں مصروف تھے۔ درگاہ زائرین سے بھری تھی۔ ہر سو مقدس سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا اور وظائف کا غلغلہ ہر آواز میں حاوی تھا۔

ناگاہ شیخ عبدالحقؒ کا روضہ شق ہوا اور آپؒ ظاہری حالت میں مزار سے باہر نکلے۔ لوگ اس منظر کی تاب نہ لاسکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے شیخ قدوسؒ اور شیخ محمد تعظیم سے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عبدالحقؒ آگے بڑھ کر قدوسؒ کے پاس آن کھڑے ہوئے اور یہ شعر پڑھا۔

مرا زندہ پندار چوں خویشتن
من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

یہ سن کر شیخ عبدالقدوسؒ کی حالت غیر ہو گئی اور لرزہ اندام ہو کے آپؒ کے قدموں میں گر گئے۔ شیخ عبدالحقؒ نے نرمی اور شفقت سے آپؒ کو اٹھایا اور کہا "قدوس...... آج سے ہم نے تجھے اللہ تک پہنچایا"۔

اس واقعہ کے بعد نہ صرف رودلی بلکہ آس پاس کی تمام آبادیوں میں حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کا شہرہ عام ہو گیا۔ لوگ حیرت اور تجسس کے مارے آپؒ کو دیکھنے آتے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ حضرت شیخ الحقؒ کے مزار پر ایک درویش رہتا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک گدڑی لٹکی رہتی ہے جو پیوندوں سے تیار کی گئی ہے۔ وہ درویش پیوند لگانے کے لیے گلی کوچوں میں گھومتا ہے۔ دھجیاں اکٹھی کر کے انہیں پاک کرتا ہے اور پھر انہی دھجیوں کو ٹوپی اور گدڑی میں ٹانک دیتا ہے۔

شیخ عبدالقدوسؒ خدا کی عبادت میں مسلسل مصروف رہتے لیکن اس کے باوجود وقت نکال کر عبادت کے ساتھ ساتھ اساتذہ و شیوخ کی خدمت بھی انتہائی عقیدت احترام سے کرتے۔ دن کا اکثر وقت پانی لانے، لکڑیاں کاٹنے، جھاڑو دینے اور کپڑے دھونے میں گزر جاتا۔ چٹائی کے لیے گارا بناتے تو اس حد تک اپنے کام میں محو ہو جاتے کہ کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ ایسے میں اساتذہ اپنے اس سعادت مند شاگرد کو خود اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا دیتے۔

حضرت شیخ محمدؒ کی بڑی بہن ایک عابدہ اور صالح خاتون تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی سے ایک ایسے شخص سے بیاہی گئی جو ہرگز آپ کے قابل نہ تھا۔ جتنی آپ نیک، پاکباز اور عبادت گزار تھیں۔ اتنا ہی وہ شخص کمینہ خصلت اور بداعمال تھا۔ چنانچہ اُن کی زندگی جہنم کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ حضرت شیخ محمد اور ان کی والدہ اُم کلثوم بیٹی کی حالت دیکھتیں اور اُس کی ازدواجی زندگی کی اس ناموافقت پر دُکھ سے

کڑھتی رہتیں۔ اس تلخ تجربے کے بعد عہد کر چکی تھیں کہ چھوٹی بیٹی کو بیاہیں گی تو کسی نیک اعمال شخص کے ساتھ اور وہ بھی اُس شخص کے ساتھ جس کے متعلق شیخ عبدالحقؒ کی تائید ہو۔

انہی دنوں اُن کے گھر کی ایک کنیز حضرت عبدالقدوسؒ سے حضرت شیخ محمدؒ کے دھلے کپڑے لینے گئی تو حضرت قدوسؒ کو دیکھ کر شرارت بھرے لہجے میں بولی ''حضرت...... اب تو آپ جیسے جوان شادی کرکے باپ بنے پھرتے ہیں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ ساری عمر ایسے ہی گزار دیں گے یا کچھ کریں گے؟''

حضرت عبدالقدوسؒ کنیز کی بات سن کر مسکرا پڑے اور بولے ''بی بی! تم تو اچھی طرح مجھے جانتی ہو بھلا مجھ جیسے شب و روز گزارنے والے درویش کو اپنی بیٹی کون دیگا اور پھر میں خود اپنی اس آزاد زندگی کو کیوں کھودوں، اہل و عیال کے جھنجھٹ میں پڑ کر کیوں غلامی کی زنجیریں پہن لوں۔ بی بی! تم اپنا مشورہ اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے اپنی آزادی کی اس لذت سے محروم کرنے کا منصوبہ نہ بناؤ۔ میں تو عمر بھر مجرد رہنا چاہتا ہوں۔ اب تک ویرانوں اور جنگلوں میں زندگی گزاری ہے جو باقی بچی ہے خدا کی رضا سے وہ بھی گزر جائے گی اور ایک دن گمنامی کے کسی گوشے میں گم ہو جاؤں گا''۔

لیکن کنیز بھلا کہاں چھوڑنے والی تھی۔ مفت مشورے دینا اُس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ سو جاتے جاتے کہہ گئی ''حضرت، میں تو کہتی ہوں کہ آپ اپنے پیر شیخ محمد کی چھوٹی بہن سے عقد کرلیں۔ ماشاء اللہ شادی کے قابل ہے۔ آپ کی اور اُس کی جوڑی بھی اچھی رہے گی''۔

یہ بات شیخ عبدالقدوسؒ کے دل کو لگی اور اُن کے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہوگئی۔ انہی دنوں وہ اپنے ایک مربی کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ بات آپؒ نے اُن کے سامنے کہی تو وہ بھی خوش ہوگئے اور کہنے لگے ''حضرت...... اگر اجازت ہو تو میں آج ہی آپ کی طرف سے شادی کا پیغام لے کر حضرت شیخ محمدؒ کے گھر جاتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ مجھے ان کے در سے ناکام نہیں لوٹائے گا''۔

حضرت عبدالقدوسؒ نے ہنس کر انہیں اپنی رضامندی کا اشارہ دے دیا۔

اس واقعہ سے چند دن قبل ایک رات اُم کلثوم نے رات خواب میں دیکھا کہ اُن کے بیٹے شیخ محمدؒ کا مرید حضرت قدوسؒ وجد کی حالت میں سماع میں ہے اور اُن کا ایک پاؤں بھی ٹوٹا ہوا ہے اور ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہی تھیں کہ شیخ عبدالحقؒ خواب میں ہی نمودار ہوئے اور کہا ''بہو! اس بچے کو اپنے سائے میں لے لو، یہ معصوم اور شریف اللہ کا اور میرا پیارا ہے اس کی پرورش دل و جان سے کرنا''۔

اگلی صبح اُم کلثوم بیدار ہوئیں تو انہیں رات کا خواب اچھی طرح ازبر تھا۔ مسرت سے اُن کا چہرہ کھلا جاتا تھا۔ کافی دنوں سے وہ چھوٹی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں پریشان تھیں۔ بڑی صاحبزادی کا انجام دیکھ چکی تھیں اس لیے دودھ کا جلا ہونے کے سبب چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتی تھیں۔ سو جب شیخ عبدالحقؒ نے انہیں چھوٹی پوتی کے لیے بر کا عندیہ دیا تو خوش ہوگئیں۔ عبدالقدوسؒ کے پاؤں کا ٹوٹنا اس بات کی علامت تھا کہ آپ درویش کامل ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیاز۔ صرف اللہ کے آگے دست سوال پھیلانے والے پرہیزگار متقی جن کا کام صرف اور صرف عبادت کرنا اور خدائے برحق و واحد کی حمد وثناء میں زندگی بسر کرنا ہے اور عبدالحق کا یہ کہنا کہ

''بھو اسے اپنے سائے میں لے کر اچھی طرح پرورش کرنا'' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ انہیں داماد بنالیں۔

جس دن سے اُم کلثوم نے یہ خواب دیکھا تھا تب سے بے چین تھیں کہ آخر حضرت عبدالقدوسؒ سے بات کیسے کی جائے پھر ایک دن رب عظیم نے اُن کی یہ مشکل حل کرادی اور حضرت قدوسؒ کے مربی آپ کی طرف سے بیاہ کا پیام لے کر حضرت شیخ محمدؒ کے پاس آئے جو والدہ سے تمام واقعہ سن چکے تھے سو جھٹ پیغام منظور کرلیا گیا۔

شادی کی تاریخ طے کردی گئی جو آہستہ آہستہ کرکے نزدیک آگئی۔ شہر میں مشہور ہوگیا کہ آج ایک دیوانے درویش کا بیاہ ہے۔ شادی والے دن بھی حضرت قدوسؒ نے اپنی مصروفیات نہ بدلیں بلکہ حسب معمول جھاڑو دیتے اور پانی بھرنے میں مصروف رہے۔ رسومات کی ادائیگی کے لیے قریبی رشتے دار آپ کے پاس آئے اور نہلا دھلا کر نیا لباس پہنایا اور پھر بارات کی شکل میں یہ لوگ آپؒ کو حضرت شیخ محمدؒ کے گھر لے گئے۔ شہر کے لوگ بھی علاقے کے مشہور درویش کی شادی کی خبر سن کر جوق در جوق شیخ محمدؒ کے گھر پہنچنا شروع ہوگئے۔ نکاح پڑھایا گیا جلوے کا وقت آیا تو شادی میں آئی لڑکیوں نے ہندی میں یہ گیت چھیڑ دیا

کہو کہ کھول دینا شہ دیکھا لو ری
اس گھونگھٹ ری کارن شہ ہاتھ مروری

گیت سننا تھا کہ حضرت عبدالقدوسؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی کچھ دیر کے لیے وہ بھول گئے کہ آج وہ کس روپ میں کس جگہ بیٹھے ہیں سو اسی بے خودی میں کھڑے ہوگئے اور وجد میں آکر بیش قیمت نیا جوڑا پھاڑ ڈالا اور دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔

آپؒ کی یہ حالت دیکھ کر شادی میں آئی عورتیں تاسفانہ انداز میں اُم کلثوم سے بولیں'' بہن...... تجھے چھوٹی بیٹی کے لیے اور کوئی بر نہ ملا تھا جو اس دیوانے درویش کے ساتھ اُس کی قسمت پھوڑ ڈالی۔ ابھی تو بڑی بیٹی کا گھر بھی آباد نہ ہوسکا اور چھوٹی کو بھی اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا''۔ اُم کلثوم نے سب کچھ خندہ پیشانی سے سنا اور اطمینان سے لبوں پر تبسم سجائے بولیں ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس کام میں اُسی کی رضا تھی سو ہوگیا''۔

حضرت عبدالقدوسؒ نے شادی تو کرلی مگر اپنے اندر تبدیلی نہ لاسکے۔ اب بھی وہی حال تھا اکیلے تھے تو کھانے پینے کا کبھی خیال نہ کیا بیوی پائی تب بھی یہی روش رکھی۔ فقر و فاقے میں دن گزارتے۔ بیوی صابر تھی دو دو چار چار دن فاقوں میں گزار دیتی مگر اُف نہ کرتی۔ حضرت قدوسؒ زراعت کرتے تھے مگر جو پیداوار ہوتی وہ سب غریبوں میں بانٹ دیتے۔ آباؤ اجداد کی طرف سے اچھی خاصی جائیداد مل سکتی تھی مگر کبھی اس طرف دھیان نہ دیا۔ مصائب جھیلتے، تکالیف اُٹھاتے اور خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔ اللہ کے سوا ہر کسی سے ترک تعلق اختیار کررکھا تھا۔ رشتہ دار تھے۔ آپس میں میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے چونکہ آپؒ نے کبھی اُن سے تعلق نہ رکھا تھا سو انہوں نے بھی آپؒ کو بھلا دیا۔ شادیاں ہوتیں یا کوئی اور تقریبات، تب ایسے موقعوں پر رشتہ دار ایک دوسرے کے گھر خوان بھیجتے اور آخر میں یاد آتا کہ شیخ قدوسؒ کا گھر تو رہ ہی گیا۔ مگر یہ خیال تبھی آتا جب کچھ بھی باقی نہ بچا ہوتا لیکن شیخ عبدالقدوسؒ بے نیازی و بے گانگی سے زندگی بسر کرتے رہے صرف اللہ سے لو لگائے رہے۔

سکندر لودھی کا زمانہ تھا۔ 897 ہجری کا دور شیخ حسام الدین ایک بزرگ کامل گزرے ہیں۔ ایک دن سکندر نے آپ سے کہا ”حضرت آپ کی خدمات دیکھتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کچھ نہ کچھ اس کا صلہ دیا جائے اور اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ کو کس چیز کی آرزو ہے“۔

شیخ حسام الدین نے فرمایا ”میرے ذمے احتساب کا شعبہ دے دیں اور ساتھ کام کرنے کے لیے مختصر سی جماعت تاکہ میں دین میں منکرات وبدعات پھیلانے والوں کا قلع قمع کرسکوں“ چنانچہ سکندر لودھی نے ان کی خواہش کے مطابق جو انہوں نے مانگا تھا، وہ دے دیا۔ شیخ حسام الدین دربار سے رخصت ہوکر گجرات، دکن، مالوے کے دورے پر گئے۔ وہاں کے معاشرے کا جائزہ لیا اور اسلام میں جو بدعات پھیل چکی تھیں ان کو ختم کیا اور تمام علماء وشرفا سے اقرار کروایا کہ آئندہ وہ اسلام میں کسی بدعت کو پروان نہ چڑھنے دیں گے اور نہ خود اس میں اضافہ کریں گے۔

اس کامیاب اور تفصیلی دورے کے بعد جب دلی دربار میں اس کی رپورٹ دی تو بادشاہ بھی آپ کی کارکردگی جان کر خوش ہوا اور کہا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔

دلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد حضرت حسام الدین اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر ملتان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ وہاں آپ نے بے انتہا کام کیا اور دین میں داخل بدعات کا خاتمہ کرنے کے لیے دن رات کوشاں رہے۔ یہاں تک کہ کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے پانی پت جانے کا ارادہ کیا۔ پانی پت پہنچ کر آپ کو حضرت عبدالقدوسؒ کے بارے میں جان کاری حاصل ہوئی تو ساتھیوں سے کہا ”بھائیو..... پہلے ہمیں گنگوہ چل کر حضرت عبدالقدوسؒ کو تائب کرنا چاہیے وہ خود کو قطب الاقطاب کہلواتے ہیں اور بعض غیر شرعی امور کے پابند ہیں۔ زندگی وجد وحال میں بسر کررہے ہیں لہٰذا انہیں سیدھا راستہ دکھا کر ہی آگے بڑھیں“۔

چنانچہ قافلے کا اگلا پڑاؤ گنگوہ تھا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے حضرت عبدالقدوسؒ کو پیغام بھجوایا کہ وہ شریعت حضور اکرمﷺ کی تائید کریں اور سرور و وجد و حال کی حالتوں سے دُور رہیں۔ آپؒ نے جو حسام الدین کا یہ پیغام پایا تو خندہ پیشانی سے جواب بھجوایا۔ ”حضرت ہمیں اقرار ہے کہ ہم غیر شرعی کاموں میں ملوث ہوگئے ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی سے روگردانی کسی طور پر مناسب نہیں سو ہم اللہ کے حضور توبہ استغفار کرتے ہیں اور آئندہ بچنے کی دعا مانگتے ہیں“ چنانچہ اس کے بعد آپؒ نے واقعی چند دن سماع کے بغیر گزارے۔ لوگ جو آپؒ کو اچھی طرح جانتے تھے کہ سماع کے بغیر تو آپؒ کا گزارہ نہیں۔ اب اس حال میں آپؒ کو دیکھتے تو حیرت کا اظہار کرتے۔ ساتھ ہی دبی دبی آواز میں یہ بھی کہہ جاتے کہ حضرت سکندر لودھی کے محتسب اعلیٰ سے خائف ہوچکے ہیں۔ اگرچہ اس نوعیت کی باتیں حضرت عبدالقدوسؒ کے کانوں میں بھی پڑی تھیں مگر انہوں نے اس پر مطلق توجہ نہ دی۔

ابھی آپ کو سماع سے دُور ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات جب تہجد کی نظر اُٹھے تو آپؒ کے کانوں میں ایک عورت کے دوہا گانے کی آواز آئی۔ شیخ قدوس نے جو دوہے کے درد بھرے بول سنے تو وجد میں آگئے اور دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ ضبط کا یارا نہ رہا۔ وجد کی کیفیت میں رقص کرتے جاتے اور دیوانہ وار نعرے لگاتے جاتے۔ پھر جب ذرا اعتدال میں

آئے تو حضرت حسام الدین کو کہلوا بھیجا۔
''حضرت...... میں تو آتش زدہ لکڑی کی مانند ہو چکا ہوں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آتش زدہ لکڑی کی آتش سے جنگل میں نہ تو خشک لکڑی بچ سکتی ہے اور نہ ہی تر۔ جو چیز گرفت میں آئے اسی کو جلا ڈالتی ہے تو مولانا اگر آپ میری یہ کیفیت دُور کر سکتے ہیں تو بے شک آئیں میں آپ کا احسان مند رہوں گا''۔

یہ پیغام پا کر حضرت حسام الدین نے اپنے ایک بندے کو بھیج کر معلوم کروایا کہ جا کر دیکھو شیخ قدوسؒ اس وقت کس حالت میں ہیں۔ وہ بندہ گیا اور آپ کو دیکھ کر آنے کے بعد حضرت حسام سے بولا ''حضرت وہ تو وجد کی کیفیت میں بے خود ہوئے دیوانہ وار رقص کر رہے ہیں''۔ حضرت حسام نے اُسی سمے چند بزرگان کو اکٹھا کیا اور ایک ہاتھ میں دڑالے کر آپؒ کی خانقاہ کی طرف چل کھڑے ہوئے لیکن جونہی آپؒ کو وجد کی حالت میں ایسے جلالی انداز میں دیکھا تو دفعتاً آپ میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور پھر اچانک شیخ حسام الدین کی حالت میں ایک تغیر رونما ہوا۔ کہاں وہ حضرت عبدالقدوسؒ کو سیدھا راستہ دکھانے دُرّے سمیت آئے تھے اور کہاں یہ حالت کہ خود بھی بے تابی سے دستار اُتار پھینکنے کے بعد ایک بلند آواز نعرہ لگا کر پروانے کی مانند شیخ عبدالقدوسؒ کے گرد گھومنے لگے۔

لوگوں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا جب حسام الدین صحیح حالت میں آئے تو لوگوں نے پوچھا ''حضرت...... یہ کیا ہو گیا تھا آپ کو؟ آپ کس مقصد کی خاطر آئے تھے اور کیا کر کے جا رہے ہیں تو حسام الدین تھکے تھکے سے انداز میں بولے ''ہم...... ہم غلطی پر تھے، ہم تاریکی میں تھے آج ہمیں اُجالا نصیب ہوا ہے۔ اب تک ہم اندھیرے میں بھٹک رہے تھے''۔ شیخ قدوسؒ جو سنبھل چکے تھے اور آپ کے نزدیک ہی ٹھہرے تھے نرمی سے آپ کی بات سن کر بولے ''حسام الدین...... روشنی تو ابھی بہت دُور ہے لیکن اطمینان رکھ ایک روز وہ تمہارا مقدر بنے گی'' یہ کہا اور سب کو حیرت زدہ چھوڑ کر اپنی عبادت گاہ میں داخل ہو گئے۔

ایک رات جو شیخ قدوسؒ سے ایک خلیفہ نے کشف دیکھا تو حیران رہ گیا اتنی رات گئے آپ مطالعہ میں مصروف تھے۔ حجرے میں چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی میں آپؒ اُسے کتاب کھولے بیٹھے نظر آئے۔ اگلی صبح خلیفہ آپؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا ''حضرت رات آپ نے بڑی مشقت اٹھائی کہ رات بھر چراغ جلائے پڑھتے رہے''۔

یہ سن کر حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور آپؒ نے خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا ''نہیں...... میں کہاں رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ ارے بھئی ہم تو رات بھر آرام سے سوتے رہے''۔ خلیفہ نے یہ سن کر حیرت سے آپ کو دیکھا اور تذبذب میں پڑ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا رات خود اُس نے اپنی آنکھوں سے شیخ قدوسؒ کو حجرے میں چراغ جلائے پڑھتے دیکھا تھا۔ آپؒ نے جب خلیفہ کو یہ متذبذب دیکھا تو متبسم ہو کے کہا ''خلیفہ یہ بات اچھی طرح جان لے کہ اولیاء جو دنیا کے سامنے نیند میں ہوتے ہیں بظاہر ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کی نیند بھی عبادت میں شمار ہوتی ہے''۔ پھر کچھ دیر توقف کے بعد کہنے لگے ''اگرچہ یہ حکم انبیاء کرام کے لیے ہے مگر انبیاء کے اتباع کی وجہ سے اولیاء بھی اس سے فیض یاب ہو جاتے ہیں لیکن اولیاء نیند کے بعد اُٹھ کر وضو کی تجدید ضرور کرتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء کے لیے مخصوص حکم میں

خود کو پورے کا پورا شریک نہیں کرتے“۔

پانی پت کا ایک شخص برسات کے موسم میں حضرت بو علی قلندر کے مزار پر حاضر دینے گیا تو روضے میں داخل ہوتے ہی حیرت سے وہیں رُک گیا۔ روضے میں اس نے دیکھا کہ قلندر کا سر مبارک تو روضہ میں ہی ہے لیکن انہوں نے اپنا ایک پاؤں باہر نکال کر ایک بزرگ کے زانو پر رکھا ہوا ہے۔ وہ بزرگ اُن کی پائنتی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ چہرے سے جلال ٹپکتا تھا اور جس کی پیشانی سے نور ٹپک رہا تھا۔ چنانچہ وہ شخص حیرت سے وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اچانک اُن بزرگ کی جونظر اُس شخص پر پڑی تو وہ آہستہ سے اٹھے اور اُس شخص کا ہاتھ تھام کر اُسے قلندر کے پاس لائے اور اُس کا سر جھکا کر قلندر کے قدموں میں ڈالا پھر اچانک قلندر اور بزرگ دونوں اُس شخص کی نظروں سے اوجھل ہوگئے اور وہ حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔ بزرگ کی شکل اُس کے دل و دماغ میں چسپاں ہوکر رہ گئی۔ بہت دیر دماغ پر زور ڈالتا رہا کہ آخر قلندر کے ساتھ بزرگ کون تھے؟ لیکن وہ جان نہ پایا ہاں البتہ بزرگ کی صورت اُس کے دل پر نقش ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کے سات سال بعد جب وہ کرنال کسی کام سے گیا، تو انہی بزرگ کامل کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ تھے جسے اُس نے بوعلی قلندرؒ کے مزار پر دیکھا تھا سو حیرت و اشتباہ سے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ لوگوں نے اُسے جواب دیا یہ بزرگ کامل حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ ہیں۔

سکندر لودھی کا دور حکومت تھا۔ سن 897 ہجری کا وقت لودھی دربار کا ایک امیر بادشاہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار چھوڑ کے چلا آیا۔ حالات کی گردش میں ایسا آیا کہ جون پور گیا مگر وہاں کسی قسم کی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو بدقسمت سوچوں میں گم ہوگیا کہ اب کہاں جائے؟ کہاں جا کر اپنی قسمت آزمائے؟ کس بادشاہ شہزادے کا در دیکھے؟ انہی سوچوں میں تھا کہ اچانک اُس کے دل میں آیا کہ آج تک بادشاہوں اور شہزادوں کے پاس جاتا رہا ہوں لیکن فیض کسی سے حاصل نہیں ہوا۔ اب کی مرتبہ کیوں نہ کسی بزرگ اور درویش کے حضور حاضری دوں۔ شاید اللہ کے اُن نیک بندوں کے طفیل میرے حالات پلٹا کھا جائیں اور نصیب میں لکھی یہ غم و پریشانی دُور ہو جائے۔ سو یہ ارادہ کرکے چل کھڑا ہوا اور گھومتا پھرتا۔ رودلی آن پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے لوگوں سے دریافت کیا ”بھائیو...... حالات کا ستایا ایک بدنصیب انسان ہوں، روٹھی قسمت کو منانے خدا کے نیک بندوں کی دعاؤں کا خواہش مند ہوں، کیا رودلی میں کوئی نیک بزرگ حق ہیں جن کے سامنے رو رو کر اپنا حال سناؤں اور اُن سے سفارش کراؤں کہ اللہ مجھے وقت کے اس گرداب سے نکال کر سکون بخشے“۔

لوگوں نے اس پریشان حال شخص کو دیکھا، تکالیف اور مصائب جس کے چہرے سے صاف پڑھے جاتے تھے۔ سو انہوں نے اُس سے ہمدردی کا برتاؤ کیا اور اُسے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ سے ملنے کی نصیحت کی۔

عمر خان یہ سنتے ہی حضرت عبدالقدوسؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی بزرگی، تقدس اور تقویٰ سے بہت متاثر ہوا۔ دل سے کہا عمر یہی وہ بزرگ ہیں جن کی طفیل تمہارے حالات بدلتے دیر نہ لگے گی۔ سو اُسی وقت آپؒ کے قدموں گر گیا اور رو رو کر ہچکیوں کے درمیان فریاد کرنے لگا۔ ”حضرت میری مدد کیجئے، میں تارک الدنیا ہوں، نہ گھر بار رہا نہ ٹھکانہ، آپ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں۔ اپنے دامن

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش
حج عمرہ اور زیارات نمبر
قیمت 175 روپے
شائع ہو گیا ہے
نقشہ ارض القرآن مع اہم قرآنی مقامات کی نشان دہی
مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا روڈ میپ
حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں
اہم تاریخی مقامات کا نام، وجہ تسمیہ، محل وقوع، تصاویر اور اُن سے متعلق تاریخی واقعات کا بیان' نیز متعلقہ آیات اور احادیث کے حوالہ جات
تحریروں، تصویروں اور جدید نقشوں سے مزین یہ کتاب ہی نہیں حج اور عمرہ پر جانے والوں کے لئے ایک مکمل گائیڈ ہے۔
سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور فون 042-37245412

میں جگہ دے کر اس غریب کو مصائب کے سائے سے دُور کریں"۔

شیخ عبدالقدوسؒ اُس بدنصیب کی حالت پر بہت متاثر نظر آرہے تھے۔ ہمدردی سے سرشار ہوکر بولے "نادان اُٹھ...... بے صبرا کیوں ہوا جارہا ہے، جب اللہ کی اس زمین پر میرے لیے جگہ ہے تو تمہارے لیے کیوں نہ ہوگی۔ ہر بشر اللہ کے نزدیک برابر ہے۔ جا۔ بے فکر ہوکر جا تیرا کشکول کبھی خالی نہ ہوگا۔ جا خدا کی عبادت کر اور اُسی سے مدد مانگ۔ ہم کون ہوتے ہیں نادان تجھے غموں و مصائب سے بچانے والے۔ ہر فعل پر صرف خدا واحد ہی کا اختیار ہے، جس کی مرضی کے بغیر پتا تک نہیں ہل سکتا"۔

آپ کی باتیں سن کر عمر خان کو تسلی ہوئی۔ دل نے کہا عمر خان اب تیری بدنصیبی کے دن ٹل گئے اور ابھی اُسے اس خوش اُمیدی میں دو چار روز ہی گزرے تھے کہ سکندر لودھی کی طرف سے تحفے و تحائف کے انبار کے ساتھ اُسے دربار طلب کیا گیا اور عزت و احترام کے قول و قرار کا وعدہ کیا گیا۔ عمر خان یہ جان کر خوشی سے بے قابو ہوگیا اور عقیدت سے پرنم آنکھیں لیے آپؒ کے پاس آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا "حضرت آج آپ کے طفیل مجھے یہ عزت و مرتبہ دوبارہ حاصل ہوا ہے۔ میں آپؒ سے جدا نہیں ہونا چاہتا آپ میرے ساتھ شاہ آباد (ضلع کرنال) چلیں اور وہاں قیام فرما کر بندگان خدا کو فیض پہنچائیں"۔

آپؒ نے اُس کی بات مان لی اور شاہ آباد جاکر علم و عرفان کی شمع کی روشنی سے شاہ آباد کو منور کیا۔ رشد و ہدایت کے چشمے جاری کیے۔ طالبین دُور دُور سے پروانوں کی مانند آنے لگے اور آپ کے اردگرد جمع رہتے۔

ایک طویل عرصہ شاہ آباد میں قیام کیے آپ کو گزر چکا تھا۔ علم وہدایت کی جو شمع آپ نے روشن کی تھی اُس سے ہزار ہا لوگوں نے اپنے باطن میں ڈھلی تاریکی کو منور کیا۔ ایک دن آپؒ کی اہلیہ نے کشف میں دیکھا کہ خراسان سے ایک آگ اٹھی ہے جو ہر چیز کو جلاتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے اور پھر آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ جس قدر جلد ہو سکے اپنے بچاؤ کا انتظام کرلو کوئی مصیبت نازل ہوا ہی چاہتی ہے۔

اور پھر جلد ہی تیموری سلسلے کے بابر بادشاہ نے ہندوستان پر ایسی یلغار کی کہ سامنے آئی ہر چیز کو خاک کی طرح اُڑاتا ہندوستان کا مختار کل بن گیا۔ ان حالات میں جب ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ بستیاں تباہی و بربادی سے دوچار تھیں آپ شاہ آباد چھوڑ کر گنگوہ آکر رہنے لگے۔

شیخ عبدالقدوسؒ فارسی اور ہندی کے شاعر کی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ نثر میں بھی کئی کتب تحریر کیں۔

شیخ قدوسؒ ایک صائم الاہر عابد تھے۔ عبادتوں میں آپ کو نماز، ذکر الٰہی اور قرآن کی تلاوت سے گہرا شغف تھا۔ شدید سردی اور برف باری میں پاؤں اور پنڈلیاں پھٹ جاتیں پھر بھی نماز پڑھتے رہتے۔ چار سو رکعتیں دن کو اور اتنی ہی رات کو ادا کرتے لیکن خشوع وخضوع کا یہ عالم تھا کہ موسم کی شدت سے بے نیاز عبادت الٰہی میں تندہی سے معروف رہتے۔

آپؒ نے چواسی سال کی طویل عمر پائی اور 23 جمادی الآخر 944 ہجری کو اس دنیا سے پردہ اختیار کرلیا۔ آپؒ کا مزار گنگوہ ضلع سہارن پور میں آج بھی لوگوں کے نزدیک ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔ چار سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود تاریخ میں آپؒ کی یہ آواز آج تک محفوظ ہے۔

شریعت لا معبود الا اللہ، طریقت لا مقصود الا اللہ۔ اور حقیقت لا موجود الا اللہ۔

بہلاوا......!

ایس۔امتیاز احمد

صاف دل لوگ صاف گو بھی ہوتے ہیں
ازدواجی زندگی میں صاف گوئی تعلقات میں استواری پیدا کرتی ہے
لیکن ہر معاملے میں صاف گوئی نقصان بھی پہنچا سکتی ہے
ایک نیک دل شخص کی روداد جس کا انتقام قدرت نے لیا......!!

(مغرب سے کشید)
''دی ٹیوٹر''
تحریر: مائیکل براؤن

ویلس ایک حقیقت پسند اور صاف گو شوہر تھا۔ وہ ازدواجی معاملات میں شکوک وشبہات کا قائل نہیں تھا۔ نہ خود کوئی بات چھپاتا تھا اور نہ ہی اپنی بیوی لورنا سے ایسی توقع رکھتا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ بدظنی سے فتنہ جنم لیتا ہے۔ اسی لیے جب اس نے لورنا کے رویے میں بے اعتنائی محسوس کی تو وضاحت طلبی میں کوئی دیر نہیں لگائی۔

''لورنا'' اس نے نرمی سے کہا'' کچھ دنوں سے تم کچھ بدلی بدلی نظر آرہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''۔

''بدلی بدلی سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' لورنا بولی۔ ''میں تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں کر رہی''۔

''ممکن ہے یہ میرا وہم ہو'' ویلس نے آہستہ سے کہا'' بس ایک خیال ذہن میں آیا تھا، اس کا اظہار

کردیا،تم کچھ خیال نہ کرنا''۔

لورنا نے دلنواز مسکراہٹ سے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''آج کل تم نے کچھ زیادہ ہی سوچنا شروع کردیا ہے۔ یہ بات تمہاری صحت کے لیے مفید نہیں ہے''۔

ویلس نے لورنا کے لہجے میں دبا ہوا طنز محسوس کرلیا تھااس لیے اس نے مزید بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی عمر لورنا سے اٹھارہ سال زیادہ تھی اور اسے عمر کے اس تفاوت کا بخوبی احساس تھا۔ لورنا ہنوز جوان اور پُرکشش تھی اور با آسانی نئی دنیا آباد کرسکتی تھی۔

پارکنگ کی دشواری کے پیش نظر ویلس عام طور پر بس کے ذریعے دفتر جاتا تھا۔ ایک روز ناسازی طبع کے باعث وہ دفتر سے جلدی اُٹھ گیا۔ راستے میں ایک موڑ کے قریب جب اس نے لورنا کو کار میں بس کے نزدیک سے گزرتے دیکھاتو اسے سخت تعجب ہوا۔ اس تعجب کاایک پہلو تویہ تھا کہ لورنا کو ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ کم ازکم ویلس کے علم کے مطابق ایسا ہی تھااور دوسرا حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ لورنا کے پہلو میں ایک خوبرو نوجوان بیٹھا ہواتھ جو بڑے انہماک سے اس کے ساتھ باتیں کررہا تھا۔ کار چندلمحوں تک بس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھی یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس پرویلس کی نظر پڑگئی۔ عجلت میں وہ کار کی نمبر پلیٹ نہیں دیکھ سکالیکن رنگ اور ماڈل وہی تھا جواس کی کار کا تھا۔ لورنا کا چہرہ گواس نے صرف ایک رُخ سے دیکھا تھا تاہم اسے یقین تھا کہ اس نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لباس کارنگ اورسٹائل اس کا جانا پہچانا تھا۔

ویلس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ان کی شادی کو تین سال ہوچکے تھے۔ اس دوران میں اس نے لورنا کو ڈرائیونگ سکھانے کی ہرممکن کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ سٹیرنگ وھیل پر ہاتھ رکھتے ہی لورنا پر گویا سکتہ طاری ہوجاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لاشعور پر کوئی نامعلوم خوف مسلط ہو۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ لورنا ڈرائیونگ سیکھ لے اوردوسری بیویوں کی طرح اسے دفتر چھوڑ آئے اور شام کو واپس لے آئے۔ یا تو لورنا شروع ہی سے ڈرائیونگ جانتی تھی یا اس نے حال ہی میں ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ ہر دوصورتوں میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس نے یہ بات چھپائی کیوں۔

شادی سے قبل وہ لورنا سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ وہ ایک فرم میں استقبالیہ کلرک تھی۔ ویلس کاروباری سلسلے میں وہاں جایا کرتا تھا۔ چند ملاقاتوں کے بعد دونوں میں دوستی ہوگئی پھر تعلقات دوستی سے آگے بڑھ گئے اور بالآخر وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوگئے لیکن کیا وہ واقعی ایک دوسرے کے ہوگئے؟ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال کا ویلس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لورنا کے اس پُراسرار رویے نے اسے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ مخلص نہیں تھی۔ پہلے اس نے براہ راست جواب طلبی کا ارادہ کیا جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا تھا لیکن اس مرتبہ صورت حال زیادہ سنگین تھی۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ لورنا جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کرتی اور آئندہ کے لیے محتاط ہوجاتی۔

''آج کا دن کیسا گزرا ڈارلنگ؟'' اس نے سرسری طور پر پوچھا۔

''اچھا گزرا!'' لورنا نے جواب دیا'' آج میں باسکومب گئی تھی''۔ ''کوئی خاص کام تھا؟''۔

''کیا تمہیں ہربات بتانی ضروری ہے؟''

ویلس کو اس بات پر حیرت ہوئی لیکن لورنا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ کہنے لگی'' شاید تم بھول گئے کہ ہماری شادی کی سالگرہ قریب آرہی ہے۔ میں شاپنگ کرنے گئی تھی تم نے آج کیا کام کیا؟''

''وہی جو روز کرتا ہوں آج طبیعت خراب تھی اس لیے جلدی اُٹھ گیا''۔

شادی کی سالگرہ سے ایک روز قبل اس نے لورنا

سے کہا کہ وہ اسے کنٹری کلب میں ڈنر کھلانا چاہتا ہے۔ لورنا نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا۔

ٹھیک آٹھ بجے دونوں تیار ہوکر کلب روانہ ہوگئے۔ کنٹری کلب شہر سے باہر ایک تفریحی مقام پر واقع تھا۔ رات تاریک اور سڑک سنسان تھی۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد ویلس نے یکا یک بریک لگادیئے اور اپنی سیٹ پر تقریباً ڈھیر ہوگیا۔ لورنا کی خوشگوار گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

"ویلس!" اس نے گھبراہٹ سے کہا "کیا ہوا تمہیں"۔

"پتا نہیں! دل ڈوب سا رہا ہے"۔

لورنا چند لمحوں تک بے حرکت بیٹھی رہی۔

ویلس نے اٹک اٹک کر کہا "کوئی کار یا ٹیکسی روکو یا کلب سے مدد لانے کی کوشش کرو۔ میں اب کار نہیں چلا سکتا"۔

لورنا نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ آس پاس کوئی کار نظر نہیں آرہی تھی۔ ویلس آرام سے سیٹ پر پڑا ہوا لورنا کے ردعمل کا انتظار کررہا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں کے گوشے سے لورنا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد لورنا کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آگئی۔

"اس ویرانے میں مدد ملنے کا کوئی امکان نہیں" اس نے کہا "مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا"۔ اس نے ویلس کو آہستگی سے دھکیل کر قریبی سیٹ پر گرا دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی "کلب میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور ہوگا۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، بس آرام سے بیٹھے رہو"۔

چند لمحوں کے اندر کار دوبارہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ لورنا بڑی مہارت کے ساتھ ڈرائیونگ کررہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد ویلس اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میری طبیعت ٹھیک ہوگئی ہے" اس نے خمار آلود لہجے میں کہا "پتا نہیں اچانک مجھے کیا ہوگیا تھا!"

"اوہ شکر ہے"۔ لورنا نے کہا "میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ بہرحال تمہیں ڈاکٹر کو ضرور دکھانا چاہیے"۔ "فی الحال ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں!" ویلس بولا "تم نے ڈرائیونگ کب سیکھی؟"۔ "افسوس کہ میرا راز کھل گیا۔ میں شادی کی سالگرہ پر تمہیں چونکا دینا چاہتی تھی"۔

"اس سے زیادہ کیا چونکاؤ گی!" ویلس نے کہا "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ڈرائیونگ سیکھ لوگی۔ یاد ہے میں نے تم پر کتنی محنت کی تھی لیکن تم نے اتنی جلدی ڈرائیونگ کیسے سیکھ لی؟"

"میں نے تمہیں بتائے بغیر ایک ڈرائیونگ سکول میں داخلہ لے لیا تھا گزشتہ ہفتے کورس مکمل ہونے پر مجھے لائسنس بھی مل گیا ہے"۔

"تعجب خیز! لیکن تم تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی خوفزدہ ہوجاتی تھیں"۔

"میرا ڈرائیونگ انسٹرکٹر بہت شاندار آدمی ہے۔ وہ نہایت صبر اور استقلال کے ساتھ ڈرائیونگ سکھاتا ہے تمہاری طرح فوراً آپے سے باہر نہیں ہوجاتا۔ جس کا کام ہوتا ہے وہی اسے بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شوہر سے کبھی ڈرائیونگ نہیں سیکھنی چاہیے"۔

ویلس نے ہولے سے سر ہلایا۔ گویا اس خوبرو نوجوان کے بارے میں بھی وضاحت ہوگئی تھی جسے اس نے کار میں لورنا کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ نوجوان اس کا ڈرائیونگ انسٹرکٹر تھا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی ویلس پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس ضمن میں مزید تحقیقات کرے گا۔

اگلے روز لورنا نے اسے پیلے رنگ کا لفافہ دیا۔ ویلس نے متجسس نظر سے لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے کے اوپر لورنا نے اپنے ہاتھ سے اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ لفافے کے اندر سالگرہ کا کارڈ اور لورنا کا ڈرائیونگ لائسنس تھا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر اسے ندامت سی ہوئی۔ اس نے ہمیشہ بدظنی سے گریز کیا تھا لیکن اس مرتبہ شاید شیطان اس پر غالب آ گیا تھا۔ سی دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ وہ کسی سستے ناول کے کردار کی سی حرکت کر رہا تھا۔ میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ لورنا بے وفا ہے اور دولت کی خاطر مجھے قتل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ مجھے اس گھٹیا حرکت کی تلافی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ لورنا میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟

عین اس وقت لورنا فون پر بات کر رہی تھی "میرا خیال ٹھیک تھا ایڈ۔ اس روز ویلس نے ہمیں کار میں گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا"۔

"اور جعلی ڈرائیونگ لائسنس نے اسے مطمئن کر دیا ہوگا؟"

"فی الحال تو وہ مطمئن ہو گیا ہے لیکن اب ہمیں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کر ہی ڈالنا چاہیے"۔

"کل رات کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے"۔

"میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں" ایڈ نے کہا "ظاہر ہے کہ ویلس تو دفتر جا چکا ہوگا باقی تفصیلات وہیں طے کریں گے"۔

اُسی روز رات کے کھانے سے فراغت پا کر لورنا نے ویلس سے کہا "آج کچھ تفریح کا موڈ ہو رہا ہے"۔

"اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے" ویلس بولا "کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟"۔ "آج ساحل کی سیر کرتے ہیں"

ویلس یہ سن کر چونک سا گیا۔ ساحل وہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں تک جانے والی سڑک ایک اونچی پہاڑی کے اوپر سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس پہاڑی پر بسا اوقات حادثات ہوتے رہتے تھے۔ ویلس سوچ رہا تھا کہ لورنا بے وقت وہاں کی سیر کیوں کرنا چاہتی ہے؟ اس نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے کہا "او، کیوں نہیں؟"

جب وہ گاڑی کی طرف جا رہے تھے تو ویلس کے ذہن میں عجیب قسم کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ اس نے اُن خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ وہ ایک بار پھر بدظنی کا شکار ہو رہا ہے۔ اس وقت ساحل کی سیر کا ارادہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا تو لورنا نے آگے بڑھ کر کہا "آج میں ڈرائیو کروں گی"۔

اس بات نے ایک بار پھر اسے الجھن میں ڈال دیا۔ اس وقت ساحل کی سیر کا ارادہ اور پھر ڈرائیونگ پر اصرار خالی از علت نہیں تھا۔ ویلس کی چھٹی حس دماغ کے پچھلے حصے میں خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔

"ڈارلنگ!" اس نے پیار سے کہا "کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں ڈرائیونگ کروں۔ رات کا وقت ہے اور راستہ پرخطر ہے۔ تم نے نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی ہے اس لیے تمہیں احتیاط کرنی چاہیے"۔

"ڈرنے کی قطعاً کوئی بات نہیں تم ذرا دیکھنا میں کتنی مہارت سے کار چلاتی ہوں!" لورنا نے کہا لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اسی دن کے لیے تو میں نے کار چلانی سیکھی تھی۔ وہ اس منصوبے کی تفصیلات کے بارے میں سوچنے لگی جو اس نے اور ایڈ نے تیار کیا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں ان تفصیلات کو دہرانے لگی۔

ایڈ اس وقت پہاڑی کے موڑ پر ان کا منتظر تھا۔ وہ چوٹی پر پہنچنے سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے انڈیکیٹر لائٹ دو دفعہ جلائے گی۔ جب کار چوٹی سے چند قدم کے فاصلے پر رہ جائے گی تو ایڈ تیزی سے سڑک پر آ جائے گا۔ لورنا اسے بچانے کے بہانے کار کو کنارے کی طرف موڑ دے گی۔ کنارے کے عین اوپر پہنچ کر وہ بریک لگائے گی اور دروازہ کھول کر باہر کود جائے گی پھر ایڈ کار کو ذرا سی کوشش سے نیچے دھکیل دے گا۔

"اس منصوبے میں سب سے اہم کام تمہارا ہے" ایڈ نے لورنا سے کہا تھا "مجھے دیکھتے ہی تم رفتار کم

قیمت 175 روپے

- ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔
- جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:
- والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایانِ شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

خود بھی پڑھیئے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے

ہر گھر میں پیار و محبت کی تحریک کا آغاز کیجیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور
فون: 042-37245412

کر دینا اور کنارے کے عین اوپر پہنچ کر بریک لگا دینا۔ تمہارے باہر آتے ہی میں کار کو ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے لڑھکا دوں گا۔ تمہاری ذرا سی غلطی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ بریک کنارے کے عین اوپر پہنچ کر لگنے چاہئیں، نہ ایک انچ آگے نہ ایک انچ پیچھے"۔

"تم کوئی فکر نہ کرو!" لورنا نے کہا تھا "تم نے دیکھا نہیں میں ایک ہفتے کی ریہرسل کے دوران میں کتنی عمدگی سے بریک لگاتی رہی ہوں!"

انہی خیالات کے پیچ و خم میں وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار کو آگے بڑھا دیا۔

"کیا سوچ رہی ہو لورنا؟" ولیس نے پوچھا۔

"آں ہاں...... کچھ نہیں"۔

"کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ تم ذہنی طور پر مجھ سے بہت دُور چلی گئی ہو"۔

"آج کل تم ضرورت سے زیادہ ہی سوچنے لگے ہو"۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" ولیس نے کہا "اب ذرا احتیاط کرنا، پہاڑی علاقہ شروع ہو رہا ہے"۔ لورنا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ وہ بیسیوں مرتبہ اس طرف آ چکی تھی۔ اس کی نگاہ سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھی۔ جب چوٹی سو گز دور رہ گئی تو اس نے رفتار کم کر دی اور دو مرتبہ انڈیکیٹر لائٹ جلائی۔ موڑ کے قریب سفیدے کے درخت کی اوٹ میں کھڑے ہوئے ایڈ نے یہ اشارہ دیکھ لیا۔ جب کار چند قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ منصوبے کے مطابق دوڑتا ہوا سڑک پار کرنے لگا۔

"دیکھنا سامنے آدمی ہے" ولیس نے چیخ کر کہا۔

لورنا نے نہایت مہارت کے ساتھ گاڑی کو دائیں طرف موڑا اور عین کنارے کے اوپر پہنچ کر بریک لگا دیئے۔ پھر جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی، فضا میں ایک چیخ اور دھماکے کی آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مخالف سمت سے آنے والی کار ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ ولیس بھی دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور خوفزدہ نظر سے سڑک کے وسط میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھنے لگا۔

دوسری کار سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر آیا اور ولیس کو مخاطب کر کے کہنے لگا "آپ نے دیکھا جناب! میری اس میں قطعاً کوئی غلطی نہیں۔ یہ شخص پہلے آپ کی کار سے بچنے کے لیے بھاگا تھا۔ یہ تقریباً سڑک پار کر چکا تھا لیکن پھر اس کے ذہن میں نہ جانے کیا دُھن سمائی کہ دوبارہ اسی کنارے کی طرف واپس بھاگا۔ میری کار بالکل قریب پہنچ چکی تھی اور بریک لگانے کا وقت گزر چکا تھا۔

"شاید یہ کوئی دیوانہ تھا" ولیس نے کہا "بڑے آرام سے درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ جب ہماری کار بالکل قریب پہنچ گئی تو سڑک پار کرنے کے لیے بھاگا۔ اگر میری بیوی بروقت بریک نہ لگاتی تو ہم کار سمیت ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے لڑھک جاتے"۔

پھر ولیس اور لورنا کو پولیس کے آنے تک وہاں رُکنا پڑا۔ واپسی پر ولیس نے لورنا سے کہا "ڈارلنگ میں ایک چھوٹا سا اعتراف کرنا چاہتا ہوں"۔ لورنا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آج جب ہم سیر کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو میرے دل میں تمہارے متعلق بدظنی پیدا ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ تم میرے خلاف کوئی منصوبہ بنا چکی ہو۔ اب تمہارے معصوم چہرے کی طرف دیکھ کر مجھے اپنے اس لایعنی خیال پر سخت ندامت ہو رہی ہے۔ یہ تم جانتی ہو کہ میں ایک حقیقت پسند شوہر ہوں۔ اپنے دل میں کوئی میل نہیں رکھتا"۔

"اس وقت تمہارے دل کا کیا حال ہے؟"

"شیشے کی طرف صاف ہے" ولیس بولا۔

"تو پھر ندامت کی کیا بات ہے ڈیئر!" لورنا نے پورے خلوص کے ساتھ کہا "انسان کا دل سمندر کی مانند ہے اور سمندر میں سرکش ہوا کی وجہ سے کبھی کبھی تلاطم بھی بپا ہو جاتا ہے"۔

جنوں رنگ

ندیم شاہ

اس کے ساتھ ہی میں نے مستانہ کے جسم پر پے درپے وار کرنے شروع کیے اور پھر ایک گھاؤ ایسا لگایا کہ چاقو اس کے جسم میں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے پوری قوت سے اسے نکالنے کی کوشش کی جب وہ باہر نہیں آیا تو میں نے اسے گھما دیا۔ پھر چاقو کے باہر آتے ہی مستانہ نے آخری ہچکی لی۔

بعض جُرم ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ بظاہر سمجھ نہیں آتی، ایک مجرم کا اعتراف نامہ

قتل کر دیا، میں نے اسے جان سے مار دیا۔
وہ حیدر آباد کا سینئر صحافی تھا۔ میں نے چاقو سے پتا نہیں کتنے وار کیے، میں چاقو گھونپتا ہی چلا گیا۔

ایک جنون سا مجھ پر سوار تھا اور میں اسے مار رہا تھا۔ اس کی زبان چل رہی تھی۔ وہ گندی گندی گالیاں بک رہا تھا۔ اور میں ہر گالی پر وار کر رہا تھا۔ اب یاد

کر کے مجھے افسوس اور دُکھ ہو رہا ہے، وہ تڑپ رہا تھا، خود کو میرے، وار سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر وار پر دو تین گندی گالیاں دے رہا تھا، آخر کار اس نے آخری ہچکی لی اور اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کی زبان رُک گئی۔ لیکن میرا ہاتھ نہیں رُکا۔ میں نے آخری وار کیا اور اس سے الگ ہو گیا۔ میرے کپڑے اس کے خون سے لت پت ہو گئے تھے ''اس کے کپڑوں کی تلاشی لو'' میں نے اپنے دوست شہنشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ٹی وی کی تیز آواز میں شاید شہنشاہ میری بات نہیں سُن سکا تھا ''چل، بھاگ چلیں ندیم شاہ!'' اس نے قدرے تیز آواز میں کہا ''اس سے پہلے کہ یہاں کوئی آ جائے''۔ میں آگے بڑھ کر ٹی وی کی آواز کم کی۔ یہ آواز میں نے خود ہی بڑھائی تھی تاکہ کمرے میں ہونے والی گفتگو کی آواز باہر والے نہ سُن سکیں۔ جب ہم اس صحافی کے کمرے میں داخل ہوئے وہ تنہا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیا تھا۔ اس کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے ''بہت دن بعد آئے ہو شاہ، کہاں گئے تھے؟''

''یہ شہر بہت بڑا ہو گیا ہے، تم تک پہنچنے میں اتنی دیر لگ گئی''۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا ''اس سے ملو یہ میرا دوست شہنشاہ ہے!''

''کہاں رہتا ہے، شاید میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے'' صحافی نے کہا ''بیٹھ جاؤ''۔

''تمہاری نظریں بہت تیز ہیں، مستانہ سیال!'' میں نے صحافی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''شہنشاہ کو تم نے صدر میں دیکھا ہوگا''۔

''یہ تو یاد نہیں، لیکن میں نے اسے دیکھا ضرور ہے''۔ مستانہ سیال نے کہا ''گھر میں کوئی نہیں ورنہ تمہیں چائے ضرور پلاتا''۔

''میں جانتا ہوں گھر میں کوئی نہیں ہے'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ یہ بات میں نے درست کہی تھی۔ میرے علم میں تھا کہ اس کے گھر والے کہیں گئے ہیں۔ لیکن میرا یہاں آنے کا ارادہ نہیں تھا مگر شہنشاہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہاں کہ اس کے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں۔ میرے پاس بھی نہیں تھے ورنہ میں اس کی ضرورت پوری کر دیتا۔ پھر اچانک ہی مجھے مستانہ سیال کا خیال آیا اور میں نے اس سے کہا ''ایک جگہ سے پیسے مل سکتے ہیں، لیکن تھوڑا سا ڈرامہ کرنا پڑے گا ہمارے ذرا سی کوشش سے وہ شخص بلیک میل ہو سکتا ہے''۔

''تو پھر چلو کوشش کر لیتے ہیں''۔

اس کے بعد ہی میں شہنشاہ کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ میں نے گھر سے چلتے ہوئے چاقو بھی جیب میں رکھ لیا تاکہ ڈرانے دھمکانے کے کام آ سکے۔ ہم لوگ صدر سے ہیر آباد تک پیدل ہی گئے تھے، راستہ بھر ہم لوگ مستانہ سیال کو بلیک میل کرنے کے سلسلے میں ہی باتیں کرتے رہے تھے۔ مستانہ سیال کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے شہنشاہ کو تاکید کی تھی کہ بات تحمل اور طریقے سے کرنا، بے صبری کا مظاہرہ کھیل بگاڑ سکتا ہے کیونکہ وہ صحافی ہے اور صحافی عموماً دلیر بھی ہوتے ہیں۔ وہ دھمکی بھی دے سکتا ہے لیکن اس کی دھمکی میں آنے کی ضرورت نہیں اگر ہم اس کی دھمکی میں آئے تو نہ صرف ہمارا کام نہیں ہوگا بلکہ وہ ہمیں پھنسا بھی سکتا ہے سمجھ گئے میری بات!'' آخر میں شہنشاہ کو پکا کرنے کے لیے کہا تھا۔

''تم کس طرح جانتے ہو، میرے گھر میں کوئی نہیں''۔ مستانہ سیال نے پوچھا ''کیا تم ہماری ٹوہ میں رہتے ہو''۔

''تمہاری ٹوہ میں رہنے کی ضرورت کیا ہے'' میں نے کہا ''اور میرا خیال ہے تمہیں یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے کیسے معلوم کہ اس وقت تمہارے گھر میں کوئی نہیں''۔

''چھوڑو! یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟''

''آنا تو کام سے ہی ہوا ہے'' میں نے کہا ''اس شہنشاہ کو پیسوں کی ضرورت ہے اور یہ تمہارا کام بھی کرے گا''۔

''کیا مطلب؟'' مستانہ سیال نے کہا۔

''کیا تمہیں مطلب بھی سمجھانا پڑے گا''۔ میں نے آنکھیں نکال کر کہا ''میں جانتا ہوں تم لڑکوں سے کیا کام لیتے ہو' شہنشاہ تمہارے کام آ سکتا ہے۔ تم اس کی ضرورت پوری کرو' یہ تمہاری کرے گا''۔

''کیا بکواس ہے'' مستانہ سیال نے تیز آواز میں کہا ''تم نے کیا سمجھا ہے مجھے''۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹی وی کی آواز تیز کی اور کہا ''تیز آواز میں بات مت کرو' ورنہ انجام بُرا ہوگا''۔

''کیا بُرا ہوگا؟'' مستانہ سیال نے اپنی جگہ سے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں اس سے پہلے ہی کھڑا ہو گیا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا ''اب انسانوں کی طرح جیب میں جتنے پیسے ہیں باہر نکالو۔ زیادہ تیز بولنے اور اچھلنے کی کوشش کرو گے تو ہم محلے میں تیری عزت خاک میں ملا دیں گے۔ یہ لڑکا باہر نکل کر شور مچا دے گا کہ تم اس کے ساتھ بُرا کام کرنے......''۔

''خاموش رہ کمینے انسان!'' مستانہ سیال نے میری بات کاٹ کر کہا اور ایسے ہاتھ چلایا جیسے مجھے مارنا چاہتا ہو۔

میں بھی اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے میں میرے ہاتھ میں چاقو تھا ''اسے دیکھ رہا ہے، اتنے وار کروں گا کہ نہ جسم پہچانا جائے گا اور نہ شکل!''

اس فقرے کے ساتھ ہی مستانہ سیال مشتعل ہو گیا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کرتا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ سے منہ بند کیا اور چاقو شہنشاہ کی طرف اچھالتے ہوئے اشارہ کیا کہ اس پر وار کردے۔ شہنشاہ نے فوراً چاقو اٹھا کر مستانہ سیال پر وار کر دیا۔ اس نے اس وار کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ میری گرفت سے نکل نہیں سکا۔ ہاں یہ ہوا کہ اس کے منہ پر سے میرا ہاتھ لمحہ بھر کے لیے ہٹ گیا۔ اس نے کئی گالیاں بک دیں اور شہنشاہ نے اس کے جسم پر کئی وار کر دیئے، لیکن مستانہ میری گرفت سے نکلنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا اور اسے جیسے ہی موقع ملتا وہ گندی گندی گالی بک دیتا تھا۔ جب مستانہ سیال نے شہنشاہ کے دس بارہ وار برداشت کر لیے تو میں نے اسے ایک طرف دھکا دے کر گرا دیا اور پھر شہنشاہ کے ہاتھ سے چاقو لے لیا۔

''تم اسے ابھی مار نہیں سکے۔ دیکھو، یہ کیسے مرتا ہے'' اس کے ساتھ ہی میں نے مستانہ کے جسم پر پے در پے وار کرنے شروع کیے اور پھر ایک گھاؤ ایسا لگایا کہ چاقو اس کے جسم میں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے پوری قوت سے اسے نکالنے کی کوشش کی جب وہ باہر نہیں آیا تو میں نے اسے گھما دیا۔ پھر چاقو کے باہر آتے ہی مستانہ نے آخری ہچکی لی۔

''یہ تو مر گیا'' شہنشاہ نے کہا۔
''ٹھیک ہے مر جانے دو''۔ میں نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''تلاشی لو اس کی''۔
کچھ نوٹ خون میں بھیگ گئے ہیں......اور یہ تین سو روپے سے زیادہ نہیں ہیں''۔
''انہیں رکھ لو اور یہاں سے نکل چلو!''
''اس طرح تو ہم باہر نہیں جاسکتے'' شہنشاہ نے اپنے اور میرے خون آلودہ کپڑوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔
بات وہ ٹھیک کر رہا تھا۔ ہمارے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ میں نے کمرے میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور پھر مجھے مستانہ سیال کے کئی شلوار سوٹ نظر آگئے۔ میں نے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اپنے کپڑے اُتار کر ان میں سے ایک جوڑا پہن لو، میں بھی یہی کرتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر میں نے اپنے کپڑے اُتارے اور پھر ذرا سی دیر ہی میں مستانہ سیال کا جوڑا میرے جسم پر تھا، یہی کچھ شہنشاہ نے بھی کیا۔ کپڑے بدلنے کے فوراً بعد ہی ہم دونوں کمرے سے باہر تھے۔ باہر نکل کر میں نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تاکہ لوگوں کو یہی گمان ہوتا رہے کہ مستانہ ٹی وی دیکھ رہا ہے۔
کمرے سے باہر آنے کے بعد شہنشاہ نے رائے دی کہ ہمیں چند دن کے لیے حیدرآباد سے چلے جانا چاہیے۔ میں نے اس کی رائے مان لی اور ہم دونوں کراچی کی بس میں سوار ہوگئے۔
ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ ہم نے اتنی بے دردی سے مستانہ سیال کو کیوں مارا۔ اس ''کیوں'' کے جواب میں ایک حقیقت افروز کہانی جنم لیتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا تعلق کسی ایسی تنظیم سے نہیں جو دہشت گرد ہو، میرا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے بھی نہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں۔ میری ضروریات بھی ہیں، میں انہیں پورا کرنا بھی چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میرے ذہن میں کئی منصوبے آتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کہیں ڈاکا ڈالنے، کسی کو اغوا کرکے تاوان حاصل کرنے کے بجائے ......کسی بھی شخص کو بلیک میل کرکے مال بنایا جاسکتا ہے۔ گھناؤنے الزام سے بچنے کے لیے کوئی بھی اپنی جیب خالی کر سکتا ہے۔ جس وقت شہنشاہ میرے پاس آیا اس وقت بھی میں ایسے ہی منصوبے پر غور کر رہا تھا اور شہر کی مختلف شخصیات کے چہرے میری نگاہوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ جب شہنشاہ نے اپنی جیب خالی ہونے کی بات کی تو اس وقت میری نگاہوں کے سامنے مستانہ سیال کا چہرہ گردش کر رہا تھا۔ جب میں نے شہنشاہ کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ مستانہ اس وقت مکان میں اکیلا ہوگا۔ وہ اکیلا نہیں ہوتا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، میں یہ بات جانتا تھا کہ جس کمرے میں وہ ہوتا تھا وہ کمرا تو مکان ہی کا تھا لیکن اس کمرے کا مکان سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا تھا۔
وہ کمرا بیرونی دروازے کے ساتھ ہی تھا اور جب مستانہ اس کمرے میں ہوتا تو مکان والے اندرونی حصے میں ہوتے تھے اور ان کے علم میں نہیں ہوتا تھا کہ مستانہ اپنے کمرے میں کیا کر رہا ہے، اس سے ملنے کون آرہا ہے۔ اندرونی حصے میں آواز اس کمرے تک نہیں آتی تھی اور اس کمرے کی آواز اندر نہیں

جاتی تھی۔

جب ہم سیال کے کمرے میں جا کر بیٹھے تو اس وقت میں یہ جان گیا تھا کہ اس وقت مستانہ گھر میں اکیلا ہی ہے کیونکہ اندرونی حصے میں روشنی نہیں تھی اگر تھی تو بہت کم تھی دوسرے ایک سناٹا بھی تھا اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے علم ہے اس وقت گھر والے نہیں ہیں، اس پر مستانہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تو، میں رہنے والی بات کی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مستانہ اپنی عزت کی خاطر فوراً اپنی جیب خالی کر دے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا پھر میں نے فوری فیصلہ کیا تھا کہ جب آ ہی گئے ہیں تو خالی ہاتھ جانا بیکار ہے۔ اس لیے میں مستانہ کو مار کر اسے لوٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مستانہ نے گالی دی اور وہ مسلسل گالیاں بکتا رہا' مزاحمت کرتا رہا، ہمارا ہر وار اسے مشتعل کرتا رہا اور لمحہ بہ لمحہ ہمارے غصے اور جنون میں اضافہ ہوتا رہا۔ اگر مستانہ خاموشی سے ہمارے آگے ہتھیار ڈال دیتا تو اپنی جان سے نہیں جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے لوٹنے کے بعد ہم گرفتاری سے بچنے کے لیے اُس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دیتے۔

اس کا علم بہرحال ہمیں پہلے سے نہیں تھا کہ حالات ہمیں کس رُخ پر چلنے کے لیے مجبور کرتے، ہم نے جو کچھ کیا وہ تو شاید غلط ہے، لیکن میرے خیال میں حالات کا تقاضا یہی تھا اگر ہم مستانہ کے ساتھ یہ نہ کرتے تب بھی ہم دہشت گرد اور ڈاکے کے الزام میں جیل میں ہوتے، مستانہ مجھے اور میرے والد کو اچھی طرح جانتا تھا اور پھر وہ سینئر صحافی بھی تھا۔ اس کے بیان پر پولیس فوراً حرکت میں آتی اور پھر صبح سے پہلے پہلے ہی ہم گرفتار ہو جاتے اس کے قتل کے بعد یہ ضرور ہوا کہ ہم دو دن بعد گرفتار ہوئے۔ وہ بھی محض اس لیے کہ ہم کپڑے مستانہ کے گھر میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ پولیس دھوبی کے لگائے ہوئے نشان سے ہمارے گھر تک پہنچ گئی۔ اگر ہم دو دن بعد نہیں پکڑے جاتے تو چار دن بعد پکڑ لیے جاتے۔ کچھ بھی ہو ہمارا پکڑا جانا لازمی تھا۔

ہم نے دو دن کراچی میں جس دوست کے گھر گزارے تھے اس نے تو یہی مشورہ دیا تھا کہ ہم گرفتاری دے دیں اپنی ''عزت'' بچانے کی خاطر ہم نے خون کیا ہے اس لیے ہمارا کچھ نہیں ہوگا۔ ''عزت'' بچانے والی کہانی ہم نے کراچی والے دوست کو بھی سنائی تھی۔

دو دن تو ہم نے کراچی میں گزارے تھے، ایک تو ہم گھر والوں کو بتا کر نہیں گئے تھے، دوسرے ہمیں یہ یاد آ گیا تھا کہ ہم کپڑے مستانہ کے کمرے میں ہی لاش کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ ان کپڑوں کے توسط سے پولیس ہمارے گھر تک پہنچ سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس ہمارے گھر تک پہنچے ہمیں خود گھر تک جانا چاہیے پھر ممکن ہے بچاؤ کی کوئی سبیل نکل آئے۔ گھر پہنچنے کے بعد ہی ہمیں علم ہوا کہ پولیس بہت تیزی سے حرکت میں آ گئی ہے۔ اصل میں معاملہ ایک صحافی کا تھا۔ دیگر صحافی بھی حرکت میں آ گئے تھے۔ یہ تو ہمیں بعد میں علم ہوا کہ صحافیوں نے قاتلوں کی جلد گرفتاری اور عبرت ناک سزا کا مطالبہ کیا ہے۔

پولیس نے شہنشاہ کو پہلے گرفتار کر لیا۔ میں خود اپنے گھر پر گرفتاری دے سکتا تھا، لیکن والدہ کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے خود تھانے میں جا کر پیش ہونے کا فیصلہ کیا اور تھانے

کی سمت پیدل ہی روانہ ہوگیا لیکن ابھی میں تھانے پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ پولیس کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ لیکن ان کا رویہ میری توقع کے خلاف بہت نرم تھا شاید اس رویے نے مجھے رونے پر مجبور کردیا۔ جب ایک سادہ لباس پولیس کے آدمی نے مجھے پکڑا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں رونا نہیں چاہتا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے اور شہنشاہ نے "بیان" دیا۔ ہم نے تسلیم کیا کہ مستانہ کو ہم نے بے دردی سے قتل کردیا۔ ایسا کیوں کیا؟ اس کے جواب میں ہم نے جو کہانی سنائی وہ ممکن ہے، زیادہ بہتر نہ ہو، یعنی وہ ہمیں سزا سے، بچانے کے قابل نہ ہو لیکن ہم نے ''عزت'' بچانے والی کہانی سنادی اور یہ کہہ دیا کہ مستانہ غلط کام کا عادی تھا۔

ہمارے اقبالی بیان کے بعد ہی پولیس کے ایک افسر نے صحافیوں کو مجرموں کے گرفتار ہونے اور اقبال جرم کرنے کے بارے میں بتایا۔ ہمیں صحافیوں کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت پولیس افسر نے وہی کہانی دہرائی جو ہم نے سنائی تھی۔ ''ان لڑکوں نے یہی بیان دیا ہے'' پولیس افسر نے بتایا ''میرا خیال ہے یہ درست کہہ رہے ہیں''۔ اس کے بعد ہی پولیس افسر نے ہماری گرفتاری کے لیے کی جانے والی کارروائی کے بارے میں بتایا کہ کس انداز میں پولیس نے تفتیش کی، کس طرح دھوبی تک پہنچے کس طرح دھوبی کی مدد سے ہمارے گھر تک پہنچے، کس انداز میں شہنشاہ کو گرفتار کیا اور کیسے مجھ تک پہنچے، افسر نے مستانہ کے قتل کو اندھا قتل قرار دیتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا کہ ہماری پولیس نے، ملزموں کو صرف اڑتالیس گھنٹوں کے اندر گرفتار کرکے ان سے اعتراف جرم کرالیا۔

پولیس کی کارگزاری اپنی جگہ لیکن اگر ہم خود گرفتار ہونا نہ چاہتے تو کوئی ہمیں گرفتار نہیں کرسکتا تھا۔ ہم سے پہلی غلطی یہ ہوئی تھی کہ ہم نے اپنے خون آلود کپڑے مقتول کے کمرے میں چھوڑ دیئے۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ ہم کراچی سے واپس آکر اپنے گھر پہنچ گئے۔ اگر ہمارا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہوتا تو ہمیں کراچی ہی میں پناہ مل جاتی۔ اگر مہینے دو مہینے کی تفتیش کے بعد پولیس ہمارے گھر تک پہنچتی تو کیا ہوتا۔ ہم لوگ تو پولیس کے ہاتھ نہیں آتے۔ آخری بات میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اقبال جرم ہم نے خود کیا۔ ہم سے اعتراف کرانے کے لیے پولیس کو کچھ نہیں کرنا پڑا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ لوگ کہتے ہیں، ہر مجرم اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسا سراغ ضرور چھوڑ جاتا ہے جس کے سہارے اس کی گرفتاری عمل میں آتی ہے لیکن ایسے مجرم بھی ہوتے ہیں جو اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرتے۔ پولیس والے ریمانڈ لیتے اور جرم قبول کرانے کے لیے ملزموں پر تشدد کی انتہا کردیتے ہیں لیکن وہ اعتراف جرم کرتے ہی نہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ یہ سب نہیں ہوا۔

''گرفتاری کے بعد ہم لوگوں نے ملزموں سے اقبال جرم کرانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی'' افسر نے صحافیوں کے سامنے کہا۔

زدوکوب اور تشدد کو پولیس افسر ''کوشش'' کا نام دے رہا تھا، واقعی پولیس نے ''کوشش'' نہیں کی تھی۔ مستانہ کے قتل سے لے کر گرفتاری اور پھر اعتراف جرم تک میں ایک سمجھ میں نہ آنے والی کشمکش میں تھا۔ جب میں نے مستانہ پر چھلانگ لگا کر اس کا منہ دبایا تھا اس وقت دل میں ایک ہی

خواہش تھی کہ مستانہ کا دم نکل جائے، پھر جب میرے کہنے پر شہنشاہ نے میرے دیئے ہوئے چاقو سے مستانہ پر وار کرنے شروع کیے اس وقت بھی ہر وار کو میں آخری سمجھ رہا تھا۔ جب مستانہ اس کا ہر وار سہہ گیا تو پھر میں نے جب چاقو لے کر مستانہ پر وار کرنے شروع کیے تو مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کررہا ہوں' بس ایک ہی دھن سر پر سوار تھی کہ مستانہ کسی طرح دم توڑ دے۔ اس کیفیت کو میں سوائے جنون کے کوئی اور نام نہیں دے سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم مستانہ کے گھر اسے جان سے مارنے کی نیت سے نہیں گئے تھے کیونکہ اس کے ساتھ ہمارا کوئی تنازع نہیں تھا۔ زمین' جائیداد کا کوئی جھگڑا نہیں تھا، کوئی خاندانی دشمنی نہیں تھی۔

صحافیوں کے جانے کے بعد تھانے کے کئی سپاہیوں نے ہم سے بے وجہ ہی پوچھ گچھ شروع کردی ''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا کسی نہ کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق ہے'' ایک سپاہی نے کہا ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا اعتراف کرانے کے لیے ہم تم پر تشدد بھی کرسکتے ہیں''۔

''جب ہم قتل جیسے جرم کا اعتراف کرسکتے ہیں تو کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق کا اعتراف کرنے میں کیا جاتا ہے''۔

''ارے ان کا تعلق دہشت گردوں سے ہے'' ایک سپاہی نے کہا ''جس بے دردی سے انہوں نے مستانہ کو مارا ہے' اس بے دردی کا مظاہرہ عام فرد کر ہی نہیں سکتا''۔

''بتاؤ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟'' تیسرے سپاہی نے کہا ''ورنہ تم کو معلوم ہی ہے، کہ پولیس والے اقبال جرم

کیا آپ جانتے ہیں؟

پاکستان دنیا میں سب سے زیادہ ککوں پیدا کرنے والا ملک ہے۔ پاکستان دُنیا کا 95 فیصد ککوں پیدا کرتا ہے۔

پاکستان آم پیدا کرنے والا دُنیا کا ساتواں بڑا ملک ہے۔

پاکستان دُنیا میں سیب پیدا کرنے والا دسواں بڑا ملک ہے۔

پاکستان دنیا میں کپاس پیدا کرنے والا پانچواں بڑا ملک ہے۔

پاکستان دنیا میں کھجور پیدا کرنے والا تیسرا بڑا ملک ہے۔

پاکستان دنیا میں دودھ کی پیداوار کے لحاظ سے پانچواں بڑا ملک ہے۔

کرانے کے لیے کیا کچھ کرسکتے ہیں''۔

''تم ایس ایچ او صاحب سے اجازت لے لو اور یہ ابھی سچ سچ بولنے لگے گا، میرا دل کہتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا پہلا قتل نہیں ہے''۔

''اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے، وہ خود ہی کہیں گے، دوسرے جرم قبولوانے کے سلسلے میں اس کا ریمانڈ تو لیا ہی جائے گا پھر دیکھ لیں گے سالے کو' کتنے پانی میں ہے''۔

سپاہی اُس وقت حوالات کے دروازے پر کھڑے آپس میں گفتگو کررہے تھے اور میں یوں بیٹھا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کے بارے میں بات چیت کررہے ہیں۔ شہنشاہ بھی چپ تھا، لیکن اس کے چہرے سے میں نے اندازہ لگایا کہ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

شام سے پہلے پہلے، میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ میں ایس ایس پی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

اس سپاہی کی سمجھ میں کچھ تو نہیں آیا کہ میں کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے اور بغیر کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔ جب ایک دوسرا سپاہی حوالات کی طرف آیا تو میں نے اس سے بھی کہا۔

''ابے تو کیا کرے گا صاحب سے مل کر؟'' اس سپاہی نے کہا۔

''میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں'' میں نے کہا اور لہجہ بھرّ رُک کر بولا ''ایک اہم بات'' ایسی بات جو میں کسی دوسرے کے سامنے کرنا نہیں چاہتا''۔

''ٹھیک ہے بیٹھا رہ' میں تھانے دار صاحب سے بات کرتا ہوں'' اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے بعد میں نے کسی سے نہیں کہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ میری بات چیت ایس ایس پی سے نہیں کرائیں گے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ ایک سپاہی نے حوالات کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا کہ تمہارا بلاوا ہے۔ حوالات کا دروازہ کھلتے ہی ہم لوگ باہر آگئے۔ پھر وہ سپاہی ہمیں ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایس ایس پی بیٹھے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' ایس ایس پی نے بارعب آواز میں کہا ''ایک ذاتی مسئلے پر آپ سے بات کرنا ہے''۔

''ذاتی مسئلے پر!'' ایس ایس پی نے حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا'' کہو کیا کہنا چاہتے ہو''۔

''ہم لوگ..... معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں''۔

''تو پھر ہم لوگ کیا کریں' جرم تو تم نے بہت گھناؤنا کیا ہے' انسان کی جان لینا''۔

''وہ تو ٹھیک ہے صاحب' ہم نے اس کا اعتراف بھی کرلیا ہے، لیکن اب ایک التجا یہ ہے کہ ہمیں ہمارے والدین سے نہ ملائیں' وہ ہم سے ملنے ضرور آئیں گے لیکن ہم ان سے ملنا نہیں چاہتے ان سے ملنے کی ہم میں ہمت نہیں ہے ان کا سامنا کرنا اب ہمارے بس کی بات نہیں''۔

''یہ بہت مشکل کام ہے'' ایس ایس پی نے زیر لب کہا ''وہ ملاقات کے لیے کورٹ سے آرڈر لے کر بھی آسکتے ہیں' ایسے وقت انہیں ٹالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے''۔

''پھر صاحب ہمیں جیل بھیج دیں''۔

''وہ تو جیل میں آکر بھی تم لوگوں سے ملاقات کرسکتے ہیں''۔

''وہاں ہم سے جب وہ ملاقات کے لیے آئیں گے، پہلے تو اس وقت تک ہم میں ہمت بھی پیدا ہو جائے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم ملاقات سے انکار کردیں گے''۔

''تم تو یوں بات کررہے ہو جیسے تمہیں قاعدے قانون سب معلوم ہوں''۔

''کچھ باتیں دوسرے بھی بتادیتے ہیں سر!'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے''۔ ایس ایس پی نے کہا اور پھر سپاہیوں کو بلا کر کہا کہ ہمیں حوالات میں پہنچادیں۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس لیے حوالات میں پہنچ کر ہم لوگ آپس میں یہ طے کرتے رہے کہ والدین کا سامنا تو ہمیں کرنا نہیں ہے اور ہم ان سے ملنے سے صاف انکار کردیں گے اگر وہ حوالات تک پہنچ بھی گئے تو ہم دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائیں گے، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے

روز صبح ہی ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں جیل بھیجا جارہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک اُداس کردینے والی خبر بھی میرے لیے تھی۔ مجھے تو حیدرآباد جیل بھیجا جارہا تھا لیکن شہنشاہ کو کراچی بھیجا جا رہا تھا کیونکہ بچوں کی جیل کراچی میں ہے اور پولیس والوں کا خیال تھا کہ وہ ابھی بالغ نہیں ہے۔ اس کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہیں ہے اور اس کے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ابھی شناختی کارڈ لینے کے قابل ہی نہیں تھا۔

میں شہنشاہ سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا، ایک جرم ہم نے ساتھ کیا تھا تو سزا بھی ساتھ ہی ایک جیل میں رہ کر اٹھانا چاہتا تھا لیکن آخر ہم دونوں جدا ہو گئے۔ حیدرآباد جیل میں نے طالب علمی کے زمانے میں طلبہ کے ساتھ ایک بار دیکھی تھی، لیکن جب میں قیدی کی حیثیت سے وہاں پہنچا تو یہاں کے رنگ وہ نہیں تھے جو میں دیکھ کر گیا تھا۔ حالانکہ میں کچا قیدی تھا اس لیے مجھے نہ جیل کے کپڑے ملے تھے نہ ٹوپی، لیکن ایک مگ اور پلیٹ دی گئی تھی تاکہ میں اس جیل کی روٹی کھاسکوں۔

جیل کے اندر داخل ہوتے ہی قیدیوں نے مجھے گھیر لیا۔ سب کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا کہ میں کس جرم میں اندر آیا ہوں۔ جب تھوڑی دیر تک میں نے جواب نہیں دیا تو پھر قیدیوں نے تبصرے شروع کردیئے۔

''جیب کترا معلوم ہوتا ہے''۔

''نہیں سالا چور معلوم ہوتا ہے'' دوسرے نے کہا۔

''ارے نہیں یہ کسی لڑکی کو لے کر بھاگا ہوگا تاکہ اپنی محبوبہ کا سودا کرکے عیش کرے''۔

''ارے نہیں حرامی شراب یا ہیروئن بیچتا ہوگا''۔

''ابے نہیں چہرے سے تو ایسا نہیں لگتا، استاد معلوم ہوتا ہے اس کا تعلق ضرور کسی ......''۔

بچوں میں خود اعتمادی کیلئے روایتی کھیل

ایک نئی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کیلئے روایتی کھیلوں کا فروغ ضروری ہے۔ محققین کے مطابق روایتی کھیلوں سے نہ صرف بچے چاق چوبند رہتے ہیں بلکہ ان کا وزن بھی نہیں بڑھتا،روایتی کھیلوں میں دلچسپی لینے والے بچے ذہنی اور جسمانی طور پر تندرست رہتے ہیں اور انکے جسم کا مدافعتی نظام بھی بہتر ہوتا ہے ،روایتی کھیلوں میں بچہ ایک ٹیم میں اپنا کردار ادا کرنا سیکھاتا ہے اور یوں اسے دوسرے لوگوں سے تعلقات بنانے میں بھی آسانی ہوتی ہے اور اسکی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے، جبکہ ایسی لڑکیاں جو اپنا وزن کم کرنے کیلئے ڈائٹنگ کرتی ہیں انہیں خوراک ترک کرنے کے بجائے ورزش اور کھیلوں میں حصّہ لینا چاہیے۔

''جھوٹ سے بچائو''

ایک صاحب مچھلی والے کی دکان میں داخل ہوئے اور بولے۔ ''میں پانچ عدد تازہ مچھلیاں خریدوں گا لیکن طریقہ یہ ہوگا کہ میں ذرا دور کھڑا ہوجاتا ہوں۔ تم لوگ ایک مچھلی میری طرف پھینکو میں اسے کیچ کروں گا۔'' ''اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے......؟'' دکان دار نے پریشان ہوکر پوچھا ''دراصل مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے میں گھر جاکر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مچھلیاں میں نے پکڑی ہیں۔'' ان صاحب نے جواب دیا۔

''میں نے قتل کیا ہے'' میں نے تیز آواز میں کہا ''ایک صحافی کو میں نے ماردیا''۔

''ابے کیوں جھوٹ بولتا ہے'' ایک داڑھی والے قیدی نے کہا۔ لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی کسی اچھے گھر کا فرد ہے ''یہاں سچ بولنا چاہیے، یہاں تیرا

"دعا تقدیر بدل دیتی ہے" (حدیثِ رسولؐ)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز پیشکش

دعا نمبر

شائع ہوگیا ہے

- قرآنی دعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالقِ کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہ کی تمام مسنونہ دعائیں جو رحمت اللعالمینؐ کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دعائیں۔
- آئمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دعائیں۔

جدید دنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز روحانی اور ایمانی علاج

قیمت: 175 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا''۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے، قتل کیا بس قتل کیا''۔ میں نے کہا۔

بیرک بند ہونے تک بہت سے قیدیوں کو علم ہو گیا تھا کہ میں خون کر کے جیل آیا ہوں۔ جس بیرک میں، میں بند ہوا تھا، وہاں کے کئی قیدی رات تک میرے دوست ہو گئے اور پھر انہوں نے مجھے بہت تسلی دی کہ میرا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے کورٹ میں بیان تبدیل کر دینا چاہیے۔ کہنا تم نے پولیس کی مار سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا تھا، لیکن ان لوگوں کی بات میری سمجھ میں نہ اس وقت آئی تھی اور نہ اب آ رہی ہے۔ حالانکہ ہر قیدی جو میرے قریب ہوتا وہ یہی کہتا کہ میں اپنا بیان تبدیل کر دوں۔ جب میں ان سے کہتا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے اور وہ دوسری جیل میں ہے۔

''تو کیا فرق پڑتا ہے'' ایک قیدی نے کہا ''وہاں کے قیدی بھی اسے مشورہ دے رہے ہوں گے کہ وہ اپنا بیان تبدیل کر لے''۔

''کوئی ضروری تو نہیں کہ جو میں بیان دوں وہ بھی وہی بیان دے''۔ میں نے کہا۔

''تم دونوں کا کیس الگ الگ نہیں چلے گا۔ پیشی پر اسے بھی حیدرآباد پولیس لایا کرے گی، وہاں مشورہ کر کے ایک جیسا بیان دینا۔ بیان تبدیل بھی کر دو گے تو کیس کمزور ہو جائے گا۔ پھر تمہارا چشم دیدہ گواہ کوئی نہیں ہے۔ ثبوت البتہ صرف کپڑے ہیں، لیکن تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ تمہارے کپڑے چوری ہو گئے تھے چونکہ معمولی چوری تھی اس لیے تم نے رپورٹ نہیں کی تھی۔ اگر بڑی چوری ہوتی تو اس کی رپورٹ بھی کی جاتی''۔

''تو اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سے بہت کچھ ہوگا' تمہارا وکیل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے کہ قاتلوں نے تمہارے کپڑے پہن کر قتل کیا اور کپڑے وہاں ڈال کر چلے گئے''۔

''یہ بہت مشکل ہے' کیونکہ ہماری نشان دہی پر پولیس نے مستانہ کے کپڑے اور آلہ ، قتل برآمد کیا ہے''۔

''وہ ٹھیک ہے' کورٹ کو غلط راستے پر ڈالنے میں کیا حرج ہے' اسے سزا ہی کم ہو جائے گی''۔

اس انداز کی باتیں بیرک میں روز ہی ہو رہی ہیں اور جب رات میں بیرک میں سوتا ہوں تو یہی سوچتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، مجھے اس کی سزا بھگتنا ہے' چاہے یہاں بھگت لوں چاہے وہاں بھگت لوں، یہ الگ بات ہے کہ جب میں مستانہ کو قتل کر رہا تھا اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھا، میرے سر پر ایک جنون سوار تھا۔ مستانہ کو جان سے مار دینے کا جنون۔ شاید میرے لاشعور میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اگر مستانہ بچ گیا تو ہمیں لمبی سزا کرا دے گا، کیونکہ وہ صحافی بھی تھا اور اس کی پہنچ بھی بہت تھی، کیونکہ اس کا تعلق سیاسی پارٹیوں سے بھی رہا تھا۔

اب میں ہر قیدی کی رائے توجہ سے سنتا ہوں جیسا کہ میں اس کی رائے پر عمل ضرور کروں گا لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنا بیان تبدیل نہیں کروں گا۔ چاہے مجھے پھانسی کی سزا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ پھانسی کی سزا کے سلسلے میں بھی میرا خیال ہے کہ شاید وہ نہ ملے، عمر قید ہو جائے ایسی صورت میں یہ تو ٹھیک ہے کہ جوانی جیل میں کٹ جائے گی لیکن آخری عمر آزاد فضا میں گزاروں گا۔

میرا کشمیر......میرا عشق

(وادیٔ نیلم)

فرخ صابری

قسط نمبر 5

دنیا کی تمام بڑی اور زندہ زبانوں کی طرح......اُردو زبان میں بھی تمام اصناف سخن ونثر کے علاوہ سفرنامے بھی لکھے گئے۔ ابن انشا، بیگم اختر ریاض الدین اور مستنصر حسین تارڑ جیسے سفرنگاروں کی اس صف میں اب فرخ صابری بھی آ شامل ہوئی ہیں۔

فرخ صابری اپنے اچھوتے موضوعات اور منفرد طرز اسلوب کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر پذیرائی پا چکی ہیں۔ افسانہ نویسی، ناول نگاری، کالم نگاری، تذکرہ نویسی اور تحقیق وتنقید میں اپنا ایک مقام اور پہچان رکھنے والی یہ لکھاری مذکورہ بالا تمام اصناف کا دلکش مرقع ''میرا کشمیر......میرا عشق'' لے کر آئی ہیں۔ جس میں افسانوی ماحول' ناولوں والی منظر کشی، کالم کا سا ایجاز واختصار' تہذیب وتاریخ کا تحقیقی مطالعہ اور سب سے بڑھ کر یادوں کے دلخراش تذکرے ''ھنک رنگ'' دکھاتے ہیں۔

اس سفرنامے میں فرخ کا اسلوب' جذب ومستی میں ڈوبا ''اللہ اکبر'' کا کوئی نعرۂ مستانہ سا ہے۔ اُس پر بھرپور تاثراتی ٹکڑوں کی پیوندکاری' وسیع ذخیرۂ الفاظ کا برمحل و برجستہ استعمال، کمال کا مشاہداتی انداز اور پھر متعلقہ علاقوں پر اٹھائے گئے وہ نشتر سوال' اس سفرنامے کو منفرد مقام پر لے جاتے ہیں۔ اس تحریر کی نمایاں خوبی شعری ونثری ٹکڑوں کا جا بجا استعمال ہے۔ ساتھیوں کی چھیڑ چھاڑ اور منظر کشی میں انوکھی جزئیات طرازی ایسی خوبیاں ہیں جو محض فرخ کے قلم کی فسوں کاری ہی ہو سکتی ہے۔

ادب' تاریخ اور تہذیب میں رچے اس سرشار سفرنامے کو پڑھ کر، کشمیر جنت نظیر جانے کا لطف ہی کچھ ''اور'' ہے۔ دراصل کشمیر مصنفہ کا ایسا موضوع ہے جس پر وہ انہی صفحات پر ناول ''آوارگی'' (قسط وار) افسانے' بڈھا' اور' شاہکار' کے علاوہ ایک ادبی و تحقیقی مقالہ ''کشمیری افسانہ نگاروں کے ہاں کشمیر کی زندگی'' پیش کر چکی ہیں (اس مقالے کو عالمی سطح پر پذیرائی ملی تھی)۔

اور اب......فرخ صابری کا ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے قارئین کے لیے ''جنت'' سے لایا ہوا اک توشۂ خاص ''میرا کشمیر......میرا عشق!'' پیش خدمت ہے!

(ادارہ)

باب چودہ: ۔تاؤ بٹ ! اور عورت راج

ہمیں انتہائی قلق تھا کہ جو تاؤ بٹ اس سارے دشوار مگر دلکش سفر میں ہمارا مطمع نظر رہا تھا۔ ہمارا اصل 'مطلوب' تھا...... ہماری منزل مقصود تھا۔ یوں لب جُو آ کر ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا۔

مگر ہم نے صرار نہیں کیا۔ دل کے ارمانوں کو کچلا اور سفر کے رہنماؤں کے عذر یا شاید ''عذرلنگ'' پر سر جھکا دیا۔ جس سے وہ کافی خوش تھے اور جابجا ہمارے لیے رطب اللسان تھے اور ہمیں بطور مثال دوسروں کے سامنے پیش کیا جارہا تھا۔ ''تعاون' تہذیب اور زندہ دلی کے شاہکار لاہوری'' ہمارے لیے یہ تمغہ حسن کارکردگی برائے دورۂ نیلم بھی شاید ناؤنس ہوجاتا۔

مگر ایک خاص گروہ بضد تھا۔

''تاؤ بٹ نہ گئے تو سب پیسے برباد!'' نجانے ہم سطحی اور اُتھلے لوگ پیسوں کو کہاں سے لے آتے ہیں۔ یہ کمینی اور گھٹیا اصطلاح ہمیں تفریحی و مطالعاتی دوروں میں بھی بار بار سننے کو ملتی تھی خوشحال گھرانوں کے بچے، جب ہر مرحلے پر اپنے اساتذہ کو یا تو دیے گئے پیسوں کا ذکر کر کر کے ناکافی سہولتوں اور اَدھ کچے پکے کھانوں کے طعنے یا اپنی جیب سے روکڑے نکال کر اپنے اضافی خرچے کی دھونس دیتے، فلاں جگہ بس روکیں، فلاں برگر لینا ہے۔ یہاں کوچ روکیں ٹھکاں پیزا لینا ہے۔ یہاں کیل کی خانماں خراب آبادی میں بھی یہی صورت حال تھی۔ یہاں اس خاص گروہ نے ''پریشر گروپ'' بنالیا تھا کہ ہر صورت میں تاؤ بٹ جائیں ہی جائیں۔

''ٹھیک ہے'' جوابی کارروائی میں چودھریوں کی جانب سے بھی حتمی دھمکی دے دی گئی۔ ''اپنے بل بوتے یعنی رسک اور جیب کے بل بوتے پر چلے جائیں۔ ہم اتنے بجے روانہ ہوجائیں گے۔ اگر آپ واپس آگئے تو ٹھیک ورنہ اپنے بل بوتے پر واپس اسلام آباد چلے جایئے گا''۔

''ٹھیک ہے، پریشر گروپ بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ گرما گرم مذاکراتی ٹاکرہ کر رہا تھا۔ ''آپ جیبوں کے پیسے بچا کر بے ایمانی اور دھوکا دہی کا مظاہرہ کریں، ہم تاؤ بٹ جا کر دکھائیں گے''۔

''تاؤ بٹ ! زندہ باد'' نعرہ لگا۔

''تایا بٹ!'' کسی پنجابی کے ہاتھوں نعرہ بگڑا ''زندہ باد'' اور پھر جب تایا بٹ کے عاشقین رختِ سفر باندھ رہے تھے تو اصل شائقین بلکہ عاشقین منہ بسورے، دل مسوس کر سوئے شاردا کو پر تول رہے تھے۔

بعدازاں...... جب وہ لوگ لوٹ کر آئے تو تاؤ بٹ کی ایسی تصویر کشی کی کہ بہت سے جان گئے کہ اُن کا بھلا ہی

ہوگیا جبکہ چترال کے نزدیک وہاں بڑی زبردست کشش تھی اور وہ تھی وہاں کا ''عورت سماج'' یا شاید ''عورت راج''
......تاؤبٹ کہ جہاں نیلم اپنے وسیع ترین پاٹ اور کئی شاخوں میں بٹے دھاروں کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوتا
ہے۔اپنی دریادلی اور خوبصورتی کے نکتہ عروج پر ہوتا ہے......وہاں اس دنیا کی قدیم ترین تہذیب سانس لیتی ہے۔

جب جنگلوں میں مارے مارے پھرنے والے جانوروں جیسے مرد انسان عورت کی وجہ سے ''آبادی'' کا مفہوم جانے اور لور لور پھرنے والوں انسانوں کو ''مرکز'' ملا تو وہ تہذیب آشنا ہوگئے تھے تب عورت کا ہی سماج تھا۔اُس کا راج تھا۔ وہ سماجیات اور آبادیات کا مضبوط استعارہ تھی۔ مرد، بیل، ڈھورڈنگر اور اُن کی مدد سے پھر کھیتی باڑی۔ایک طرف بیل اور دوسری طرف مرد کو جوت لیتی تھی۔ مذکورہ بالا تمام ''اشیاء'' اس کی ملکیت تھیں اور وہ اناج اُگانے اور اُسے کھیتی باڑی تک لے جانے کی موجد تھی۔

''تاؤبٹ''......آج بھی اُس تصور کی تصویر دلکش ہے۔ ہزار ہا برس پرانا یہ سماجی نظام ہلکی سی ردوقدح کے ساتھ وہاں رائج ہے۔گوکیل میں اس نظام کی باقیات اور بُو موجود تھیں۔ یہاں تہاں سب امور زیادہ تر عورتیں ہی انجام دے رہی تھیں......مگر یہ نظام اپنی تمام لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ تاؤبٹ میں موجود ہے۔ جہاں قدرت کے تمام قدرتی رنگ تو موجود ہیں ہی مگر ''وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' کچھ زیادہ ہے۔ یہ رنگ ڈھنگ یوں کچھ اور رنگ جماتے ہیں کہ وہ دنیا کے اس بلند ترین ہمالیاتی سلسلے کی گود میں تمام کے تمام گھریلو، معاشی اور سماجی امور انجام دیتی ہے۔''یار! میں بھی تو تاؤبٹ کی بچھڑی ہوئی کوئی کونج تو نہیں؟'' سنتے ہی میں کرلائی تھی ''یہ سارے کام تو میں بھی لاہور میں رہ کر، کر رہی ہوں''۔

''اور میں بھی'' ایک اور زنانہ شگوفہ پھوٹا۔''اور سوال تو یہ ہے کہ آخر کون نہیں؟'' میرا فلسفہ جاری رہا۔''کون ورکنگ لیڈی ان امور سے مبرا ہے؟''۔''خیر......ہمیں تو کتے نے کاٹا تھا کہ ہم نے خود اوکھلی میں سر دے لیا اور ''آزادیِ نسواں'' کی علمبردار بن گئی ہیں۔کس نے کہا......!''

''کسی نے نہیں کہا'' ''ایک حتمی دلیل آئی تھی'' آج کے بدلتے دور میں یہ ہماری ذمہ داری بن گئی ہے۔ہم شوق سے نہیں، ذمہ داری سے باہر نکلتے ہیں اور اس تلخ زندگی کی کڑواہٹ سہتے ہیں''۔

خیر تاؤبٹ میں تو یہ سب کچھ، صدیوں سے جوں کاتوں چل رہا ہے کسی زمانے میں یہاں رانی کی ایک فلم ''عورت راج'' سینماؤں میں لگی تو ایک کھڑکی توڑ رش لیا تھا اور دوسری طرف مرد مار معاشرے نے اس کی خوب کھڑکیاں توڑیں۔ پتھراؤ کیا تھا......اور بالآخر ''عورت راج'' کو سینماؤں سے اُتار لیا گیا۔

مگر تاؤبٹ میں عورت راج ہے۔ ہاں صدیوں زدہ اور جدید دور کے عورت سماج میں واضح فرق آگیا ہے۔اب تاؤبٹ کے مردوں کے ہاتھوں میں موبائل فون ہیں اور بوڑھی عورتیں ''انٹرنیٹ'' کی بات کرتی ہیں۔ ہوا بدل گئی ہے اور ہوا لگ گئی ہے۔

مگر تن آسانی اور سہل پسندی کے اپنے مزے ہیں۔سو مرد اپنے سماجی استحقاق کو نہیں چھوڑتے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر چارپائیاں توڑتے رہتے ہیں۔

''پارٹی ٹائم لائف اسٹائل''

جیسے یہاں لاہور میں جھگیوں میں، مردوں کی زندگی بڑی مست ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر، چارپائیاں توڑو۔ کام کرنے والی ماں، بہن، بیٹی، بیوی سے پیسوں کو بٹورو اور نہ دیں تو اُن کی ہڈیاں توڑ دو۔

البتہ...... فریضہ اُن کا بس ایک ہے۔ ذمہ داری بس ایک...... بچے پیدا کرنے کا جانوروں جیسا کوئی ''غیر انسانی وسیلہ قدرت'' بننے کا فرض۔

ایسے ''ذمہ دار مرد'' ہمارے اس گنگا جمنی معاشرے میں کچھ زیادہ نہیں ہوتے جا رہے؟

تو کیا تاؤ بٹ کا نظامِ زندگی...... سارے سماج پر پھیل جائے گا۔

یہ وہ تاؤ بٹ تھا جو میرے اُس سماجی و تہذیبی ناول ''آوارگی'' کا کلائمکس مقام تھا۔ اُس ناول میں مرکزی کردار میر طارق مصطفیٰ جو حال کا استعارہ تھا اور اپنے ماضی، اپنے آباؤ اجداد کی تہذیبی جڑیں کشمیر میں تلاشتا تھا۔ اس ناول میں رنجیت سنگھ کی ''رجیم'' (عہد حکومت) کی جڑیں بھی تلاشی گئی ہیں کہ جب یہ بے مثال خطہ کشمیر اور پنجاب کے درمیان حد نہ بانٹتا تھا...... ناول ''آوارگی'' کئی ماہ تک پاکستان کے مشہور ڈائجسٹ ''سیارہ'' میں، چھپتا رہا تھا۔ یہ 08-2007 کی بات ہے۔ اس رام کہانی کا یہاں خاص مقصد یہ ہے کہ ''تاؤ بٹ'' میری اس تہذیبی تلاش کی ''حتمی منزل'' ہی نہ تھا بلکہ بطور ناول نگار اس ناول، اس کے مرکزی خیال نے اس کے کرداروں نے میری رگوں سے جنم لیا تھا۔

یہ تلاش' میرے خود کے اندر ہلکورے لیتی تھی تو ایسی تشنگی میں کیل سے ہی لوٹ جاتا، میرے کتنے ہی خوابوں کا خون تھا؟

میں نے دل گرفتہ انداز میں تمام سیاحین پر نظر ڈالی۔ خصوصاً لاہوری پارٹی پر...... ہم میں سے کتنے ہیں؟ جو کبھی لوٹ کر یہاں آئیں گے۔

اور کبھی آئیں بھی تو اِن مقامات پر اُنہی لوگوں کے ساتھ ہوں گے؟ کبھی نہیں...... ہرگز نہیں۔ کم از کم دوسرے تو ایسے تھے جو شاید ہی کبھی یہاں آئیں۔ ایک تو ہماری چھینا مینا جوڑی۔ جو شاید ہی اب کبھی لاہوری مہم جوؤں کی ہمرکاب بنیں۔ انہیں اب اپنے اپنے پیاؤں کے گھر سدھارنا تھا اور وہ گھر لاکھ سکھ دیں۔ بن بیاہی زندگی کی بے فکری کا سکھ کبھی نہیں دیتے...... اور مہم امید کا دوسرا سرا میں تھی۔ جو عمر کے اس حصے کو آ گئی تھی اور جسے ذہنی انتشار نے یوں توڑ پھوڑ دیا تھا اور جس سے آرتھرائیٹس کے سبب جوڑوں کا عذاب اب سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا (میں نظاروں میں کھڑی ہو کر، انہیں چھونے کی سکت نہ پاتی تھی، جیسے کرسٹل آبشار پر ہوا تھا۔ جیسے نیلم کنارے 'آسن پتھروں' پہ میں اسی اَن چھوئی کیفیت میں رہی۔ جیسے شونٹر نالے کی وہ سیڑھیاں میں نہ اُتر سکی تھی۔)

جس پر سعدیہ' طاہرہ' ثمن اور نادیہ قلانچیں بھرتی اُتر گئی تھیں اور شہزادی نے اپنے دلکش پوز کے ساتھ 'خصوصی تصویریں' اُتروائیں تھیں۔

میں ان منظروں اور راحتوں کو نظروں سے چھوتی تھی مگر انگلیاں اَن چھوئے کرب سہتی تھیں۔ سوئی خوب جانتی تھی کہ یہ ''جہانِ خوش نما...... جس میں زندگی کی قلقاریاں ہیں'' مجھ پہ اپنے دروازے بند کرنے کو ہے۔ تو کیل سے وقت رخصت میں دل گرفتہ تھی اور منظروں کو یوں تکتی تھی جیسے کوئی ماں' اپنے اکلوتے بیٹے کو محاذ پر بھیجتے وقت

سیارہ ڈائجسٹ کا عظیم الشان نمبر
رسول نمبر صلی اللہ علیہ وسلم
کا نیا ایڈیشن ضروری ترامیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز
حسین و جمیل سرورق
بے شمار نعتوں کا انتخاب
عکسی طباعت
ہر جلد کے پانچ سو صفحات
2 جلدوں پر مشتمل
دنیائے اسلام کے اہل علم کے رشحاتِ قلم کا مجموعہ
قارئین حضرات اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں
مکمل سیٹ -/350
فی جلد -/175
منگوانے کا پتہ
سیارہ ڈائجسٹ، 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

الوداعی رخصت دینا ہے۔

باب پندرہ:۔ کیمسٹری ٹیچر کی مسٹری

مگر ہماری ''سیاحتی پارٹی'' کے دولوگ اپنے عروج پر تھے اور حد سے زیادہ مسرور۔
ایک تو ہماری شہزادی جمیلہ اور دوسری سرور ونگ کی ''مائی باپ'' سعدیہ سرور۔
سعدیہ سرور نے جتنا شور اس ٹرپ کی خاطر مچا رکھا تھا اس کا عشر عشیر بھی گزشتہ دنوں کہیں نظر نہ آیا تھا۔ ان دو، ڈھائی دنوں میں وہ ممتا اور خوف میں اس قدر دبک کر بیٹھی تھی اور اپنے تمام سرور ونگ کو بھی حسب ضرورت ٹینگ اور خوف بانٹ رہی تھی۔ اب کیفیت کا خول توڑ کر باہر نکل رہی تھی۔ اپر نیلم میں اُس نے اس تڑشے خول سے ہلکا سا سر باہر نکال کر'' جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا'' اور پھر بقیہ رستہ بھٹکنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

اب پتہ نہیں یہ کیل کا کمال تھا یا کرسٹل آبشار کے معجزوں کا اثر۔ وہ قدرے خوش اور کھلی کھلی پھر رہی تھی اور اُس پر یہ کہ کھلے گلاب کا اثر بھی پہن لیا تھا بلکہ ''زیب تن'' کیا تھا کیونکہ وہ اُسے زیب دے رہا تھا۔ اور ہم چاروں کا کیل، شاردا، تقسیم کلر' گلاب اور گلابی ہی تھا اور اب وہ بڑھ چڑھ کر تصویروں میں اپنا حصہ وصول کر رہی تھی بلکہ بعض دفعہ تو خراج بھی لیتی کہ میری بھین دا حصہ وی دیو''۔
الغرض...... اُسے کیل، گاؤں کی مسموم فضائیں راس آ گئی تھیں۔

''سعدیہ! سارا رستہ تو، تُو نے ہمارا ''تراہ کاڈ'' دیا تھا؟'' گلابی اُردو پنجابی ہمارا اِس مہم کا خصوصی ماٹو یا سلوگن تھا۔ وہ خوب کھل کر ہنسی اور پھر وضاحت پر اُتر آئی ''وہ مس فرخ! میں بہت ڈر گئی تھی، پورا رستہ سہم کر بیٹھی رہی ہوں''۔

''اس بریکنگ نیوز کا شکریہ!'' ہم نے چھیڑا ''ہم نے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پہاڑوں کی خوبصورتی بھی اور تمہارا پیلا پھٹک چہرہ بھی۔ ایک طرف نادیہ کو قلاوے میں بھر کر کندھے سے لگا رکھا تھا تو دوسری طرف دونوں برادرانِ خورد کو TANG پلا پلا کر کئی ریکارڈ بنا چکی ہو''۔
وہ کھل کر ہنستی چلی گئی۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی ہنستی تھی اور تروتازہ حلیے میں تازہ جھونکے کی طرح یوں سٹاف روم میں داخل ہوا کرتی تھی کہ جیسے قدرت نے اسے دنیا کو شاداب رکھنے کی ساری ذمہ داری دے رکھی ہو۔ مجھے ہمیشہ اس کی انٹری سے پہلے ہی ہوائیں خبر دینے آجاتیں کہ مس فرخ! سعدیہ آ رہی ہے۔
یہ وہی سعدیہ سرور تھی جس نے سیاحتی مہم کے اک نازک موڑ پر، بڑے دبنگ انداز میں کہہ دیا تھا۔
''اگر کوئی بھی نہ گیا تو بھی میں اکیلے ہی چلی جاؤں گی'' اور اب یہ بلند و بالا ہیبت ناک دیوہیکل پہاڑ تھے اور اس کے اونچے نیچے راستے کی وہ ناموافق سڑک...... سو سعدیہ کا پتہ پانی ہوتا رہا کہ ایک تو وہ سرور ونگ سے ہمراہ ساتھ لے کر ساری ذمہ داری ساتھ لے آئی تھی اور پھر مظفر آباد کے بعد، نیلم میں داخل ہوتے ہی باقی دنیا سے رابطے کٹ گئے تھے۔
''اور کٹے رابطوں میں باہمی ذمہ داریاں...... ہمیشہ بڑھ جاتی ہیں وہ بھی بڑھی ذمہ داریوں کے گھیراؤ میں تھی۔

اُس پر سرور ونگ کی بڑی باجی...... گویا بنی بنائی چھوٹی امی ۔ سوکیل گاؤں میں چھوٹی امی نے حفاظتی ونگ کھول کر، اپنے سب بچوں کو آزاد کر دیا تھا اور وہ خود مختار سے اِدھر اُدھر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ثمن مسعود اور نادیہ سرور کی منظر کش فطرت نے میل کھا کر اپنی چھینا مینا جوڑی بنالی تھی۔ سعد رحمان اور محسن سرور اِدھر اُدھر پہاڑوں کی کھوج میں کھوؤں کے اندر کی تصویریں بنا رہے تھے۔ گھوڑوں سے راہ و رسم بڑھا رہے تھے۔ پہاڑی کھیتوں میں دھما چوکڑی جاری تھی اور ہم انہیں ریسٹ ہاؤس کی کھڑکیوں سے دیکھ دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوتے۔ حسن سرور، اس ونگ کا ذمہ دار اور سنجیدہ نوجوان، بڑی ذمہ داری کے ساتھ ہم سب کے ''ساتھ'' تھا۔

اس لیے...... اب سعدیہ سرور بھی بکریوں اور پہاڑی ٹٹوؤں کے ساتھ اپنی تصویریں بنوا رہی تھی اور بتیس دانتوں کے ساتھ خوش نظر آتی تھی۔

یہی وہ جادوائی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ مجھے انسپائر کرتی آئی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا جزو لاینفک تھی۔ اور اک گزشتہ ٹرپ میں بھی، اسی مسکراہٹ کے ساتھ، وہ پتے پتے، بوٹے بوٹے یہاں تک ''مشک پوری ٹریک'' (گلیات مری) کی برف باری سے لطف اندوز ہوتی تھی۔

مگر سعدیہ سے میری 'میچنگ' کی کئی وجوہات تھیں۔ عمروں کے ڈبل تفاوت کے باوجود۔

وہ سائنس ٹیچر ہوتے ہوئے بھی اور غیر ادبی نسل کی نمائندہ ہونے کے باوجود بہت ہی اعلیٰ ''ادبی ذوق'' کی مالک تھی۔ کیمسٹری نوجوان ٹیچر کی اس ''ادب شناسی' پر ہمیشہ میں حیران ہی ہوئی۔ ادب سے بھی زیادہ اُس نے مذہب اور اخلاقیات کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہے اور پھر غضب کی یادداشت، جب حوالے دیتی اور اقوال سناتی تو میں جو کتابی کیڑا ہوں اور کتابیں ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہیں اُس سے بہت متاثر ہوئی۔

جب وہ کبھی، عمروں کے تفاوت کے باوجود، میرے پاس آبیٹھتی تو دل چاہتا کہ وہ بولتی رہے اور میں سنا کروں۔ ہم خوب کھل کر باتیں کرتے، ذہنوں کے درمیان کوئی خلا کوئی دراڑ نہ تھی۔

یہاں تک کہ ہم دل کی باتیں بھی کر لیتے۔ ذہنی الجھاؤ بھی سلجھانے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھار ذاتی مسائل بھی زیر بحث لے آتے اور ہمیشہ اس باہمی رفاقت سے لطف اندوز ہوتے۔

الغرض...... اس کیمسٹری کی ٹیچر کے ساتھ، میری ''کیمسٹری'' خوب بھی تھی اور زبردست بھی۔ اور پہاڑی راستوں پر بھی عجب اتفاق ہوا اور قدرت کی اک 'مسٹری' ہمیں حیران کر رہی تھی۔ شاردا سے کیل جاتے ہوئے وہ منظر دیکھا۔ جب کوئی منظر چھوڑنے والا نہیں تھا۔ سامنے رتی گلی کی پہاڑیاں، سنہری تاج لیے اپنی جانب بلاتی تھیں کہ وادی نیلم اور وادی کاغان کی یہ شہزادیاں حسن بے مثال کی مالک تھیں۔ گنگناتی وادیاں' بپھرا 'بل کھاتا اژدھا دریا۔ کیا دیکھو اور کیا چھوڑو؟؟ ''وہ دیکھو'' کسی نے نعرہ لگایا ''سب چھوڑو... بس اُدھر دیکھو''۔

کیا دیکھتے ہیں، جون کی پندرہ تاریخ اور برف جمی ایک آبشار...... ایک رُکی ہوئی آبشار۔ جس میں برف جمی تو تھی مگر روئی کے گالوں کی طرح تھی اور پھر جا بجا تھی۔ تیز کوچ سے یہ نظارا کرتے گزرے اور حسرت بھری نظروں

سے پیچھے دیکھتے رہے کہ لوٹیں گے تو یہ برف پگھل چکی ہوگی۔
ایک دن بعد......ہم لوٹے تو منظر جُوں کا تُوں تھا۔ برف ویسی ہی تھی اور ہم اس ''رازِ قدرت'' پر حیراں۔
یہاں یہ سعدیہ سرور ہی تھی جو دُور کی کوڑی لائی اور اپنی کیمسٹری کی زبان میں 'مسٹری' حل کی تھی۔
''دراصل یہ کیلشیم ہے، چونا...... پہاڑوں سے چونا ملا برفیلا پانی بہتا ہے کیونکہ ان پہاڑوں میں چونا پایا جاتا ہے۔ پانی تو بہہ کر نیلم برد ہوا اور کیلشیم اس آبشاری راستے پہ چپکا پڑا ہے''۔
''یہ دس دن بعد بھی...... یونہی ملے گا'' نادیہ سرور بولی جس کی ''اُستادی'' یہ تھی کہ وہ کیمسٹری ٹیچر ہونے کے ساتھ ساتھ علم نباتات میں بھی ید طولیٰ رکھتی تھی۔ اور اس میں باقاعدہ ماسٹر ڈگری لے رکھی تھی......سو اس ٹرپ میں، ابھی میری اور نادیہ کی ''باہمی کیمسٹری'' تو اتنی عمدہ نہ ہوئی تھی۔ البتہ نباتات میں اُس کا کم ہونا اور کشمیر کے نباتاتی حسن نہارنے کا فن، اُس میں کمال تھا۔ تبھی تو اپر نیلم کی سدرہ اور کیل کی کوگو (کوہل) کو دیکھ کر یوں گود لے لیتی تھی جیسے ''گدڑیوں میں لعل'' تلاش کر لیے ہوں۔
تلاش اور کھوج کے اس سفر میں سرور سسٹرز نادیہ اور سعدیہ نے مجھے دو انمول پتھر تحفہ نذر کیے جو نیلم کنارے سے، وہ جوہریوں کی طرح پرکھ کر لائی تھیں۔ ایک میں کیلشیم واضح تھا اور دوسرے میں آئرن۔ وہ دونوں پتھر میرے عجائبات میں بمعہ تاریخ و محبت محفوظ ہو گئے۔
کیونکہ وہ میری محبت میں لائے گئے تھے۔ جن مناظر اور پتھروں کو میں چھو نہیں پائی تھی اب تک اِن پتھروں کی بدولت، کئی بار چھو چکی ہوں۔
اِن......اُن چھوٹے محسوسات کو بھی دل کی گہرائیوں سے چھو لینے والی نادیہ سرور، پتہ نہیں کیوں کہتی ہے کہ وہ اچھے لوگوں کو اپنی زندگی سے گنوا لیتی ہے؟
میرے نزدیک یہ ناممکن بات ہے۔

باب سولہ:۔ سپاٹ آف دی ٹرپ

اپر نیلم سے تاؤبٹ روانہ ہوئے تھے تو کیل جاتے ہوئے شاردا کو ہوائی نظروں سے دیکھا تھا اور بالا ہی بالا گزر گئے تھے یہاں کی فضاؤں میں کچھ تھا جو من کو گرفت میں لیتا تھا اور آنکھوں کو تراوت۔
اسی لیے تو یہاں سے گزرتے، دل بجھ سے گئے۔
اور اب، تاؤبٹ کے سلسلے میں کچھ بجھے تو چودھری قائدین نے ''شاردا روشن'' کی نوید سنائی تھی اور ہمارے بجھے ارمان پھر فروزاں تھے۔
مگر بنجر، ویران اور افلاس گزیدہ کیل کے اِدھر اُدھر چھپے نظارے بھی آنکھوں میں یوں کھب سے گئے تھے کہ پاؤں کی زنجیر ہوتے تھے اور نظریں ہٹ ہٹ کر پلٹتی تھیں۔
واپسی پر وہی جنت نظیر نظارے، کرسٹل آبشار اور بہت سی آبشاریں اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کی دریا کو لڑھکتی عمودی ڈھلوانیں اور اُن میں سے گزرتے گجروں کے قافلے۔ گزشتہ دنوں میں ہم ایسے کئی قافلے دیکھ چکے تھے۔ پہاڑی بکروں کے یہ طویل ریوڑ۔ اس دفعہ میری سیٹ دریا کے رُخ پر تھی اور ایک جگہ بہت بڑا ریوڑ درمیان میں تھا اور

کوچ تھی کہ رینگ رہی تھی مبادا کوئی بکرا بکری یا بچہ کوچ کے نیچے نہ آ جائے۔ اب ایک دفعہ جو، میں نے اُچک کر نیچے جھانکا تو میری سٹی گم میری طرف کے دونوں پہیے نظر نہ آتے اور نہ ہی سڑک اور ڈھلوان نوے درجے کی بجائے 110 ڈگری زاویے کو مڑی بلکہ اندر دھنسی ہوئی تھی۔

گویا آدمی بس فضاؤں میں معلق تھی اور ٹائر شاید کبھی پورے اور کبھی آدھے ادھورے سڑک پر تھے۔

اس پر غضب یہ کہ گجروں کے میلوں لمبے ''بکرا قافلے'' گزرتے تھے اور بکرے اس قدر ماہرانہ انداز میں قلانچیں بھرتے، پھدکتے' اچھلتے یوں گزرتے جیسے یہ پل صراط نہ ہو لاہور' اسلام آباد موٹروے ہو......ایک دفعہ تو میری چیخیں نکل گئیں۔ بکرا پہیے سے بچا اور نیچے لڑھک گیا مگر پھر اگلے ہی لمحے پھدک کر دوبارہ کوچ کے متوازی بھاگ کر، اپنے ریوڑ سے جاملا۔

گجروں کے قافلے سارا سیزن اسی طرح چراگاہوں کی تلاش میں اُترتے چڑھتے سرگرداں رہتے ہیں۔

کیل سے شاردا کا فاصلہ محض انیس کلومیٹر ہے جبکہ مظفر آباد یہاں سے 136 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

جونہی ہم شاردا پہنچے اس کی ٹھنڈی مگر شفیق فضاؤں نے آگے بڑھ کر جیسے کوئی انوکھا ''سواگت'' کیا۔

چودھری برادر ان رہائش کا بندوبست کرنے نکل گئے اور ہم بازار میں کھڑے تھے۔ سو کوچ میں بیٹھے بیٹھے خرید و فروخت کے کچھ امور یاد آ گئے۔ بتایا گیا کہ حسن اچھا فروٹ خرید لیتا ہے اور مناسب داموں میں۔ وہ فروٹ یعنی آم لایا جو واقعی عمدہ تھے مگر دام بھی عمدہ ہی تھے۔ ہاں اس اعتبار سے قابل برداشت تھے کہ پنجاب اور خصوصاً لاہور جیسے معیاری اور معیار فروخت پر آم مل گئے۔ اور یوں نیلم کنارے ہماری ''مینگو پارٹی'' کا ابتدائی اہم مرحلہ ترتیب پا گیا۔

شاردا کا یہ بازار' کیل کے بازار' سے قدرے بڑا اور بارونق تھا۔ اس لیے نادیہ سرور کی جو شاپنگ کیل میں تشنہ رہ گئی تھی وہ اُسے پورا کرنے کے لیے اُتر گئی۔ ظاہر ہے چھینا کے ساتھ بینا نے بھی اُترنا تھا۔ سوثمن مسعود یہ کہہ کر اُس کے ہمرکاب ہوئی کہ شاید یہاں کشمیر کی کوئی ''سوغات'' چیز مل جائے۔ جسے وہ اپنی سہیلیوں کے لیے لے جاسکے۔ واپس آئیں، تو مایوس تھیں، مگر چہروں کی حد تک۔ البتہ ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ تھا۔ جنہیں سکارف کہا جارہا تھا۔ اور وہ سکارف کشمیری نہیں ''کشمیری سفر'' کی سوغات سمجھ کر لے لیے تھے۔ ورنہ لاہور کی ہر مارکیٹ ایسے سکارفوں سے بھری پڑی تھی۔

رہائش کا بندوبست، ہو گیا۔ اُسی بازار میں 'لب سڑک' وہ ریسٹ ہاؤس نما ریسٹورنٹ تھا مگر وہاں ہم اُترے نہیں البتہ کوچز نیچے اُترتی چلی گئیں۔ بالکل نیلم کے کنارے پر جہاں خیموں کی عجب بہار تھی۔

پورا ایک 'کینوس سٹی' آباد تھا۔ جیسے اور تاحد نظر ایسے کئی کیمپ تھے اور دوسرا شہر بھی نیلم کے کنارے کنارے بھی آباد تھا۔ نیلم اس پوری آبادی کو بڑی محبت سے اپنی گود میں لے آیا تھا اور یہاں بھی اگرچہ وہ تھا تو نیلم ہی مگر قدرے پرسکون۔ شاردا سطح سمندر سے 6499 فٹ کی بلندی میں ہے اور طمانیت وسکون کی تمام تر حلاوت کے ساتھ...... یہاں تک کہ نیلم جیسا منہ زور دریا بھی یہاں مؤدب ہو کر، دبے پاؤں گزرتا ہے۔ وہ انسانوں کے درمیان آبیٹھتا ہے کہ آؤ کچھ میری سنو کچھ اپنی سناؤ۔

دریاؤں سے گفتگو کی بھی اک اپنی زبان ہے۔ میں نے اس 'خوبصورت زبان' کا کھوج اُس زمانے میں لگالیا تھا جب ابھی طالب علم تھی۔ اُس لڑکپن میں کتاب 'سدھارتھ' ہاتھ لگ گئی۔ کیا غضب کی تاثراتی کتاب تھی۔ جو کپل دیو عرف شہزادہ سدھارتھ المعروف مہاتما کی متلاشی نروان کھوج سے خیال لے کر علامتی انداز میں لکھی گئی تھی۔

اور جس کا مرکزی کردار اسی طرح سکون اور نروان کی تلاش میں جنگل، جھیلوں' جھرنوں اور دریاؤں کے ساتھ ساتھ بھٹکتا پھرتا تھا۔ فطرت سے گفتگو کرتا تھا۔

اور پھر دریا کنارے آسن جمائے بیٹھ گیا۔ وہ دریا سے گفتگو کرتا تھا اور دریا اس کی دلی زبان سمجھتا تھا کیونکہ اس گفتگو میں وہ محض سامع ہوتا تھا "A good listner"۔ یہ محض 'سماعت' رکھنا۔ دوسروں کو بس سننا، اپنے افلاطونی مشوروں کے بغیر سننا۔ دوسروں کو اہمیت دینا اور اپنا آپ اور اپنی ہی بات دوسروں پر نہ ٹھونسنا میں نے 'سدھارتھ' نام کی کتاب سے ہی سیکھا۔

اور جو سدھارتھ تھا...... اصل سدھارتھ یعنی 'بُدھا' ...... وہ واقعی مہاتما تھا۔ شاردا آتے ہی اُس کی روح، اُس کا جمایا آسن اس کا پایا ہوا وہ نور محسوس ہو رہا تھا۔ شانتی، امن و آشتی۔ دلوں پر کنداں اس کی تعلیمات ...... یہاں سب کچھ کتنا جاذب نظر تھا؟ میرے ابا جان بچپن میں مجھے بتاتے تھے (جب ہم باپ بیٹی ڈھیروں گفتگو کرتے تھے) کہ بعض محققین کے نزدیک بدھا بھی کوئی پیامبر تھے۔ قرآن مجید میں جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا کہا گیا ہے تو کیا پتہ کون پیغمبر تھا۔

یہ تو اُن کے ماننے والے تھے جنہوں نے اُن کے بت بنائے یا انہیں اوتار سمجھا یہاں تک کہ انہیں خدا بھی مان لیا اور ہم بھی اس شاردا گاؤں کو مان گئے تھے۔ اُس عظیم صانع کی عظیم کاریگری کتنے سکون کے ساتھ ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور اس خیمہ بستی کی اپنی اک کشش تھی۔

حالانکہ 'کینوس سٹی' کی اپنی کوئی غلش ہے وہ کینوس سٹی جو شمالی علاقہ جات میں تب بستے ہیں جب یہاں فوجی آپریشن ہوتے ہیں تنی آبادی' خانماں خراب' ہو کر ان میں بستی ہے اور غربت و مصائب کے پنجے انہیں مزید جکڑ لیتے ہیں۔

پھر انہی علاقوں میں اکتوبر 2005ء کے بعد ...... جو 'کینوس سٹی' آباد ہوئے اُن کے آس پاس کیسی کیسی دلخراش داستانوں نے جنم لیا؟ کن کے مصائب دکھائے گئے اور کل دنیا سے بھیجی جانے والی امداد ڈکار کون گئے؟

اور پھر وہ اک کینوس سٹی ...... جہاں انہی خیمہ بستیوں میں نسلیں پیدا ہوتی ہیں اور اپنے بچپن، لڑکپن، نوعمری، نوجوانی، جوانی، ادھیڑ عمری اور کہیں خال خال بڑھاپے میں، قربان ہو جاتی ہیں۔ جیسے آج کل GAZA پٹی ... سے زیادہ "غزہ کی پٹی" کہہ لیا جاتا ہے۔ یہ مقدس سرزمین جو فلسطین تھی اور جس کی کمر میں اسرائیل کا چھرا گھونپا گیا۔

برسوں سے مدقوق ... ہوتا جا رہا ہے۔ یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے سنگم پر یہ اہم ترین فلسطین،

ایمان افروز .... عقل پرور .... عمل آفرین
سیارہ ڈائجسٹ
کا عظیم الشان
قرآن نمبر
قارئین کے اصرار اور مانگ کے تحت دس سال کے بعد نیا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔
☆......دائمی اہمیت اور افادیت کا حامل ☆......ایک متاع بے بہا
☆......ایک دستاویز ☆......اعلیٰ رنگین طباعت
☆......ضخامت 1500 صفحات ☆......تین جلدوں میں
اپنی خدمات، مصنوعات کا اشتہار جلد جاری فرمائیں
اشتہارات دینے کی آخری تاریخ 30 مئی 2013 ہے
مکمل سیٹ قیمت -/525
قارئین کرام براہ راست بذریعہ منی آرڈر یا وی پی قرآن نمبر منگوا سکتے ہیں
سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن، لاہور
فون: 3724512

سیارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

قرآن نمبر

ایمان افروز، عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش
(تین جلدوں میں قیمت: 525روپے)

اولیائے کرام نمبر

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں
(چار جلدوں میں۔ قیمت 700روپے)

فرمانِ رسولؐ نمبر

عاشقانِ رسولؐ کی خدمت میں ایک
بے مثال تحفہ (قیمت 175 روپے)

ازواج مطہراتؓ نمبر

امہات المومنین کی پاک زندگی کے واقعات، جو آج
تک ایک جگہ اکھٹے نہ کیے جاسکے (قیمت: 200روپے)

قرآنی وظائف نمبر

ہماری آپ کی اور ہر گھر کی پریشانیوں الجھنوں، مشکلات
کے حل کیلئے وظائف (قیمت 175 روپے)

اسلامی احکایات نمبر

دلچسپ اور پر اثر طرز تحریر میں قوت ایمانی سے سرشار
سبق آموز حکایات کا مجموعہ (قیمت: 175روپے)

توبہ نمبر

توبہ اللہ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے، سنہرے واقعات
سے مزین توبہ کے آداب و فضائل (قیمت 175 روپے)

شرعی احکام نمبر

عبادات سے معاملات اور معاشرت سے لیکر
سیاسیات تک مکمل ضابطہ حیات (قیمت 175روپے)

رسول ﷺ نمبر

سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز
(دو جلدوں میں۔ قیمت 350روپے)

عکس سیرتؐ نمبر

حضرت محمد مصطفیٰؐ کی حیات طیبہ پر مبنی مقدس اور نایاب
کتاب (قیمت 275 روپے)

خلفائے راشدینؓ نمبر

اسلام کی سربلندی کیلئے خلفائے راشدین کی
بے مثال قربانیوں کا ذکر (قیمت 175 روپے)

انبیائے رسولؑ نمبر

پیغمبرانِ خدا کی حیات طیبہ جاوداں کے
روح پرور تذکرے (قیمت 175 روپے)

معجزات رسولؐ نمبر

سرور کونین کی زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونیوالے
سینکڑوں معجزات پر مشتمل دستاویز (قیمت 175روپے)

صحابیاتؓ نمبر

100 سے زائد صحابیاتؓ کا تذکرہ جنہوں نے
رسول اکرمؐ سے بیعت کی (قیمت 175 روپے)

حج عمرہ اور زیارات نمبر

حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں اہم
مقامات کی نشاندہی اور روڈ میپ (قیمت 175 روپے)

لازوال اسلامی واقعات نمبر

رسول خدا، خلفاء راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور صالحین کی
زندگیوں کے ایمان افروز واقعات (قیمت 175 روپے)

آثارِ قیامت نمبر

قرآن و حدیث کی روشنی میں علامات قیامت، روز آخرت
اور حیات بعد از موت کا احوال (قیمت 175 روپے)

اخلاق رسول ﷺ نمبر

حضور ﷺ کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ
واقعات پر مشتمل دستاویز (قیمت 175 روپے)

صحابہ کرامؓ نمبر

ان عظیم ہستیوں کی کہانی جنہوں نے رحمت العالمین
کی معیت میں زندگی بسر کی (قیمت 175 روپے)

فہم دین نمبر

سماجی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل
قرآن و حدیث کی روشنی میں (قیمت 175 روپے)

دعا نمبر

دُعا تقدیر بدل دیتی ہے
حدیث رسولؐ (قیمت 175 روپے)

قصص القرآن نمبر

ان واقعات کا مجموعہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ اور
اسکی امت کو بتانا ضروری سمجھے (قیمت 175 روپے)

حقوق العباد نمبر

حقوق و فرائض انسانی بیان کرتا مجموعہ جس پر عمل کر کے
ہی سچا مسلمان بنا جاسکتا ہے (قیمت 175روپے)

والدین نمبر

والدین کے فضائل، حقوق اور فرائض آشکار کرتی تاریخی
دستاویز۔۔۔۔ ہر گھر کی ضرورت! (قیمت 175روپے)

جو ''نبیوں کی سرزمین'' ہے۔ آج صرف اور صرف 'کشت خون وخرابہ' ہے۔
تیرہ صدیوں سے جہاں فلسطینی آباد رہے وہاں تین نسلوں سے یہی خیمہ بستیاں ہیں۔ یہ ''کینوس سٹی'' اور اس میں اپنی بچی کھچی پہچان کو ڈھونڈتے نہتے مگر لڑتے بھڑتے فلسطینی۔ جو کئی برسوں سے بس لڑتے جا رہے ہیں۔
اکیس سال پہلے 1993ء میں جب میری کتاب "PEARLS OF A PRINCESS" چھپی تو اُس کے صفحات 144 اور 145 اس تلخ سچ کو اگلتے ہیں، کتاب کی مذکورہ شاعرہ لکھتی ہے (ترجمہ)

میں 'بے چہرہ آدمی' (بے نام ونشاں فلسطینی) دنیا بھر میں گھومتا رہا۔
اور مجھے احساس تک نہ ہوا کہ
میرا چہرہ 'زندہ' نہیں
میرے نقوش تو اُس دن ''اُگے''۔
جب جون کی گرمیوں کی وہ ایک رات تھی
جس کا کوئی چاند نہ تھا
یہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی
میں اس سے بھرپور نفرت کروں گا
اور پھر.....ٹوٹ کر محبت کروں گا
یہ وہ رات تھی جب میرا ملک
مجھ سے ''چوری'' کرایا گیا،
اُسی رات نے..... مجھے میرے نقش دیئے''۔

کچھ آگے چل کر وہ پہچان اور کھوج کی راہ پر چلنے والا نمائندہ فلسطینی کہتا ہے کہ کیوں وہ ''بے چہرہ'' تھا۔

''بیس سال پہلے،
میں اک کیمپ میں پیدا ہوا
میری پیدائش کے وقت، کوئی لیڈی ڈاکٹر نہ تھی۔
ہمارے ''کینوس سٹی'' میں
زندگی اور موت کا یکساں مقدر ہے
سو، میں اپنے پیارے باپ کی بانہوں میں پیدا ہوا
اور اُس نے، میرے ناتواں پھیپھڑوں میں
زندگی کی 'پہلی سانس' بھری۔
میری ''پہلی چیخ'' اُس نے سنی۔
اور میرے سینے کو بوسہ۔
پھر ہاتھ اٹھا 'دعا' کے لیے

خدایا! میرے بیٹے کو
ان ''خیموں کی زندگی'' سے بہتر زندگی دے۔

باب سترہ: ۔ بدھا کا نیلم کنارے آسن......''شاردا''

اور اب بحیرہ عرب سے ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر دنیا کی خوبصورت ترین وادی......نیلم میں ہم اُسی نیلم کے بالکل کناروں پر خیمہ زن تھے اور یوں خوش تھے کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت یکا یک ہاتھ لگ گئی ہو۔ ہماری پوری سیاحتی ٹیم کو مختلف خیمے الاٹ کردیئے گئے تھے۔ یوں لاہوری پارٹی جو دس نفوس پر مشتمل تھی۔ اُسے قدرے بڑا خیمہ عطا کیا گیا۔

اندر نرم گرم عمدہ بچھونے اور دبیز رضائیاں موجود تھیں، شوخ وشنگ رنگوں میں۔

اور میری جانو بیٹی یہاں بھی میرے لیے پریشان تھی۔ ''ماما! آپ کیسے بیٹھیں گی؟ آپ نیچے لیٹیں گی کیسے؟'' وہ خوب جانتی تھی کہ اندازِ نشست وبرخاست اور طریقۂ استراحت میں میرا خاص نخرہ بھی ہے اور نخرے سے کہیں زیادہ مجبوری بھی۔

میں جو گزشتہ پندرہ سال سے ......آلتی پالتی مار کر بھی بیٹھ نہ سکی تھی۔ زمینی نشست اور محمری بستروں کا لطف بھول چکی تھی۔ اس خیمے میں نرم رضائیوں کی مدد سے ایک لڑھکنی ماری اور چاروں شانے چت یوں لیٹ گئی کہ برسوں سے اسی اُمید کو لیے بیٹھی تھی۔

اور یہی وہ نازک نکتہ تھا جو میری 'ہردم...... ہم دم' بیٹی نے اپنا یونیورسٹی کا شاندار 'ٹرپ برائے ہنزہ وادی' کینسل کردیا تھا اور خواری اٹھانے میرے ساتھ ساتھ آ گئی تھی۔

یہی وہ جانکسل مرحلہ تھا......جس کی خاطر میرے مرحوم بھائی کی بیٹی تعبیر اطہر نے ٹیکسٹ کرکے اُسے ڈرا مارا تھا۔ ''ثمن! پھپھو کو نہ جانے دو اور خدا کی قسم، وہ کیمپنگ تو بالکل بھی نہیں کر پائیں گی'' وہ کبھی کبھار تو بالکل میرا ''بھاؤ'' بن کر، میرا سوچتی تھی۔

مگر میں، یہ ناممکن 'مرحلہ اس شاردا کے کیمپ میں سر کرچکی تھی۔ اور ثمن ابھی تک سر پکڑے بیٹھی تھی یہاں تک کہ شہزادی جمیلہ خیمے کا پردہ اٹھا کر، اپنی نزاکت اور تروتازگی کے ساتھ رونق افروز نہ ہوگئی۔
اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

دالوں، مرغیوں کے بعد......کھانے میں آج 'بکرے' کا خصوصی اہتمام تھا جسے کیل سے ہی خریدا گیا تھا اور ''بکرا و باورچی'' ہمارے ساتھ ہی آئے تھے سو بکرا تو ''گل'' رہا تھا مگر ہم لاہوریوں کی نیلم کے پانیوں میں ''مینگو پارٹی'' تھی۔

اور وہ جگہ ''سپاٹ آف دی ٹرپ'' تھی فضائیں ہماری آمد پر مسرور تھیں۔ اور پورا ماحول مہمان نوازی کے تمام تر تقاضوں کے ساتھ گرم جوش تھا۔ میں جب ''مینگو پکنک سپاٹ'' پر پہنچی تو ہمارا کورم پورا تھا بلکہ نسیم چودھری بھی موجود تھیں اور بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد والی فیملی بھی۔ ایک نیٹ نما شاپر میں آم ڈال کر نیلم کے حوالے کردیئے گئے تھے۔

''لو بھئی! اسے ٹھنڈا کردو ذرا''

ہم بے فکر تھے کہ ایک بڑی سی سوٹا نما لکڑی اُس جگہ گھونپ دی گئی جہاں ہم سب بیٹھے ہوئے تھے اور آموں کا لفافہ ایک سرے سے اُس کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ کچھ لوگ آموں کو گرسنہ نظروں سے دیکھتے۔ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی؟ حالانکہ ہم یہ آم لاہور سے تھوڑی لائے تھے ادھر بازار سے ہی تو لیے تھے اور بازار کونسا دُور تھا۔ پندرہ بیس قدم دوڑ کے جاؤ اور جتنے مرضی خرید لاؤ اور پھر خوب جی بھر کر ٹھنڈا کرو۔

''تو بھئی! آنکھوں میں یہ تشنگی اور گرسنگی کیوں آخر؟ میں نے اس گرداگرد ماحول کو دیکھا اور بچوں سے چند ''آموں بھری یادیں'' شیئر کیں کہ بچپن میں، میں نے کس طرح آموں کے باغوں میں دن گزارے ہیں۔ گاؤں کے نمبردار نانا کی وجہ سے سارے باغوں میں بے دھڑک گھس جاتے تھے۔ جن میں زیادہ تر باغ نانا کی ہی ملکیت تھے۔ وہ پکے آم درختوں سے ''خود'' توڑنا ...... وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بہتی ''آڑیں''۔ اُن میں پاؤں ڈبو کر بیٹھنا اور آموں کا ٹھنڈا کرنا پھر ٹھنڈے آموں کو لے کر، اوپر آم کے درختوں پر چڑھ جانا۔ اوپر ہی اوپر نرم کچی ٹہنیوں میں نرمی نرمی سے بیٹھ کر اُس ٹرین کا انتظار کرنا جو لاہور سے فیصل آباد اور فیصل آباد سے لاہور کو گزرتی۔ سانگلہ ہل اور سالارروالا (دارالاحسان) رُکتیں تو میلوں دُور سے ہمیں وہاں اُن آم کے پیڑوں کی چوٹیوں سے نظر آجاتی تھیں ...... ہم آم چوستے رہتے، ساون کی گھٹائیں جھومتی رہتیں، مستانہ فضائیں گدگداتی گزرتی جاتیں اور آج اُن خواب اور مہتاب فضاؤں کے بھولے بسرے لمحوں میں سے، اختر شیرانی کا یہ بند ہی دل کا ترجمان بن کر رہ گیا ہے......!

کیا آم کے اونچے پیڑوں پر
اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟
شاخوں کے حریری پردوں میں
نغموں کے خزانے گھولتے ہیں؟
ساون کے رسیلے گیتوں سے
تالاب میں ''آمرس'' گھولتے ہیں؟

اِدھر شاردا میں......نیلم کنارے......!

ہمارے آم اور اُن میں موجود ''آمرس'' خوب یخ ہو چکے تھے تو پھنسائی ہوئی لکڑی نکالنے کی کوشش میں وہ ڈنڈا اور اندر دھنس گیا۔

نسیم چودھری فوراً چلائی

''یہ جگہ چھوڑ دو۔ یہ جگہ فوراً چھوڑ دو۔ جلدی کرو''۔

''کک ......کیوں؟'' کئی سوالیہ فقرے ابھرے۔

''یہ خوبصورت کنارا کون چھوڑے گا؟'' یہ کوئی مناظر اور پانی پہ دلفگار لہجہ تھا۔

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش
شرعی احکام
شائع ہو گیا ہے
قیمت 175 روپے
عبادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک
تبلیغی نصاب، قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں
★ اسلامی ضابطہ حیات جس کی روشنی میں آپ اپنے شب و روز گزار سکتے ہیں۔
★ آخرت کا توشہ، دِلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء۔
★ نیکیوں کی طرف رہنمائی اور گناہوں سے بچنے کے طریقے۔
★ ایسے سنہری حروف جنہیں پڑھ کر آپ اپنے اخلاق و کردار کی کوتاہیوں کو دُور کر سکتے ہیں۔
سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور فون: 37245412

''پلیز! یہ جگہ چھوڑ دیں'' نسیم چودھری تھی اور جٹ بھی تھیں، سوتھوڑے حاکمانہ انداز پر اُتر آئیں۔
جوابی پارٹی بھی سو فیصدی جٹ تھی۔ سو ''جٹ کنالی چٹ'' جب کنالی چاٹ صورت حال میں تھے تو
ڈھیٹ تھے اور اڑیل ٹٹو ہو رہے تھے۔
''نہیں! نہیں! ہم اس گھاسی قطعے کو نہیں چھوڑیں گے یہاں پاؤں ڈبو کر بیٹھے ہیں۔ اُف پانی کتنا ٹھنڈا ہے؟
اور نسیم یا نیلم چودھری ماضی کی اس Co-oprative پارٹی کی ہٹ دھرمی پر نالاں ہوگئی۔ صورت حال سے
آگاہ کیا اور ساری ذمہ داری لاہوری ٹرپ کی قیادت پر ڈالتے ہوئے کافی سخت تنبیہ بھی کر ڈالی۔
صورت حال واقعی سنگین تھی۔
نگران سارے سیاحین کو بتا کر ہنگامی صورت حال یا نفسا نفسی واضطرار پیدا نہیں کیا جاسکتا تھا بس اک
حکم دیا جاسکتا تھا۔
سو میں اپنی حاکمانہ اصلیت پر اُتر آئی اور جسے اکثر میں برداشت، رواداری اور ادب وآداب میں ملفوف
کر کے رکھ چھوڑتی تھی۔
میں حکم دے چکی تھی کہ میں اپنی پارٹی کی خود ساختہ قائد تھی اور حکم دینا، میرا استحقاق تھا...... اور پر
سے، میں بہت ہی دھانسو جٹ بھی تھی یعنی ''جٹ الطرفین'' ...... اور سب سے بڑا کہ LEO یعنی اسد
شیرنی، ان تمام خوبیوں کی ایک خوبی...... سنیارٹی ...... بزرگ بننے کا ''واحد فائدہ'' یہ ہے کہ آپ کو ڈانٹنے
اور ڈانٹتے رہنے کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔
اس لیے تو میں نے بس انگلی اٹھائی تھی اور بیک جنبش زبان سب کو وہاں سے اٹھا دیا تھا۔ باقی دردِ سری نیلم
چودھری نے انجام دی اور سب جٹوں کا ''تراہ کاڈ'' دیا۔
بقول اُس کے دریا کنارے، ایسے دلکش اور خوش کن قطعے بڑے سانحوں کو جنم دیتے ہیں۔ گھاس کی گرفت کی
وجہ سے یہ قطعے بس سطحی اور اوپری حد تک تو رہ گئے ہوتے ہیں مگر ان کے نیچے دریا کی تیز دھار موجیں گزرتی اور
مچلتی ہیں۔ پھر یہ تہہ اور پتلی ہو جاتی ہے...... اس کے علاوہ تہوں کی بنی بنائی یہ پڑچھتیاں مچھلیوں اور دیگر آبی
کیڑے مکوڑوں کے لیے بہترین ''رہائش گاہ'' ہوتی ہیں۔ جسے حوضانے کے طور پر طوطا چشم آبی مخلوق کھوکھلا
کرنے کا ''مقصد جلیل'' اپنائے رکھتی ہے۔
آپ خود ہی سوچ لیں کہ یہ شاندار گھاسی قطعہ آپ کے ساتھ کیا کرسکتا ہے؟ ابھی ابھی میں نے لکڑی کو
خود بخود اس میں دھنستے دیکھا ہے۔ آپ خود سوچیں کوئی بھی تیز دھارا......!
''اُف گارڈ'' کئی زنانہ چیخیں اُبھریں تو نیلم مزید ہراساں کرنے پر اُتر آئیں۔
''اب اس تختے...... یعنی ''تخت طاؤس'' پر کوئی بیٹھنا چاہتا تو اس کا شوق اُس کی مرضی''۔
اور خود مرنے کی مرضی، کسی کی نہیں ہوتی سوائے شہید کے اور شہید کب مرتا ہے وہ تو زندہ و جاوید ہو جاتا ہے۔

(جاری ہے)